

تنقید نمبر

تاریکیوں میں ایک چراغ

ایک روپیہ
پچاس پیسے

ایڈیٹر :- عامر عثمانی (فاضل دیوبند)

سالانہ :- سا… روپے

مولانا مودودی کی کتابیں

کتاب		پیسہ	روپیہ
تفہیم القرآن جلد اوّل	مجلّد	-	۱۲
〃 جلد دوم	〃	-	۱۵
〃 جلد سوم	〃	-	۱۷
تفسیر سورۂ احزاب (عکسی تفہیم کی جلد چہارم کا حصّہ)	مجلّد	۵۰	۴
تفسیر سورۂ نور	مجلد	-	۴
سنت کی آئینی حیثیت	〃	۵۰	۸
تحریک آزادئ ہند اور مسلمان	〃	-	۱۰
رسائل و مسائل اوّل	〃	-	۵
〃 〃 دوم (رف)	〃	۲۵	۵
حقوق الزوجین (اضافہ شدہ ایڈیشن)	〃	۵۰	۲
مسئلہ جبر و قدر (اضافہ شدہ پاکستانی ایڈیشن)		۸۰	۱
نشری تقریریں (سستا ایڈیشن)	〃	۲۵	۱
قرآن اور حدیث (رف)	〃	۵۰	۱
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	〃	۵۰	۱
تفہیمات مکمل ہر دو حصہ	〃	-	۱۲
حقیقت ایمان	غیر مجلّد	۵۰	-
حقیقت اسلام	〃	۴۰	-
حقیقت صوم و صلوٰۃ	〃	۶۰	-
حقیقت زکوٰۃ	〃	۴۰	-
حقیقت حج	〃	۴۰	-
جہاد فی سبیل اللہ		۳۷	-
مسئلہ قربانی شرعی اور عقلی نقطۂ نظر سے		۵۰	-
توحید رسالت کا عقلی ثبوت	غیر مجلّد	۶۲	-
اسلام کا نظام تعلیم	〃	۶۲	-
ایمان اور آزمائش	〃	۳۰	-
بناؤ اور بگاڑ	〃	۵۰	-
تعلیمات	〃	۱۲	۱
اسلام اور ضبط ولادت	〃	۷۵	-
نشانِ راہ	〃	۴۰	-
شہادت حسینؓ	غیر مجلّد	۳۰	-
شہادت حق	〃	۳۱	-
مسئلہ تعداد ازدواج	〃	۲۰	-
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر		۳۱	-
لباس کا مسئلہ		۱۹	-
دعوت اسلام میں خواتین کا حصّہ		۲۵	-
جماعت اسلامی کی دعوت		۲۵	-
زندگی بعد موت		۱۲	-
میلاد النبیؐ		۱۵	-
ایک اہم استفتاء		۱۰	-

مولانا محمد طیب مہتمم دار العلوم کی کتابیں

کتاب		پیسہ	روپیہ
التشبہ فی الاسلام مکمل ہر دو حصّہ	مجلّد	۷۵	۴
فطری حکومت	〃 〃	۵۰	۴
فلسفۂ نعمت و مصیبت	〃 〃	۵۰	۴
علم غیب	〃 〃	۵۰	۴
اسلام اور مغربی تہذیب	〃 〃	۵۰	۴
الکلمۃ الطیب	〃 〃	۵۰	[illegible]
اصولِ دعوتِ اسلام	غیر مجلّد	[illegible]	[illegible]
سائنس اور اسلام	〃	[illegible]	[illegible]
اسلام اور فرقہ واریت	〃	[illegible]	[illegible]
مشاہیر امت	〃	[illegible]	[illegible]
معجزہ کیا ہے؟		[illegible]	[illegible]
حدیث رسولؐ کا قرآنی معیار		[illegible]	[illegible]
اسلام کا اخلاقی نظام		[illegible]	[illegible]
اجتہاد اور تقلید		[illegible]	[illegible]

ہندوستان میں [illegible]

مکتبہ تجلّی - دیوبند

تجلّی کا تنقید نمبر





ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے

سالانہ قیمت سات روپے۔ فی پرچہ ۶۲ پیسے غیر ممالک سے سالانہ قیمت ایک پاؤنڈ بشکل پوسٹل آرڈر

پوسٹل آرڈر پر کچھ نہ لکھیے سادہ رکھیے

اس پرچے کی قیمت ڈیڑھ روپیہ

اشد ضروری

اگر اس دائرے میں سُرخ نشان ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس پرچہ پر آپکی خریداری ختم ہے یا تو منی آرڈر سے سالانہ قیمت بھیجیں یا وی پی کی اجازت دیں آئندہ خریداری جاری نہ رکھنی ہو تب بھی اطلاع دیں خاموشی کی صورت میں اگلا پرچہ وی پی سے بھیجا جائیگا جسے وصول کرنا آپکا اخلاقی فرض ہوگا وی پی سات روپے ستر پیسے کا ہوگا، منی آرڈر بھیجکر آپ وی پی خرچ سے بچ جائیں گے۔

پاکستانی حضرات:۔ ہمارے پاکستانی پتہ پر چندہ بھیجکر رسید منی آرڈر اور اپنا نام اور مکمل پتہ ہمیں بھیجدیں رسالہ جاری ہو جائے گا۔

تحت رجسٹریشن ایکٹ

نام .... تجلّی (ماہنامہ)
مقام اشاعت .... اسلامیہ بازار دیوبند
پرنٹر پبلشر ایڈیٹر .... عامر عثمانی محلہ ابوالمعالی دیوبند
وطنیت .... ہندوستان
ملکیت .... عامر عثمانی
تصدیق کنندہ .... عامر عثمانی



ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ
دفتر تجلی۔ دیوبند۔ ضلع سہارنپور (یو۔پی)

پاکستان کا پتہ:۔ مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ بینا بازار پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی۔ (پاکستان)

مندرجہ بالا پتہ پر منی آرڈر بھیجکر وہ رسید ہمیں بھیجدیں جو منی آرڈر کرتے وقت ڈاکخانہ سے ملتی ہے۔ منیجر

آغازِ سخن

الحمدللہ۔ خاصے جانگسل انتظار کے بعد "تنقید نمبر" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ جو کچھ جس انداز میں ہم پیش کرنا چاہتے تھے وہ اس میں منشا کے مطابق پیش ہو گیا ہے۔ ماہِ رمضان اور ہر لحاظ سے خیر و برکت اور شگفت و انشراح کی بہاریں ساتھ لاتا ہے لیکن لکھنے کا جہاں تک تعلق ہے ہمارے تعطل اور بے توفیقی کی اس مہینے میں انتہا نہیں رہتی۔ کیا مجال ہے جو پورے مہینے ایک صفحہ بھی لکھا جا سکا ہو۔

مگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے شوال کے پہلے ہی عشرے میں جتنا کچھ ہو سکا ہے وہ اتنا گیا گذرا نہیں کہ "تلافیِ مافات" کا عنوان نہ پا سکے۔ آپ ورق الٹ کر اول سے آخر تک پڑھ ڈالیں یہ شکوہ نہ کر سکیں گے کہ آپ کو مایوس کیا گیا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ "عورت کی سربراہی" کا عنوان امتدادِ زمانہ نے فرسودہ بنا دیا ہو مگر یہ فرسودگی بس "واقعات" کی حد تک ہے۔ اصولی و نظری حیثیت سے یہ موضوع آج بھی اتنا ہی تر و تازہ ہے جتنا کل تھا۔ خیر سے بعض رسائل تو اس بحث کو ابھی نہ جانے کہاں تک لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہمیں ان کی پیروی سے سروکار نہیں لیکن یہ فرض ہمارا ہر حال میں ہے کہ اقامتِ دین کی تحریک پر براہ راست یا بالواسطہ جو دھول اُڑائی جائے اسے اپنے امکان بھر صاف کرنے کی کوشش کریں اور ظالموں کے چہروں سے نقاب سرکائیں۔ اس کام کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ اگلے صفحات میں جب آپ مولانا عبدالماجد دریابادی کا "المیۂ پاکستان" پڑھیں گے تو مجموعی تاثر آپ کا یہ ہوگا کہ مولانا موصوف نے بال بال موتی پرو دئے ہیں اور ان کا حرف حرف حق و صداقت میں ڈوبا ہوا ہے۔ اسی طرح جب مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا اداریہ ملاحظہ فرمائیں گے تو سطر سطر پر یہ خیال پختہ ہوتا جائے گا کہ باتیں بڑی جاندار اور صائب کہی جا رہی ہیں۔

مگر جب ان میں سے جب ایک کا تجزیہ آپ کی نظروں سے گذرے گا تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے کسی نے آنکھوں کے سامنے سے پردے سرکا دیئے ہوں۔ زیادہ کچھ کہنا خودستائی سمجھا جائے گا جس سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ پڑھ کر خود فیصلہ کیجئے کہ ہم نے دیانتدارانہ نقد و نظر کا حق ادا کیا ہے یا نہیں اور اس شمارے کے دوسرے مندرجات علم و خبر کے سرمایہ دار ہیں یا نہیں۔

ارادہ تو یہ بھی تھا کہ دوسرے کرمفرماؤں کے ساتھ مولانا اصلاحی سے بھی بحث و نظر کا سلسلہ جاری رہیگا لیکن اپنے تازہ اداریئے میں وہ جس سطح پر آگئے ہیں اسکے بعد کسی بحث کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ آخر فاترالعقل لوگوں سے کون بحث مول لے گا۔ خدا ان پر رحم کرے۔

(ایک مہدوی شیخ سے ملاقات کا حال اگلے پرچے میں ملاحظہ فرمایئے)

مستقل عنوانٌ

شمس نوید عثمانی

کیا ہم مسلمان ہیں؟

خلافتِ رسولؐ جو یقیناً ایک بہت بڑی تاج پوشی اور ایک زبردست اعزاز تھی اُن لوگوں کے لئے کیا چیز تھی جو اس بات پر ایمان لے آئے تھے کہ ہمارا ایک ہی خدا ہے اور ــــ ہمیں ہر اعزاز کا استحقاق ثابت کرنے کے لئے اسی زبردست خدا کے آگے پیش ہونا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اس تاریخی تقریر سے ہوتا ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد ایک خاص کرب و درد کے عالم میں امتِ اسلامیہ کے روبرو کی تھی۔ جب لوگ ان کے سر پر خلافت کا تاج رکھ رہے تھے تو انھوں نے ان کا شکریہ ادا نہیں کیا، بلکہ کیسی پُرسوز پکار ان کے مُنھ سے نکلی تھی!

"اے لوگو! میری خواہش تو یہ تھی کہ کوئی اور شخص اس بوجھ کو اٹھاتا! بات یہ ہے کہ اگر تم مجھ سے اپنے پیغمبرؐ کی سنت کا اتباع چاہو گے تو یہ ایک اتنا بھاری مطالبہ ہے کہ جس کی برداشت کی سکت مجھ میں نہیں ــــ کیونکہ تم لوگ جانتے ہو کہ مجھ میں اور ان میں کیا فرق ہے۔ وہ شیطان سے محفوظ تھے اور ان پر آسمان سے وحی اُترا کرتی تھی۔۔۔۔"

اور ــــ یہ خلافت سے بچنے کی خواہش انھیں کس قدر سنجیدگی کے ساتھ تھی اس کا عملی ثبوت بھی انھوں نے پیش کر دیا۔ اسلامی قلمرو کی باگ ڈور ــــ سلطنت کے سیاہ و سفید کی طاقت اور عظیم خزانوں کی کنجیاں جن ہاتھوں میں آپہنچی تھیں وہی ہاتھ محلّے کی غریب چھوکریوں کے کہنے پر ان کی بکریوں کے تھن نچوڑتے ہوئے دیکھے گئے ــــ خلافت کا اعزاز ملے ہوئے کچھ دیر نہ ہوئی تھی کہ مفلوک الحال بچیوں نے ان کا دامن پکڑ کر بڑے ناز نخرے کے ساتھ احتجاج کیا۔

"اب آپ ہماری بکریاں نہیں دوہتے!۔ بتائیے "باپ!" اب کون انھیں دوہا کرے گا؟"

خلافت کی معرکہ خیز ذمہ داریوں میں سر سے پاؤں تک لدے پھندے ہوتے ابوبکرؓ صدیق نے سادہ لوح بچیوں کی یہ شکایت سُنی اور شفقت بھری نظروں اور محبت بھرے ہاتھوں سے ان بچیوں کو چمکارتے اور تھپکی دیتے ہوئے فرمایا

"میں دوہا کروں گا تمھاری بکریاں ــــ میں!۔ اسی طرح جس طرح اب تک دوہتا آیا ہوں"

اپنی خلافت کے عہد زرّیں میں ــــ

دوسرے خلیفۂ رسول حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ "خدا کے گھر" کا طواف کرکے سوئے مدینہ تشریف لے جا رہے تھے تو انھیں ان کا بے حد اچھا خدا بہت زیادہ یاد آ رہا تھا۔ خانۂ کعبہ کے گرد پروانہ وار چکر کاٹتے ہوئے جب وہ یہ کہہ رہے تھے کہ "میں حاضر ہوں اے میرے اللہ! میں حاضر ہوں" تو یہ پُرسوز پکار ان کی روح کو خدا کے حضور پہنچنے کی ایک زبردست تڑپ بخش رہی تھی مگر ساتھ ہی ساتھ آخرت میں اس دنیا کی تمام ذمہ داریوں کا محاسبہ بھی پوری شدّت کے ساتھ دیدۂ دل کے سامنے آ گیا تھا۔ اس کیفیت میں وہ چلتے چلتے رُکے ــــ دھول سے اٹے ہوئے

سنگریزے اکٹھے کئے اور اس بستر خاک پر چادر بچھا کر وہ سیدھے لیٹ گئے جن کے پیروں میں قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت لوٹ رہے تھے۔ یوں فرش خاک پر عاجزانہ لیٹ کر انھوں نے آسمان کی طرف نمناک آنکھوں سے دیکھا تو بے ساختہ لیٹے لیٹے دعا کیلئے ایک بھکاری کی طرح ہاتھ پھیلاتے ہوئے پکار اٹھے:۔

"خداوندا! دیکھ تو میں اب کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میرے
قویٰ ضعیف ہو گئے مولا — اور میری رعایا ہر جگہ پھیل گئی۔
بس — اے مالک! مجھے اس حالت میں اُٹھالے کہ میرے
اعمال اکارت نہ جائیں اور حدِ اعتدال سے آگے نہ بڑھوں۔"

اور سچ یہ ہے کہ وہ بہت ہی بڑا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ نالۂ نیم شبی سے ہوش آتا تو فوراً یہ فکر ستاتی کہ کہیں تہجد گزار تھک ہار کر سوتے نہ رہ جائیں۔ وہ اُٹھتے اور غازیوں کو نماز فجر کے لئے جگاتے پھرتے تھے۔ وہ کھانا کھانے کیلئے بیٹھتے تو یہ اندیشہ ہاتھ کا نوالہ ہاتھ میں اور منھ کا نوالہ منھ ہی میں روک دیتا کہ کوئی اللہ کا بندہ اس وقت بھوکا نہ پڑا رہ گیا ہو!۔ اسی لئے نمازِ عشاء کے بعد یہ بھی ان کا معمول تھا کہ مسجد میں پھر پھر کر نمازیوں کے چہرے دیکھتے اور پھر ذرا سا شبہ ہوتا تو گھبرا کر پوچھتے "تم نے روٹی کھائی کہ نہیں؟" — سونے کے لئے بستر ان کی طرف بازو پھیلاتا تو پاؤں رکھتے ہی یہ فکر تڑپا کر اُٹھا دیتی کہ لوگوں کی جان و مال پر کوئی آنچ نہ آجائے!۔ بس پھر نیند کہاں! وہ اُٹھتے اور سونے والوں کے گھروں کا پہرہ دیتے — فوجیں جنگ پر جاتیں تو دل ہر وقت ان میں ہی اٹکا رہتا۔ نہاوند کا واقعہ پیش آیا تو راتیں کی راتیں کروٹیں بدل بدل کر کاٹیں۔ قادسیہ کی جنگ چھڑی تو وہ رہ کر گھر سے نکلتے — شہر سے باہر پہنچ جاتے — صبح سے دوپہر تک وہیں چکّر کاٹتے اور جو کوئی شتر سوار اُدھر سے آرہا ہوتا دوڑ دوڑ کر اس کے پاس جاتے اور جنگ کا حال معلوم کرنا چاہتے۔ ایسے ہی موقعہ پر ایک بار محاذِ جنگ کی خبریں لئے ہوئے ایک سوار خلیفۂ رسول کی خدمت میں جلد پہنچنے کے لئے سواری کو تیز دوڑا تا جا رہا تھا اور خلیفۂ رسول بہ نفس نفیس خاک اور دھول میں لت پت اس سوار کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا اور جلدی جلدی جنگ کی خبریں معلوم کر رہا تھا۔ اس عالم میں اُسے اتنی بھی فرصت نہ ملی کہ پیٹھ پیچھے ہوئے دوڑتے ہوئے سوار کو یہ بتانے کی ضرورت سمجھتا کہ جس شخص کی طرف تو دوڑا جارہا ہے وہی اس وقت تیرے پیچھے دوڑا آرہا ہے!

اس کے باوجود وہ مطمئن نہ تھے کہ خدا کو اپنی ذمہ داریوں کا حساب آسانی سے دے سکیں گے۔ کبھی کبھی یہ تشویش اتنی بڑھتی کہ دل کی تڑپ زبان پر آجاتی۔ ایک بار رنجانے کس کیفیت میں تھے کہ بے اختیار منھ سے نکلا:۔

"اگر کوئی دوسرا شخص اس بار کو اُٹھانے کی سکت رکھتا تو
میرے لئے یہ کہیں زیادہ آسان ہوتا کہ آگے بڑھ جاؤں
اور میری گردن اُڑادی جائے —"

قاتلانہ گھاؤ لگ چکا ہے — شمع زندگی کی لو تھرتھرا رہی ہے — سانس، آخری سانس گنے جارہے ہیں۔ مگر حضرت عمرؓ ہیں کہ اس وقت اپنی زندگی کے خون کے آخری قطروں سے لوگوں کی غمناک ساعت پر ٹھیک ان ہی دو باتوں کی درد بھری وصیت لکھے دے رہے ہیں جن کا ذکر و فکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک جان کو دم واپسیں لاحق تھا۔ وہی نماز اور خدا کے کمزور بندوں کے حقوق کی فکر — خون بہتے بہتے نبضیں چھوٹی جارہی ہیں اور ہوش و حواس رہ رہ کر غشی میں ڈوب جانا چاہتے ہیں مگر نماز کا فکر ان کو مرتے مرتے چونکا دیتا ہے اور خلافت کے زیر سایہ بندوں — مسلمانوں اور غیر مسلموں کے حقوق کی یاد آتی ہے تو اس وقت بھی جھنجوڑ ڈالتی ہے — اور وہ اپنی زندگی کی آخری قوت سمیٹ کر حق اور انسانیت کی حفاظت کا حق ادا کر رہے ہیں۔ موت کے خطرے کو ان کی طرف تیزی سے بڑھتا ہوا پاکر جب کسی نے ان سے یہ درخواست کی کہ "حضرت! اپنے بعد کسی شخص کا انتخاب کرتے جائیے۔" تو یہ سنکر ان کو جیسے خوف کے مارے پسینہ آگیا اور بڑی ہی درد بھری قابلِ ترحم کیفیت سے لوگوں کو تکتے ہوئے انھوں نے ٹوٹے پھوٹے مضمحل الفاظ میں کہا "تو۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔ یہ بوجھ ۔۔۔۔ میں موت اور۔۔۔ زندگی دونوں ۔۔۔ حالتوں میں اٹھاؤں ۔۔۔ اے میری ۔۔۔ تو ۔۔۔ صرف یہ آرزو ہے کہ عذاب و

ثواب برابر سرابر۔۔۔ ہو جائے۔۔۔ اے۔۔۔ کاش!۔۔"
خدا کا ڈر ان لوگوں کو اس طرح گھیرے ہوئے تھا کہ حکمراں کی زبردست طاقت کا ایک ذرّہ بھی نفس کی لذّت کے حصے میں آنا محال ہو چکا تھا۔ کسی دن کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ خلافت کے نازک ترین امور کی گتھیاں سلجھانے میں ہمہ تن منہمک تھے کہ اچانک ایک شخص اندر گھس آیا اور آتے ہی حضرت عمرؓ کی عظیم محویت کو درہم برہم کرتے ہوئے پکار اٹھا:۔
"اے امیر المومنین!۔۔۔ اے امیر المومنین!!۔۔۔ مجھ پر فلاں شخص نے ستم ڈھا دیا۔۔۔"
دین و ملت کے بڑے اہم معاملوں میں حضرت عمرؓ اس وقت جس طرح مصروف تھے اس میں انھیں یہ ناوقت کی دہائی مداخلت فی الدین سے کم محسوس نہ ہوئی۔ سخت غصہ آیا اور آنے والے کے سر پر ایک کوڑا جما دیا۔
"جب میں مقدمات ہی فیصل کرنے کے لئے خاص طور سے بیٹھتا ہوں تو تم لوگ آتے نہیں ہو!" انھوں نے بگڑ کر کہا۔۔۔ "اور جب مسلمانوں کے دوسرے کاموں میں مصروف ہوتا ہوں تو دادرسی کے لئے آموجود ہوتے ہو!"
آنے والے کی سٹّی گم ہو گئی مگر اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بڑی دلشکستگی اور خفگی کے ساتھ واپس مڑ رہا ہے۔ یہ منظر دیکھتے ہی حضرت عمرؓ کا چہرہ خوفِ خدا سے فق ہو گیا۔۔۔ اس روحانی کرب کے دفعیہ کی اب محض ایک شکل باقی تھی کہ مسلمانوں کے امیر کے سر پر یہ عامی مسلمان کوڑے کے جواب میں کوڑا مارے۔۔۔ اور یہی شکل حضرت عمرؓ کے لئے کس قدر آسان اور جاں نواز تھی۔ سہمی ہوئی آواز میں انھوں نے جانے والے کو پکارا اور اس کے سامنے وہی کوڑا بے تکلف ڈالتے ہوئے اپنے جسم کو اس سخت سزا کے لئے پیش کر دیا۔۔۔ اس وقت لفظی معافی بھی ان کے دل کا بوجھ ہلکا نہ کر سکتی تھی۔۔۔ "تم مجھ سے قصاص لو" انھوں نے اپنے اس فیصلے پر ایک خاص انداز سے پورا زور ڈالتے ہوئے اس شخص کی ہمت بندھائی۔
"جی!؟" وہ شخص حیرت کی شدّت سے ہکلانے لگا۔۔۔ "یہ۔۔۔ آپ۔۔۔ کیا فرما رہے ہیں!۔۔۔ اچھا۔۔ اچھا۔۔ میں نے آپ کو خدا کے لئے اور آپ کے لئے معاف کر دیا۔۔۔"
"جی نہیں!" حضرت عمرؓ نے ایسی معافی قبول کرنے سے انکار کر دیا جس کے کچھ الفاظ سے یہ بو آ رہی تھی کہ وہ ان کے عہدے کا لحاظ کر رہا ہے۔ "صاف کہو کیا کہتے ہو؟۔۔۔ تم نے مجھے خدا کے لئے معاف کیا یا میرے لئے؟"
مخاطب بات کی تہہ تک پہنچ گیا اور خلیفۂ رسول کو مطمئن کر دیا کہ میں نے خاص خدا کے لئے آپ کو دل سے معاف کر دیا ہے۔
ایک بار مسجد سے گھر آ رہے تھے کہ ایک صحابیہؓ نے ان کو سلام کے فوراً ہی بعد اس طرح آڑے ہاتھوں لیا "اے عمرؓ! میں نے تمہارا وہ زمانہ دیکھا ہے جب عکاظ کے بازار میں لوگ تمہیں "عمیر، عمیر" کہا کرتے تھے۔ پھر کچھ دنوں کے بعد تم "عمر" ہو گئے اور اب۔۔۔ تمہارا لقب امیر المومنین ہے۔۔۔ پس محکوموں کے معاملے میں خدا سے ڈرو!"
بوڑھی صحابیہؓ کی شفقت و نصیحت کا یہ انداز اس قدر تیز و تند تھا کہ حضرت عمر کے ساتھ چلنے والوں کو کھل گیا مگر خود حضرت عمرؓ کچھ نہ بولے۔
"بی بی!" ایک شخص سے رہا نہ گیا اور کہہ اٹھا "تم نے تو امیر المومنین کو بہت کچھ ڈالا۔۔۔"
"اس بات کو جانے دو!" حضرت عمرؓ نے اپنے حمایتی کو فوراً روک دیا اور آہ سرد بھرتے ہوئے بولے "کیا تم نہیں جانتے کہ یہ خولہ بنت حکیم ہیں اور عبادہؓ بن صامت کی اہلیہ ہیں۔۔۔ خدا نے تو سات آسمان کے اوپر سے ان کی بات سُن لی تھی (اور ان کے ہی مسئلے میں سورۂ مجادلہ اُتری تھی) تو پھر عمر کو تو اور بھی زیادہ سننا چاہئے۔"

حضرت عثمانؓ غنی نے تو خلافت کی فوجی طاقت کو اپنے لئے اس وقت بھی استعمال نہیں کیا جب فسادیوں کی

گستاخ ٹولی ان کے جسمِ اطہر پر خنجر آزمائی کے لئے ان کے مکان پر چڑھی آرہی تھی۔

"فسادیوں کی سرکوبی کے لئے آپ فوجوں کو حکم دیجئے نا۔" زبردست خطرے کے وقت دردمند دل پکار اٹھے۔

"نہیں" حضرت عثمانؓ نے خدا کے خوف سے لرزتے ہوئے کہا" اس طرح تو امت کا خون ہو جائے گا۔۔۔۔ یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو گا۔"

اور آخر خلافت کی طاقت و شکوہ کا تاج پہنے ہوئے انھوں نے خونِ شہادت سے خود کو تر کر لیا۔ خلافت ملنے سے پہلے ان کی زندگی سے ان کی زبردست دولت و ثروت لاکھ جھلکتی رہی ہو مگر تختِ خلافت کو چھوتے ہی وہ محض مشتِ خاک ہو کر رہ گئے تھے ـــــ اور ان کے اندر کا فقر باہر کی طرف اُبل پڑا تھا۔ اب وہ صحنِ مسجد میں اس طرح زمین پر کروٹیں لیتے ہوئے دیکھے جاتے تھے کہ سر کے نیچے چادر تہہ کی ہوئی رکھی ہے اور ناز و نعم میں پلے ہوئے نازک جسم کی کھال پر سنگریزوں اور کنکروں نے جی بھر کے نقش و نگار بنا دیتے ہیں۔ اپنی جان کے لئے جس کی یہ کیفیت تھی وہ دوسروں کے حقوق کی حفاظت میں سراپا تشویش و احتیاط تھا۔ دیکھا گیا کہ مسجد میں نماز کے لئے صفیں درست ہو رہی ہیں مؤذن نے اقامت شروع کر دی ہے مگر حضرت عثمانؓ خدا کے سامنے اس وقت دست بستہ پیش ہونے سے پہلے بیتاب ہیں کہ بازاروں کے صحیح نرخ کے سلسلے میں اپنی بات جلدی جلدی پوری کر لیں۔

اپنے دورِ خلافت میں حضرت علیؓ بازار کی نگرانی اور معائنے پر پھر رہے تھے کہ ایک خرمہ فروش کی دوکان پر ایک لونڈی روتی ہوئی دکھائی دی۔ جلدی سے اس کی طرف دوڑے:-

"کیا بات ہے؟" اس کے پاس جاکر اس کا حال پوچھا۔

"اس دوکاندار نے" کنیز نے انھیں دیکھ کر سسکتے ہوئے کہا" ایک درہم میں میرے ہاتھ کھجور فروخت کی۔ لیکن میرے آقا نے اس کو واپس کر دیا تو یہ واپس لینے کیلئے تیار نہیں۔۔۔"

"کیوں بھئی؟" نرم خفگی کے ساتھ دوکاندار کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے حضرت علیؓ نے کہا۔" واپس لے لونا۔ اور اس کے دام لوٹا دو۔"

"کیسی واپسی!!" دوکاندار اس سفارش پر بھڑ گیا اور تاؤ میں آکر حضرت علیؓ کو دھکا دے دیا۔

"ہائیں! ہائیں!!" دیکھنے والے چلّائے "پہچانتے نہیں ہو یہ امیر المومنین ہیں!۔۔۔"

یہ سننا تھا کہ دوکاندار کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ہڑبڑا کر دام لوٹائے اور اس گستاخی پر خوفِ سزا سے لرز اٹھا۔

"مجھے معاف کر دیجئے۔ اور۔ مجھ سے راضی ہو جائیے" بہت ڈرتے ڈرتے اس نے عرض کیا۔

"اگر تم لوگوں کا حق پورا پورا دو گے" حضرت علیؓ نے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ فرمایا" تو پھر مجھ سے زیادہ اور کون تم سے راضی ہو گا؟" یہ فرمایا اور پھر چپکے سے آگے بڑھ گئے۔

خدا کی بندگی پر کجکلاہی کی مغرور روایتوں کو بھینٹ چڑھانے کا یہ رقت انگیز اُسوہ ان چاروں خلفائے راشدین ہی پر ختم نہیں ہوا بلکہ اس کی ایمان افروز جھلکیاں رہ رہ کر انسانی تاریخ کی آنکھ کو خیرہ کرتی رہی ہیں۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو ظاہری شان و شوکت اور ایک خاص سیاسی عظمت کی بناء پر دربارِ فاروقی سے کسرائے عرب کا عظیم خطاب پا چکے تھے ان کی خلعتِ فاخرہ کے اندر بھی کیسا قلب سادہ دھڑک رہا تھا! ـــ ایک بار انھوں نے چند سو درہم کسی النصاری کو بھجوائے۔ ان کو یہ رقم اس خاص موقعہ کے لحاظ سے بہت حقیر محسوس ہوئی۔ خفا ہو گئے اور اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ "جاؤ اور یہ ان کا تحفہ ان کے ہی منہ پر مار آؤ!"

اطاعت شعار بیٹا روانہ ہونے لگا تو غیظ آلود کیفیت میں باپ نے پھر بیٹے کو پکارا:-

"قسم کھاؤ کہ یہ رقم تم سچ مچ ان کے منھ پر مار کر بھاگ آؤ گے"

بیٹا قسم کھانے پر مجبور ہوگیا اور ایک سخت ذہنی کشمکش کے عالم میں دربارِ معاویہؓ میں کشاں کشاں حاضر ہوا۔ اس کی عقل حیران و سرگرداں تھی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے!۔ آخر یہی شکل ممکن نظر آئی کہ یہ سارا ماجرا صاف صاف حضرت معاویہؓ کے آگے بیان کر ڈالے ـــ

"میرے باپ سخت بدمزاج ہیں" لڑکے نے جاکر کسرائے عربؓ سے ڈرتے ڈرتے کہا "اور انھوں نے مجھے قسم دے کر اور قسم لے کر بھیجا ہے کہ آنجناب کا یہ تحفہ منھ پر مار کر آؤں ـــ خدا کے لئے بتائیے میں باپ کے حکم اور آپ کے احترام کے تقاضے کو کس طرح پورا کروں..."

یہ باتیں سننے کے بعد حضرت معاویہؓ بگڑنے کے بجائے زیرِ لب مسکرائے۔

"اس میں پریشانی کی تو کوئی خاص بات نظر نہیں آتی!" انھوں نے سر جھکائے ہوئے کہنا شروع کیا "ایسا کیا جائے کہ میں اپنے منھ پر ہاتھ رکھے لیتا ہوں اور تم اطمینان سے اپنی قسم پوری کر ڈالو! ـــ مگر دیکھنا بہت زور سے نہ مار بیٹھنا! تم دیکھ رہے ہو کہ میں کافی بوڑھا آدمی ہوں۔"

پھر اس کے بعد ـــ اس واقعہ کے بعد جب وہ لڑکا واپس جانے لگا تو حضرت معاویہؓ نے دوگنی رقم بھی ان انصاری کی خدمت میں روانہ کر دی۔

خدا ہی جانے یہ لوگ ـــ یہ کشتگانِ بندگی کونسی مٹی کے بنے ہوئے تھے کہ جو سونے چاندی کے جگمگاتے ہوئے خزانوں میں بیٹھ کر دنیائے دنی کو اس حقیقت کا درد بھرا سبق دے سکتے تھے کہ آدمی سچ مچ مٹی سے بنا ہے اور جلد یا بدیر مٹی ہی میں رل مل جانے والا ہے۔ کتنی بڑی چیز تھا وہ عجز جو نخوت و تکبر کی مخصوص مسندوں پر جلوہ افروز ہوکر یہ حسین راز سمجھا رہا تھا کہ خدائے ذوالجلال کے قدموں میں جس آدمی کی روح کو جگہ مل گئی ہوا ہے تختِ شاہی پر بھی پھر قرار نہیں آتا!۔ یہ تھی وہ مخلوق جو ایمان و یقین کی سب سے بڑی وجد انگیز کیفیت میں جب باقی کو فانی پر ترجیح دیتی تھی تو اس کے دل کو حقیقی قرار آتا تھا ـــ یہ تھے وہ لوگ جن کا عظیم نام "مسلمان" تھا۔ لیکن آج "مسلمان" کہتے کسے ہیں؟ ـــ آہ! میرے مولا! یہ ایک سوال نہیں روح کا ناسور ہے۔ جو ذرا سی چھیڑ سے رِسنے لگتا ہے ـــ ہائے ہم! ـــ ہم آج مسلمان کہلاتے ہیں اور موت سے صرف اس لئے ڈرتے ہیں کہ ہم نے اب تک دنیا کو آباد اور آخرت کو برباد کیا ہے اسی لئے آخرت کی طرف بڑھنے کا تصور ہمیں ہستی سے ویرانے کی طرف بڑھتا محسوس ہوتا ہے۔ اے کاش! یہ سوال ہمیں جاں کنی سے بھی بڑی بے چینی عطا کرے کہ "کیا ہم مسلمان ہیں؟" اور پھر یہی بے چینی ہمیں وہاں تک پہنچا دے جہاں میرے خدا کا کہنا ہے کہ نہ کوئی غم ہے اور نہ کوئی خوف۔

مولانا دریابادی کیا فرماتے ہیں؟

المیۂ پاکستان

(از مولانا عبد الماجد دریابادی)

"مولانا مودودی مرحوم ہوگئے"۔ "مولانا مودودی ماشاءاللہ زندہ و سلامت ہیں"۔ دونوں باتیں ایک ہی وقت میں کیسے صحیح ہوسکتی ہیں؟ اور ان میں سے پہلا دعویٰ تو صریحاً صحیح ہے —— جی نہیں۔ دونوں باتیں ایک ہی وقت میں صحیح ہیں۔ جو مولانا مودودی رحلت فرما گئے اور یہ واقعہ معمولی درجہ کا نہیں۔ بڑے ہی دکھ اور رنج کا ہے۔ وہ دین کے ممتاز عالم تھے۔ مفسر قرآن تھے متکلم تھے۔ متکلم تھے۔ اقامت دین و حکومتِ الٰہیہ کے علمبردار تھے۔ ایک مستقل و سراپا دینی شخصیت رکھتے تھے۔ ایک ایسی ہستی کا اُٹھ جانا ساری ملتِ اسلامی کے لئے ایک حادثہ کا حکم رکھتا ہے۔ حدود پاکستان کے باہر بھی اسی قدر جس طرح پاکستان کے اندر — اب جو مولانا مودودی ماشاءاللہ موجود و سرگرم عمل ہیں۔ وہ ایک سیاسی لیڈر ہیں۔ جس طرح اور پارٹیوں کے لیڈر موجود ہیں اور ہر ملک میں نرم و گرم، رطب و یابس قسم کے لیڈر ہوا ہی کرتے ہیں۔

کوئی یقین کرے یا نہ کرے، میرے دل میں مولانا کی خصوصی عزت و وقعت تھی، ان کی دینی شخصیت کی بنا پر۔ مسائل میں اختلاف بارہا ان سے ہوا اور کسی نہ کسی مسئلہ میں اپنا اختلاف بزرگانِ دیوبند، اکابر ندوہ میں سے بھی کس سے نہیں ہوا؟ اختلافی مسائل کے باوجود بھی مولانا کا دینی احترام ہمیشہ قائم رہا اور دینیات میں مابہ الاشتراک ہمیشہ مابہ الاختلاف پر غالب ہی رہا۔ متعدد دینی عنوانوں پر ان کی قلمی خدمات کی قدر دل میں محسوس کی اور اُن کے حق میں دعائے خیر بارہا زبان پر آئی جن حضرات نے ان کو دین سے خارج کرنا چاہا۔ ان سے بحثیں کرکے ان کی تردید کی اور مولانا کے وجود کو ملت کے لئے بہ حیثیت مجموعی مایۂ ناز ہی سمجھتا رہا — اسی اعتماد و اعتقاد کی مناسبت سے اس دھکے اور صدمے کا بھی اندازہ کیجئے جو اس یقین کے زائل ہونے سے دل و دماغ دونوں کو پہنچا۔ یہ معلوم ہوا کہ ہاتھ سے کتنی قیمتی نعمت چھن گئی۔ پیروں کے نیچے سے زمین سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ دل شکستگی اور حسرت کی نوعیت کچھ اس قسم کی رہی جیسے اس دن محسوس ہوئی تھی جب ترکی سے خبر آئی تھی کہ اتاترک نے منصب خلافت توڑ دیا۔ یا جس دن اقبال کی وفات یا محمد علی کی رحلت کی خبر آئی تھی!

عورت کی امارت کے مسئلہ تک چنداں مضائقہ نہ تھا۔ اس اجتہادی رائے کو غلط سمجھتا رہا۔ جیسے مولانا کے اور بہت سے اجتہادات کو غلط سمجھتا رہا ہوں۔ اس ضرب سے ان کی دینی شخصیت پر پوری طرح نہیں پڑ رہی تھی لیکن جب ان کے اس قسم کے فقرے متعدد نقل ہونے لگے تو عقل حیران رہ گئی کہ ان کی کیا تاویل کی جائے کہ:-

"اصل مسئلہ اس وقت جمہوریت کی بحالی کا ہے۔"

انا للہ۔ ان کی زبان و قلم سے اس طرح کے غرق سیاست فقروں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا تو قع اس کے بالکل برعکس ان کی طرف سے اس قسم کے بیانات اور زور دار بیانات کی قائم کئے ہوئے تھا کہ:-

"ہم خادمانِ اقامتِ دین کو ان سیاسی قضیوں سے کیا واسطہ۔ ہمارے نزدیک طاغوتی نظامِ جمہوریت اور امریکی نظامِ صدارت سب یکساں حکومتِ الٰہیہ کے معیار سے دور اور بے وزن ہیں۔ چاہے ایک بھی ووٹ نہ ملے لیکن بہر حال ہم ان سیاسی نزاعات میں پڑنے اور اُلجھنے کے لئے تو گھر سے ایک قدم باہر رکھنا بھی معصیت سمجھتے ہیں۔ ہم اگر ووٹ دینے جائیں گے بھی تو صرف اسی صورت میں کہ جب مسئلہ اقتدارِ الٰہی بہ مقابلہ اقتدارِ انسانی کا چھڑا ہو"

اور جہاں تک مادرِ ملت کے انتخاب کا تعلق ہے مجھے یقین تھا کہ مولانا کی تحریریں کچھ ان خطوط پر ہوں گی کہ۔

"ہم تو رابعہ بصریہ کی بھی جن کی صالحیت ضرب المثل ہے امارت و صدارت کے بھی روا دار نہ ہوں گے۔ چہ جائیکہ کسی ایسی خاتون کے حق میں جو شریعت کی بالکل کھلی ہوئی دفعات کی بھی پابندی سے علانیہ آزاد ہوں اور جن کی زندگی کا سارا نقشہ ہی اسلام سے کہیں بڑھ کر مغرب کے معیار کا ہو!"

اور صدر ایوب خان اور ان کی حکومت کی زیادتیاں آپ کے معتقدین اگر آپ کو یاد بھی دلاتے اور کہتے کہ یہی موقع ان سے انتقام لینے اور انھیں جواب ترکی بہ ترکی دینے کا ہے تو آپ کی طرف سے جواب کچھ اس انداز کے ملتے کہ:-

"ہمارا ایمان تو لایجرمنکم شنآن قوم[۵۱] کا تعدلوا پر ہے۔ اندھا دھند انتقام لینے کی اجازت تو ہم منکروں اور کافروں کے مقابلے میں بھی نہیں چہ جائیکہ کلمہ گویوں کے مقابلے میں۔ ان لوگوں کے ظلم اور زیادتیاں ہمارے حق میں جو کچھ بھی ہوں۔ ہمیں اشتعال قبول کر کے عدل و اعتدال کی راہ سے کسی حال میں بھی نہیں ہٹنا ہے۔ دنیا میں امتحان کے یہی تو موقعے آتے ہیں اور ایسے صریح مبالغہ آمیز دعووں اور نعروں سے تو ہم خدا کی پناہ طلب کرتے ہیں کہ اس شخص میں کوئی خوبی ہی سرے سے نہیں۔ سوا اس کے کہ یہ عورت ذات نہیں، بلکہ مرد ہے۔ ہم گواہی صرف اس کی دیں گے جو امرِ حق ہے خواہ وہ ہمارے بڑے سے بڑے مخالف ہی کی تائید کر رہی ہو"

شہرت تو اب تک مولانا کے توازن اور احتیاط الفاظ کی تھی اور یہ بات تو گمان میں بھی نہ تھی کہ "بغضِ معاویہ" میں وہ مبالغہ آرائی کے ان حدود تک چلے جائینگے جہاں تک کوئی بد تر سے بد تر سیاسی لیڈر بھی جا سکتا ہے

فتنۂ نسائیت پاکستان کے دینی فتنوں میں اس وقت شاید سب سے زیادہ زبردست و پُر قوت فتنہ ہے اس کا مقابل و مزاحم مولانا سے بڑھ کر اب تک کون تھا ان کو یقیناً اندازہ نہیں کہ ان کی جماعت کی تازہ روش نے اس فتنۂ عظیم کی امداد کس زور و شور سے کر دی اور بند کو کس بے جگری سے توڑ دیا جس کے باندھنے میں اب تک مولانا ہی پیش پیش تھے!

مسئلہ جمہوریت یوں بھی دینی نقطۂ نظر سے بس ایک حقیر سے جزئیہ ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ چہ جائیکہ جب سوال نفسِ جمہوریت کا بھی نہیں بلکہ اس کی دو متبادل شکلوں (برطانوی اور امریکی) کا ہو! حکومتِ الٰہیہ کے علمبردار کے پاس تو صرف ایک ہی جواب ہونا تھا:-

مزہ ہو یا نکہ ہو ہم تو دونوں کو بلا سمجھے
اسے تیر قضا اس کو بر تیر قضا سمجھے

حیف صد ہزار حیف کہ اس کی قیمت آج اتنی اونچی سمجھ لی گئی کہ قبائے امامت کو بے تکلف سیاسی لیڈری

[۵۱] نقل مطابق اصل۔ (تجلّی)

کے گون پر نثار کر دیا گیا۔

شیطان اور اس کے سارے حزب کو اتنی مسرت و شادمانی اپنی کامیابی و فتحمندی پر حال و ماضی قریب میں کیوں نصیب ہوئی گی!

جانتا ہوں کہ اب اس آہ و بکا و نالہ و فریاد سے حاصل کچھ بھی نہیں۔ جو ہونا تھا ہو کر رہا۔ جف القلم بما ھو کائن اور وکان امر اللہ قدراً مقدوراً تقدیرات تکوینی کون آج تک بدل سکا ہے۔ لیکن صدمہ سے تأثر بھی ایک امر طبعی ہے اور پھر جو صدمہ ملّی اس طول و عرض اور اس حجم و ضخامت کا ہو۔ اس پر صبر آجانا تو آسان ہے بھی نہیں۔ اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ صدارت کا فیصلہ جو کچھ بھی ہو، وہ بہرحال ایک سیاسی ہی قضیہ ہوگا۔ دینی صدمہ جو پاکستان و بیرون پاکستان کو پہنچ سکتا تھا۔ وہ پہنچ گیا اور اس کو اگر تعبیر "سانحۂ پاکستان" یا "المیۂ پاکستان" سے نہ کیجئے تو اور کس سے کیجئے!

تجلّی

بناء الفاسد علی الفاسد کی مثالیں دنیا میں عام ہیں لیکن ایسی شاندار مثالیں کم ہی نکلیں گی جیسی مولٰنا دریابادی نے پیش کی ہے۔

آپ اندھیرے میں لٹکے ہوئے تولئے کو چور فرض کر لیں پھر دیکھئے آپ کی قوت واہمہ کتنی تیزی سے اسکے ہاتھ اور پیر سب تخلیق کر دیتی ہے۔

پچھلے شمارے میں آپنے دیکھا۔ ہم ایک دو نہیں دسیوں دلیلوں اور تمثیلوں کے ذریعے واضح کر چکے ہیں کہ جمہوریت یا مس فاطمہ جناح اور ایوب خاں کے بارے میں جو بھی ریمارک مولانا مودودی نے کیا وہ ادنیٰ درجے میں بھی ایسا نہ تھا کہ کوئی عقیل و فہیم انسان اس پر زمین و آسمان ایک کر دے اور اتنے زور شور سے الامان والحذر کے نعرے لگائے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ لیکن آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ مولانا دریابادی کی پیاس فقط ایک ہی بار لکھنے پر نہیں بجھی بلکہ باقاعدہ "المیۂ پاکستان" لکھنے کی نوبت بھی آ ہی گئی۔ انداز جیسا کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔ ہوا میں عمارت بنانے پر ممدوح نے اپنی ساری ادبی صلاحیتیں صرف کر دی ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ جس وقت یہ "المیۂ پاکستان" اشاعت پذیر ہوا اس وقت تک جنوری کا تجلّی منظرِ عام پر نہیں آیا تھا اس لئے ایک فیصدی امکان اس کا بھی پایا جاتا ہے کہ جنوری کا تجلی پڑھ لینے کے بعد ممکن ہے مولانا کی آنکھوں سے فریب خیال کا زرنگار پردہ ہٹ گیا ہو اور انھوں نے محسوس کر لیا ہو کہ میں نے جو مطالب و معانی مولٰنا مودودی کے فرمودات سے اخذ کئے وہ فی الحقیقت ان فرمودات کے مطالب و معانی نہیں تھے، بلکہ میرے ہی فریب خوردہ واہمے کی صنعت کاری تھی۔

لیکن یہ ایک فیصد امکان بس ایسا ہی ہے جیسے ایک فی صدی امکان ہر روز اس بات کا موجود رہتا ہے کہ اگلی صبح سورج نہیں نکلے گا یا اگلے ہفتے زمین و آسمان شق ہو جائیں گے۔ وہ خدا پرست اور حق کے شیدائی بندے تو عرصہ ہوا اپنی قبروں میں جا سوئے جن کا اسوۂ و کردار یہ تھا کہ جب بھی کوئی شخص ان کے کسی قول یا فعل پر انھیں ٹوکے وہ ٹھٹک جائیں۔ پھر نہایت توجہ سے اس کی پوری بات سنیں اور پھر یہ امتیاز کئے بغیر کہ ٹوکنے والا لمبا چوغہ پہنے ہوئے ہے یا سادہ قمیص میں ہے سوچیں کہ ٹوکنے والے کا موقف درست ہے یا غلط۔ اس کے دلائل کمزور ہیں یا جاندار۔ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے حق و صداقت سے قریب تر ہے یا بعید تر۔۔۔ پھر اگر دیانت داری کے ساتھ وہ محسوس کریں کہ قصور حقیقتاً ہمارا ہی ہے تو ذاتی وقار اور احساسِ برتری سے بالاتر ہو کر قصور کا اعتراف بھی کر لیں

آپ کو معلوم ہوگا۔ وہ بوڑھی عورت جس نے امیر المومنین عمر ابن الخطابؓ کو بر سرِ عام ٹوکا تھا۔ ایک حقیر سی عورت تھی۔ ناخواندہ، کم رتبہ اور بے حیثیت۔ اور وہ شخص جس نے بھرے مجمع میں اسی امیر المومنین پر اعتراض کیا تھا کہ تمھارے

پاس یہ دو قمیص کہاں سے آئیں وہ بھی ایک عام ہی آدمی تھا۔
لیکن دونوں مواقع پر عمر ابن الخطابؓ نے نہ تو جھلاہٹ کا مظاہرہ کیا، نہ استکبار سے گردن اکڑائی نہ سنی ان سنی کی، بلکہ ایک حق پرست، خدا ترس اور عدل پسند انسان کی طرح اپنی اور معترض کی عرفی حیثیات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایمان و دیانت کے تقاضے پورے فرما دیتے۔ بڑھیا کا ٹوکنا درست تھا لہٰذا اعلانیہ اپنے فیصلے سے رجوع کرتے ہوئے صاف صاف اعترافِ خطا کیا اور شخص مذکور کا ٹوکنا غلط فہمی پر مبنی تھا۔ لہٰذا خندہ پیشانی اور عجز و فروتنی کے ساتھ اس کی غلط فہمی رفع فرمائی۔

یہ ایک معیاری اسوہ تھا جو عمر فاروقؓ نے اپنے مقتدا صلے اللہ علیہ وسلم سے لیا تھا اور اسی اسوے کو صحابہؓ سے تابعین نے اور تابعین سے تبع تابعین نے لیا —— لیکن آج زمانہ دوسرا ہے۔ آج معیار دوسرے ہیں تقویٰ اور حق پژوہی کے زاویے بھی دوسرے ہیں۔ آج کے اتقیاء، علماء اور اربابِ فضل کا عمومی حال یہ ہے کہ لباس سے، وضع قطع سے گفتگو کے انداز سے وہ دنیا کے سب سے بڑے منکسر المزاج اور بے نفس نظر آئیں گے۔ ان کے ہر خط اور مضمون کے اختتام پر آپ اکثر و بیشتر دیکھیں گے کہ حقیر، احقر، روسیاہ، بندۂ عاجز اور خاطی و عاصی جیسے الفاظ لکھے ہوئے ہوں گے۔ ان کے ہر پیراگراف بلکہ ہر سطر میں آپ کو بے نفسی، تقویٰ، خشیتِ الٰہی، خدا ترسی اور روحانیت کے گلہائے تر کھلے ہوئے محسوس ہوں گے۔ لیکن اِن زرنگار پردوں اور حسین حجابوں کے اندر جھانک کر دیکھئے تو نظر آئے گا کہ خود پسندی، نخوت انانیت اور استکبار کے اتنے بڑے بڑے انبار وہاں جمع ہیں کہ بدنام سے بدنام ائمۂ غرور و نخوت بھی انھیں دیکھ پائیں تو حیرت سے انگلی منھ میں دبا جائیں۔

حد یہ ہے کہ "بڑوں" کے اس نفاقِ غلیظ اور ردہ غلے پن کا پورا پورا اثر اب اطفالِ مکتب میں بھی اس حد تک سمٹا جا رہا ہے کہ آپ انکا اندازِ گفتگو دیکھیں تو محسوس کریں کہ یہ مسخرے کبر و پندار کی اُن بلندیوں سے کلام فرما رہے ہیں جہاں شیطان کے بھی پر جلتے ہیں۔

غرور اور جہل مرکب میں بالشت بھر بھی فاصلہ نہیں۔ جو لوگ چند لگے بندھے اعتراضوں اور الزاموں کی مسلسل جگالی کئے جائیں اور یہ پروا نہ کریں کہ اللہ کے کچھ بندے کتنی مضبوط اور فیصلہ کن دلیلوں کے ساتھ ان کے ہر ہر اعتراض والزام کی غلطی ثابت کر رہے ہیں انھیں غرور اور جہل مرکب کا اسیر نہ سمجھا جائے تو اور کیا سمجھا جائے — ان حضرات نے ٹھیک اس روایتی شتر مرغ کا رویہ اختیار کر رکھا ہے جو ریت میں منھ چھپا کر مطمئن ہو جاتا تھا کہ آندھی کا کوئی وجود نہیں ہے۔

دل خون روتا ہے یہ دیکھ کر کہ ان حضرات نے ایمان و دیانت اور علم و تفقہ کی ساری متاع کو اپنی جاگیر سمجھ رکھا ہے اور یہ جہل و خود فریبی کے اُس تحت الثریٰ میں جا گرے ہیں جہاں تاریکی اور تعفن کے سوا کچھ بھی نہیں۔

خیر بات تو المیۂ پاکستان کی ہو رہی تھی۔ مولانا مودودی کو زندہ دفن کر کے مولانا دریابادی دل ہی دل میں کتنے ہی مسرور اور مگن کیوں نہ ہوں۔ لیکن دیدۂ بینا اور عقل سلیم رکھنے والوں کے لئے ان کی یہ مسرت بچوں جیسی سادہ لوحی سے زیادہ کوئی معنویت نہیں رکھتی۔ یرقان کا مریض اگر ہر شے کو زرد رنگ میں رنگا ہوا دیکھتا ہے تو کیا دوسرے آنکھ والے بھی یہی کہیں گے کہ ہر شے زرد ہو گئی ہے۔ بخار کا مریض اگر ہر کھانے میں کڑواہٹ محسوس کرتا ہے تو کیا صحت مند لوگ بھی یہی تسلیم کر لیں گے کہ کھانے کی ہر چیز کڑوی ہی ہوتی ہے ظاہر ہے کہ کڑواہٹ اور زردی کا ان دونوں صورتوں میں باہر کہیں کوئی وجود نہیں۔

ٹھیک اسی طرح نقص و خلل تو فی الحقیقت مولانا دریابادی کے نظامِ فکر اور دماغی مشینری میں واقع ہوا ہے لیکن وہ تصور یہ کر رہے ہیں کہ حادثہ باہر واقع ہوا۔ جس طرح کثرت سے تاریخی ناول پڑھنے والے سادہ لوح خوابوں میں تلواریں چلاتے ہیں اور کشتوں کے پشتے لگا دیتے ہیں اسی طرح مولانا موصوف

نے بھی اپنی دنیائے خیال میں مولانا مودودی کی قبر کھودی اور انھیں دفن کر دیا۔

سنجیدہ تجزیہ کیجئے تو اسلام کا ایک زبردست المیہ آپ کی چشم بصیرت کے سامنے آئے گا۔ اس المیہ کو محسوس کرنے کے لئے گہرے تدبّر، عمیق فکر اور بلیغ بصیرت کی ضرورت ہے۔ اپنی تاریخ کے ورق اُلٹ کر دیکھئے تو نظر آئے گا کہ اللہ کا رسولؐ ایک ہی وقت میں مفسرِ قرآن بھی تھا، فقیہ و متکلم بھی، سیاستداں بھی، فوجی قائد بھی اور سپاہی بھی۔ دین اور سیاست یک جان و یک قالب تھے۔ دوئی تو کیا ان میں رنگ اور خدوخال کا بھی فرق نہیں تھا۔ پھر دین و سیاست کے اسی کامل ارتباط و اتحاد کا درسِ بلیغ دے کر یہ اللہ کا رسولؐ دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے وفادار شاگردوں اور غلاموں نے بھی انتہائی جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ دین و سیاست کی یک جنسی و ہم رنگی کو برقرار رکھا ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ بیک وقت فقیہ و مفتی بھی رہے، مفسر و محدث بھی رہے۔ سیاسی قائد اور عسکری رہنما بھی رہے۔ فرق و امتیاز کی ہلکی سی لکیر بھی دین اور سیاست کے درمیان نہیں کھنچی گئی۔ حتٰی کہ جب ابوبکرؓ و عمرؓ اپنے آقا کا جسمِ اطہر دفن کئے بغیر مسئلہ خلافت کو حل کرنے سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچ جاتے ہیں اس وقت بھی کسی صحابی نے یہ رائے زنی نہیں کہ افسوس ہم جن لوگوں کو پیکرِ دین و تقویٰ سمجھتے تھے وہ پکّے سیاست باز نکلے اور دینی حیثیت سے وہ انتقال کر گئے۔

ایسی رائے زنی کا تصور ہی کہاں آسکتا تھا جبکہ اللہ کے رسولؐ خود اپنے اقوال و افعال سے یہ درسِ بلیغ دے گئے تھے کہ مومنین کے لئے سیاست بھی عینِ دین ہے جب کہ اس کا رُخ نصرتِ حق کی طرف اور اس کا مقصود اقامتِ دین ہو۔

پھر خلافت کے کم و بیش تیس سالوں میں یہی عقیدہ ایک دینی مسئلے اور قطعی ضابطے کی حیثیت سے قلوب و اذہان میں جاگزیں رہا کہ دین اور سیاست ایک ہی حقیقت کے دو پہلو اور ایک ہی زنجیر کے دو حلقے ہیں۔ ہر مومن پر جس طرح عبادات مصطلحہ کی بجا آوری لازم ہے اسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ سیاسی دائرے میں اس کا کوئی قدم خلافِ حق نہ اُٹھے اور یہ بھی لازم ہے کہ دین و ملت کی مصلحتیں جس وقت بھی اس سے کسی سیاسی سرگرمی اور اقدام و عمل کا مطالبہ کریں وہ اسی طرح اس مطالبہ پر لبیک کہے جس طرح اذان سننے کے بعد نماز کو اور ہلالِ رمضان دیکھنے کے بعد روزے کو لبیک کہتا ہے۔

جی ہاں۔ آج تو اکثر لوگ اس پر چونک جائیں گے کہ سیاسی سرگرمیوں کو صوم و صلوٰۃ جیسی اہمیت دی جا رہی ہے لیکن تاریخ گواہ ہے کہ جس وقت تک اسلامی عقائد و تصورات عجمی تصورات سے ملوّث نہیں ہوئے تھے اس وقت تک اہل ایمان کے یہاں سیاسی اقدام و عمل اور اجتماعی زندگی سے متعلق اُمور کی حیثیت ٹھیک ایسی ہی تھی جیسے نماز کے وقت نماز کی۔ حج کے دنوں میں حج کی۔ زکوٰۃ کے وجوب پر زکوٰۃ کی۔ بلکہ وہ اجتماعی مصالح اور دین و ملت کو نفع پہنچانے والی سیاست کی نگرانی اور نگہداشت میں کچھ زیادہ ہی مستعد اور بیدار تھے۔ یہ بات نہ ہوتی تو نا ممکن تھا کہ ابوبکرؓ و عمرؓ لاشۂ پیغمبرؐ کو سپردِ قبر کئے بغیر ہی سقیفہ بنی ساعدہ پہنچ جائیں اور مسئلہ خلافت دفن رسولؐ پر بھی فوقیت لے جائے۔

پھر فتنوں کا دَور آیا اور ان فتنوں میں سب سے بڑا، دُور رس اور تباہ کن فتنہ وہ تھا جو خفیہ طور پر چپ چاپ اہلِ ایمان کے فکری شریانوں میں کسی ننھے جرثومے کی طرح داخل ہو گیا جس طرح مہلک امراض کے ابتدائی جرثومے کسی جسم انسانی میں نفوذ کرتے ہیں تو اس کے فرشتوں تک کو اس کی خبر نہیں ہوتی اسی طرح اس فتنۂ خفیہ کا ادراک و احساس اس وقت ناممکن تھا۔ اس فتنے کو آپ رہبانیت سے تعبیر کیجئے یا تصوف کا نام دیجئے۔ فراری ذہنیت کہئے یا کوئی بھی عنوان دے لیجئے۔ یہ بہرحال اپنی ابتدا میں نہایت خفی تھا۔ جیسے آپ دیکھتے ہیں کہ ریلوے لائن کا کانٹا بدلنے کا عمل ایک معمولی سا مختصر سا عمل ہے جسے ایک ادنیٰ سے ملازم کا کمزور سا ہاتھ پل بھر میں انجام دیدیتا ہے مگر اس مختصر سے عمل کے نتیجے میں پوری کی پوری

گاڑیاں دوسری ہی سمت چل نکلتی ہیں۔ اسی طرح طرزِ فکر کا یہ فتنہ خفیہ اسلامی نظامِ فکر میں گھس کر اس پورے نظام کی گاڑی کو دوسری ہی لائن پر ڈال گیا اور جوں جوں وقت گذرتا گیا گاڑی اسی بدلی ہوئی لائن پر آگے ہی آگے بڑھتی چلی گئی حتٰی کہ آج وہ جن منازل و مراحل میں ہے وہاں یہ تصور ہی تقریباً عنقا ہوچکا ہے کہ یہ گاڑی چلی تھی کس منزل کیلئے اور جارہی ہے کس منزل کو۔

قرآن پر ہاتھ رکھ کر اور خدا کو حاضر و ناظر جان کر بتائیے کیا یہ دین جس کا مقدس نام اسلام ہے اسی لئے آیا تھا کہ اس کے ماننے والے طاغوت کی غلامی پر راضی رہتے ہوئے بس اسی کو غنیمت جانیں کہ انھیں نماز اور روزے کی آزادی حاصل ہے۔ وہ حج کرسکتے ہیں۔ انھیں درود پڑھنے اور اللہ اکبر کہنے سے کوئی نہیں روکتا۔ یا یہ دین اس لئے آیا تھا کہ تمام دوسرے دینوں پر غالب آتا چلا جائے، تمام دنیائے انسانیت پر اپنا سایہ پھیلائے۔ تمام عالم میں معزز و مقتدر رہو۔ اس کے ماننے والے سوائے خدا کے نہ خود کسی کے غلام ہوں نہ دوسرے انسانوں کو ماسوا اللہ کی غلامی کا اذن دیں۔ یہ مسندِ قضا پر بیٹھ کر تمام معاملاتِ زندگی کا فیصلہ کرے اور اس کے فیصلوں سے سرتابی کی مجال کسی کو نہ ہو۔

سبحانہٗ ما اعظم شانہٗ۔ انسان کے بس میں قضا و قدر تو نہیں۔ لیکن اسلام اگر عزت و اقتدار ہی کے لئے آسمانوں سے نازل ہوا تھا تو دین کے ہر ایسے تصور کو سوائے گمراہی اور کج فکری کے اور کیا کہا جائے گا جس میں سیاست کو نہ صرف بد فاضل شمار کیا جائے بلکہ دینداری کی ضد اور صالحیت کی نقیض باور کرایا جائے۔ جس میں صاف طور پر یہ کہا جائے کہ کوئی شخص بیک وقت داعیٔ حق اور سیاسی لیڈر نہیں ہوسکتا۔ گویا دینداری اور سیاست آگ اور پانی ہیں کہ یکجا ہو ہی نہیں سکتے۔ گویا مفسر قرآن اور اقامتِ دین کا علمبردار جس وقت بھی وادیٔ سیاست میں قدم رکھے گا فوراً ہی اس کی پہلی شخصیت مرجائیگی۔

عجوبے دنیا میں بہت ہیں۔ مگر اس سے بڑھ کر عجوبہ شاید کوئی ہو کہ ایک شخص حکومتِ الٰہیہ کی تحسین و تمنا بھی کرے اور ساتھ ساتھ سیاست کو بھی شجرِ ممنوعہ قرار دے۔ اسے عجوبہ نہیں بلکہ "المیۂ اسلام" کہئے۔ یہی وہ المیہ ہے جو ادبار اور ذلت و خواری کی گھنگھور گھٹا بن کر ساری ملت پر چھایا ہوا ہے۔ آئیے اسے کچھ اور شرح و بسط کے ساتھ سمجھیں۔

مولٰنا دریابادی ان لوگوں میں نہیں ہیں جو جماعت اسلامی کی مخالفت و عناد اور دنیاوی مفادات کے استغراق میں اس حد تک پہنچ گئے ہوں کہ اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ جیسے پاکیزہ و بلند مقصد کو وہ صریحاً یا کنایۃً فرقہ پرستی اور مذہبی دیوانگی سے تعبیر کرتے ہوں۔ ایسے ایمان فروشوں اور مردہ ضمیروں سے یہاں بحث نہیں ہے۔ مولٰنا دریابادی خدا کے فضل سے اقامتِ دین کو پسند کرنیوالوں میں ہیں اور حکومتِ الٰہیہ کی علمبرداری ان کی نگاہ میں ایک قابلِ تحسین و تعریف وصف ہے۔ چنانچہ اس کا اظہار ان کی تحریروں سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے اور اسی "المیۂ پاکستان" میں بھی وہ تحسین ہی کے طور پر فرماتے ہیں کہ:-

"وہ (مولٰنا مودودی) دین کے ممتاز عالم تھے۔ مفسرِ قرآن تھے متکلم تھے۔ اقامتِ دین و حکومتِ الٰہیہ کے علمبردار تھے۔ ایک مستقل و سراپا دینی شخصیت رکھتے تھے۔"

گویا نہ صرف حکومتِ الٰہیہ کا علمبردار ہونا ممدوح کے نزدیک محمود تر شئے ہے بلکہ حکومتِ الٰہیہ کا جو تصور جس انداز و اسلوب میں مولانا مودودی کل تک پیش کرتے رہے ہیں اس سے بھی کامل اتفاق اور اس کی تائید و تحسین کا صریح اعتراف ممدوح کر رہے ہیں۔

اب غور طلب یہ ہے کہ کیا حکومتِ الٰہیہ کی علمبرداری کو پسندیدہ نظروں سے دیکھنے والے مولانا دریابادی نے کبھی یہ بھی تفکر فرمایا ہے کہ حکومتِ الٰہیہ قائم کیونکر ہوسکتی ہے اسے ظہور میں لانے کے لئے جد و جہد کن لائنوں پر ہونی چاہئے

اور کارگاہِ عالم میں سبب و مسبّب اور علت و معلول کا جو دائمی اور غیر متبدل قانونِ الٰہی ازل سے آج تک کارفرما ہے اس کی روشنی میں سعی و عمل کی کونسی تکنک اور ترتیب ایسی ہو سکتی ہے جو حکومتِ الٰہیہ کے نصب العین کی طرف پیش قدمی کے لئے موزوں اور قرین قیاس سمجھی جا سکے۔

کسی ہوشمند کو اس میں شک نہ ہوگا کہ حکومت چاہے الٰہیہ ہو یا غیر الٰہیہ، اچھی ہو یا بُری۔ وہ بہرحال ایک ایسی شے ہے کہ آپ سے آپ کسی گروہ یا قوم کی جھولی میں پکے پھل کی طرح آگرے نہیں گر سکتی۔ اس کے لئے لازماً اور قطعاً ہی جدوجہد کرنی ہوگی جس کا اصطلاحی نام "سیاست" ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی گروہ سیاست و عسکریت سے یکسر دامن کش رہ کر فقط مصطلحہ عبادات کو اپنا وظیفۂ حیات بنالے، ہر دن روزہ رکھے، ہر شب تہجد پڑھے۔ کسی لحظہ درود سے غافل نہ ہو، زکوٰۃ، خیرات کی ادائگی میں پیش پیش رہے۔ چلّے کھینچے، تمام معاصی سے اجتناب کرے اور اس صالحیت کے نتیجے میں حکومتِ الٰہیہ اس کی گود میں آگرے۔ مکانات اور قلعے اینٹ پتھر ہی سے بنتے ہیں کوئی شخص اینٹ پتھر کو ہاتھ لگانا جرم سمجھے گا تو چاہے وہ زندگی بھر سجدے میں پڑ کر مکان بننے کی دعائیں مانگتا رہے مگر ایک دیوار بھی وجود میں نہ آسکے گی۔ اسی طرح حکومتِ الٰہیہ فقط دعاؤں اور عبادتوں سے مل جانے والا کوئی تحفہ نہیں، بلکہ انبیاء علیہم السلام سلام تک کو اس کی خاطر سیاست کے تانے بانے پھیلانے پڑے ہیں اور اللہ کے آخری رسول ؐ نے تو تمام عمرِ رسالت ہی سیاست و عسکریت کی ہمہ وقتی نگہداشت اور نگرانی اور شیرازہ بندی میں کاٹی ہے

پھر یہ کیا عجوبہ ہے کہ مولٰنا دریابادی جیسے عالی دماغ حضرات حکومتِ الٰہیہ کو تو بحیثیت نصب العین محمود و مقدس قرار دیتے ہیں لیکن "سیاست" کے لئے ان کے پاس نفرت و استکراہ اور طعن و ملامت کے سوا کوئی لفظ نہیں اس عجوبے کا حل حقیقتاً یہ ہے کہ ان حضرات نے کبھی سنجیدگی اور امعانِ نظر کے ساتھ یہ تدبر نہیں فرمایا کہ حکومتِ الٰہیہ کہتے کسے ہیں۔ کسی خیالی محبوب کی طرح انھوں نے بس تخیلات کی سطح پر حکومتِ الٰہیہ کو سینے سے لگایا مگر یہ تفکر نہیں کیا کہ تخیلات کی دنیا سے باہر اسے کیونکر قائم کیا جا سکتا ہے۔ انکی مثال خیال پرستی کے پہلو سے اُن سادہ لوح عوام جیسی ہے جو تاریخی ناولوں میں مجاہدین اسلام کے کارنامے پڑھکر مسرور تو بہت ہوتے ہیں لیکن تصور نہیں کر سکتے کہ جنگ فی الحقیقت ہے کیا اور فتوحات کی منزل تک پہنچنے کیلئے نظم و انتظام اور سیاست و عسکریت کے کن سنگلاخ اور کھردرے مسائل و مراحل سے گذرنا پڑتا ہے۔

ورق اُلٹ کر ایک بار پھر "المیۂ پاکستان" کے اس حصّے کو دیکھئے جس میں مولٰنا دریابادی نے یہ بیان فرمایا ہے کہ مولٰنا مودودی کی طرف سے ہمیں کس قسم کے بیانات کی توقع تھی اور کس نوع کی باتیں سُن کر ہم ان کی صالحیت اور دینداری سے مطمئن رہ سکتے تھے۔ اس حصّہ مضمون سے بالکل واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ مولٰنا خواب و خیال کی حسین وادی سے ایک قدم بھی باہر نکالنا نہیں چاہتے اور ادنیٰ درجے میں بھی انھیں علم و ادراک نہیں ہے کہ حکومتِ الٰہیہ کی منزلِ دُور افتادہ کی طرف سفر کس طرح کیا جاتا ہے۔

مثلاً وہ مولانا مودودی سے اس قسم کے بیان کے طالب تھے کہ:۔

> "ہم خادمانِ اقامتِ دین کو اِن سیاسی قضیوں سے کیا واسطہ ۔۔۔۔"

یہ پہلا ہی فقرہ صریح طور پر ثابت کر رہا ہے کہ مولٰنا دریابادی نے "اقامتِ دین" کے فقط الفاظ ہی سنے ہیں، یہ نہیں معلوم کیا کہ عملی دنیا میں اس کا مصداق کیا ہے۔ اگر معلوم کیا ہوتا تو اس طرح کی شاعرانہ اور خیالی باتیں ان کے قلم سے نہ نکلتیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقامتِ دین کسی ایسی سستی اور سہل الحصول شے کا نام ہے جو زہد و تقویٰ کے اعلانات اور فقط متقیانہ تقریروں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ وہی شاعروں والی محبوبۂ "اقامتِ دین" کے نام سے دل میں اُتار لی گئی مگر یہ نہ سوچا گیا کہ مولانا مودودی نے اپنی زندگی کسی

خیالی محبوبہ کے لئے برباد نہیں کی ہے۔ وہ مجہول طور پر اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کا نصب العین لے کر نہیں چلے ہیں بلکہ انھیں پہلے دن سے ادراک و احساس ہے کہ اقامتِ دین کہتے کسے ہیں اور طاغوتی اقتدار کی اس دنیا میں گز بھر زمین پر اقامتِ دین کے خواب کی تعبیر کو حقیقت کا لباس پہنانے کے لئے کیسے کیسے غیر شاعرانہ مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ خوب ہے، یہ فکر و تدبر کہ آپ بنانا تو چاہتے ہیں عالیشان قلعہ لیکن جب کچھ لوگ اس قلعہ کی تعمیر کے لئے ساز و سامان جمع کرنے چلتے ہیں، کدال لے کر پہاڑ کاٹنا چاہتے ہیں، اینٹوں کے لئے بھٹی بنانے کی فکر کرتے ہیں تو آپ چیخ اُٹھتے ہیں کہ لیجئے صاحب یہ تو گمراہ ہو گئے۔ گویا آپ چاہتے یہ تھے کہ یہ لوگ بس مصلے پر بیٹھے تسبیح پڑھتے رہتے، دعائیں کرتے رہتے کہ اے اللہ بڑا سا قلعہ عنایت فرما، وعظ فرماتے رہتے کہ اے لوگو قلعہ تیار کرنا بہت ضروری کام ہے — بس اسی کے نتیجے میں قلعہ بن کر کھڑا ہو جاتا۔

یہی وہ اندازِ فکر ہے جس کی بنیاد خلافتِ راشدہ کے متصل بعد رکھی گئی تھی۔ نصب امام کا وجوب پہلے بھی مانا جاتا رہا اور آج بھی فقہ کی کتابوں میں یہ جوں کا توں موجود ہے لیکن یہ احساس کم سے کم تر ہوتا گیا کہ اس وجوب پر عمل کرنے کے لئے کسی قسم کی کوششیں کن لائنوں پر ہونی ناگزیر ہیں۔ مصطلحہ عبادتیں کُل کا کُل دین بن گئیں۔ زہد و تقویٰ اشکالِ ظاہری کا پابند ہوتا گیا اور خود غرضی کی یہ ظاہر فریب شکل عام ہوتی چلی گئی کہ ہر ہر شخص اپنے اپنے لئے جنت حاصل کرنے کی تگ و دو میں مگن ہو جائے اور ان سیاسی سرگرمیوں سے حتی الوسع دُور ہی رہے جو اسلام کو تختِ اقتدار اور مسندِ قضا پر متمکن رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔

اسلام سے پے در پے شکست کھانے والی نصرانیت نے گذشتہ صدیوں میں اسلام کے خلاف جن ریشہ دوانیوں میں کامیابی حاصل کی ہے ان میں سب سے مہلک اور تباہ کن ریشہ دوانی یہی ہے کہ خود ملتِ مسلمہ کے دماغ میں اس نے دین و سیاست کی دوئی کا تصور اُتار دیا اور اسلام کو دو مستقل اکائیوں اور متضارب یونٹوں میں تبدیل کر کے اقتدار و تسلط کی مسند کو غیر اسلام کے لئے محفوظ کر لیا۔

آج مولانا دریابادی جیسے اہل نظر بھی اگر سیاسی قضیوں کو اقامتِ دین کے علمبرداروں کے لئے باعثِ ننگ اور شجرِ ممنوعہ سمجھتے ہیں تو یہ دشمنانِ اسلام کی کامیابی کی انتہا ہے ذرا سوچئے تو۔ آغازِ عالم سے آج تک کبھی بھی ایسا ہوا ہے کہ کوئی گروہ "سیاسی قضیوں" سے قطعاً مجتنب رہا ہو اور کسی ملک کی تو کیا کسی قصبے اور دیہات کی بھی حکمرانی اسکے حصے میں آگئی ہو۔ یہ عادۃً محال، عقلاً خلافِ واقعہ اور تجربتہً بعید از امکان ہے۔ پھر یہ کیسا عبرتناک لطیفہ اور کیسا مضحکہ خیز شگوفہ ہے کہ مولانا دریابادی اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کی حمد بھی کرتے ہیں اور سیاست کو جنسِ ناپاک بھی سمجھتے ہیں۔

اور دیکھئے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ ہم تو مولانا مودودی کی زبان سے یہ سُننے کے متوقع تھے کہ:۔

"ہمارے نزدیک برطانوی نظامِ جمہوریت اور امریکی نظامِ صدارت سب یکساں۔ حکومتِ الٰہیہ کے معیار سے دُور اور بے وزن ہیں"

گویا ممدوح کے نزدیک مولانا مودودی کو بھی اتنا ہی سطحی بیں اور بے بصیرت ہونا چاہیئے تھا جتنے مولانا امین احسن اور — خطا معاف کم سے کم اس معاملہ کی حد تک خود مولانا دریابادی ہیں۔ یہ بات کوئی خدا بخش یا گل خیرو کہدے تو قابلِ معافی بھی ہے کہ پاکستانی انتخاب کا نزاعی مسئلہ دو نظاموں کی صرف ظاہری شکل اور انتظامی ڈھانچوں کا مسئلہ تھا۔ یعنی وہاں جنگ صرف اس بات پر تھی کہ برطانوی طرز کا نظامِ حکومت آئے یا امریکی انداز کا صدارتی نظام۔ خدا بخش اور گل خیرو گہرائی میں نہیں جا سکتے اس لئے انکی فریب خوردگی قابلِ فہم، لیکن جو اربابِ دانش اُڑتی چڑیا کے پر گننے کا دعویٰ رکھتے اور دنیا بھر کے مسائل پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں وہ بھی اگر الفاظ و اشکال اور اصطلاحات کے پھیر میں حقائق و معانی سے آنکھیں بند کر لیں تو اسے

قیامت سے کم کیا کہیں گے۔ مولانا امین احسن ہوسکتا ہے انگریزی لٹریچر پر نظر نہ رکھتے ہوں مگر مولٰنا دریا بادی تو بفضلہ تعالیٰ اونچے انگریزی داں ہیں۔ کیا وہ ایماندار ی کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کا ایوبی نظام صدارت جمہوری اسپرٹ اور عوامی حقوق کے اعتبار سے کوئی بھی مناسبت امریکہ کے صدارتی نظام سے رکھتا ہے۔ کیا وہ خدا کو حاضر و ناظر جانکر کہہ سکتے ہیں کہ ایوبی دورِ حکومت میں جس نوع کے جمہور کُش اور آزادی دشمن آرڈیننس اور قوانین نافذ ہوتے رہے ان جیسا کوئی بھی آرڈیننس اور قانون امریکہ میں نافذ ہونا ممکن ہے؟ — ایک عائلی قانون ہی کو لے لیجئے۔ مولانا خود بھی اس کے معترف ہیں کہ یہ قانون خلاف شرع جزئیات پر مشتمل ہے۔ انھیں یہ بھی علم ہے کہ پاکستان کے تمام قابلِ ذکر علماء اس کے خلاف اسلام ہونے پر متفق ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کی وضع اور نفاذ جمہوری نمائندوں نے نہیں کیا بلکہ حکمراں ٹولی نے چند حلقہ بگوشوں کے تعاون سے اسے گھڑا اور ڈنڈے کے زور سے نافذ کردیا — کیا امریکہ کے صدارتی نظام میں یہ تصور بھی ہوسکتا ہے کہ امریکی عوام کی رائے کے خلاف اور ان کے شدید احتجاج سے بے پروا ہوکر صدر صاحب اپنے چند حلقہ بگوشوں کی مدد سے ایک قانون وضع کرکے نافذ فرمادیں اور پھر کتنا ہی شور مچے، کتنی ہی واویلا ہو مگر ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگے۔

اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو آخر یہ اہل نظر کو کیا ہوگیا ہے کہ فقط کھوکلی اصطلاحوں کا کھیل کھیلتے ہیں اور چاہتے یہ ہیں کہ مولٰنا مودودی بھی اسی کھیل میں شریک ہوتے اور اس حقیقت کا ادراک نہ کرتے کہ جنگ دو لفظی اصطلاحوں میں نہیں۔ بلکہ جمہوریت اور آمریت میں ہے۔ آزادی اور غلامی میں ہے۔ کیا ہم یہ سمجھیں کہ بعض اور نادانوں کی طرح مولٰنا دریابادی بھی یہ تصور رکھتے ہیں کہ غلامی صرف کسی غیر ملکی تسلّط کا نام ہے اور اپنا ہی ہم وطن اور ہم مذہب اگر گردنوں میں قلاوے ڈال کر کھینچتا پھرے تو اسے آزادی کہیں گے غلامی سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔

ایوب خاں مسلمان ہیں۔ ان کے حواریین بھی مسلمان ہیں ہی ہیں، لیکن آمرانہ قوانین کے ذریعہ انھوں نے "رعایا" کو جن شکنجوں میں جکڑا ہے ان کا نام آپ چاہے امریکی ہتھکڑیاں رکھ لیں یا برطانوی طوق اس حقیقت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ پاکستانی عوام کو وہ آزادی میسر نہیں جسے اسلام آزادی کہتا ہے۔ اس آزادی کے حصول کی جدوجہد بجائے خود ایک مقصدِ نیک اور منزلِ محمود ہے۔ کیا وجہ ہے کہ انگریزوں کے تسلّط کا خاتمہ تو بالاتفاق فرض و واجب سمجھا گیا لیکن پاکستانی عوام کے لئے آزادی اور حقوق کی جنگ اس لئے ہمارے بزرگوں کو کھل رہی ہے کہ مولٰنا مودودی بھی اس میں شریک نظر آرہے ہیں۔

مولانا مودودی نے جناب ایوب خاں صاحب کے بارے میں جو الفاظ کہے تھے ان کا مفہوم و مدعا ہم پچھلے شمارے میں شرح و بسط کے ساتھ بیان کرچکے۔ اس کے باوجود اگر مولٰنا دریابادی انھیں نعرۂ کفر کی حد تک غلیظ و کریہ بناکر پیش کرتے رہنا نجاتِ آخرت کا ذریعہ سمجھتے ہیں تو ان کی خوشی لیکن یہ بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے بدعتی حضرات ہر توجیہہ و تصریح کو نظر انداز کرتے ہوئے برابر یہی رٹّے چلے جاتے ہیں کہ فلاں دیوبندی عالم کے نزدیک شیطان کا علم رسول اللہ ؐ کے علم سے زیادہ ہے، فلاں وہابی کے نزدیک گدھے اور گائے کا تصور رسول اللہ ؐ کے تصور سے بہتر ہے اور فلاں دیوبندی مرشد حضور ؐ کو فقط بڑے بھائی سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہیں ہے۔

جس رنج و غم کا اظہار مولٰنا نے ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

> "یہ معلوم ہوا کہ ہاتھ سے کتنی قیمتی نعمت چھن گئی، پیروں کے نیچے سے زمین ہسرکتی ہوئی محسوس ہوئی — دل شکستگی اور حسرت کی نوعیت کچھ اس قسم کی رہی۔۔۔"

اسے ہم مکر مچھ کے آنسوؤں سے تو تعبیر نہیں کرسکتے، لیکن یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس رنج و غم کی بنیاد بھی یہی خیال پرستی ہے جس کا ہم تذکرہ کر آئے ہیں۔ یعنی مولانا اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کو تو بے شک تحسین و تبریک کا مستحق سمجھتے ہیں اور اس کی

دعوت ان کی نظر میں دینداری کی ضمانت ہے، لیکن اس دعوت کے عملی تقاضے کیا ہیں، اس کی ٹھوس شکل کیا ہوتی ہے۔ اسے کن تلخ حقائق سے لازماً دو چار ہونا پڑتا ہے یہ سب کچھ ان کے حیطۂ خیال میں نہیں ہے۔ وہ تو شاید کچھ ایسا تصور کئے ہوئے ہیں جیسے فقط آرزو کرنے کے نتیجے میں حکومتِ الٰہیہ دفعتاً آسمان سے نازل ہو جائے گی۔ یا پھر ان کا خیال ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب کوئی داعیِ حق قال اللہ اور قال الرسول کی تسبیح پڑھتا ہوا آگے بڑھے گا اور تختِ حکومت پر تشریف رکھنے والا اگر وہ فرطِ رعب سے لرزہ بر اندام ہو کر عرض کرے گا کہ لیجئے حضرت آپ اس تخت پر تشریف لے آئیے ہم اپنے اقتدار سے دستبرداری دیتے ہیں۔

ایسی توقعات جن لوگوں نے باندھ رکھی ہوں، ایسے خوشنما تخیلات پر جن لوگوں کا اطمینان ہو، انھیں یقیناً دھکا لگنا ہی چاہئے اور بے حد صدمہ پہنچنا ہی چاہئے، جب وہ یہ دیکھیں کہ داعیِ حق وعظ و تقریر اور تقویٰ ریز نعروں کی بجائے سچ مچ پنجہ کشی کرنے چلا ہے اور اقامتِ دین کی سقفِ اعلیٰ پر دفعتاً چھلانگ لگانے کے عوض سیڑھی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ مولانا مودودی اگر اس انتظار میں خانہ نشیں رہتے کہ آسمان سے فرشتے اُتر کر "اقتدارِ الٰہی بہ مقابلہ اقتدارِ انسانی" کا مسئلہ چھیڑیں تب ہم گھر سے نکلکر دادِ جہاد دیں تب بے شک مولانا دریابادی کو مسرت ہوتی اور اور وہ انھیں مفسرِ قرآن اور دین کا ممتاز عالم تسلیم کئے جاتے ہمارے کم و بیش تمام ہی اکابر عرصۂ دراز سے اسی کے منتظر ہیں کہ جب اقامتِ دین کا من و سلویٰ آسمان سے نازل ہوگا اور فرشتے حکومتِ الٰہیہ کا خوان سجا کر زمین پر اتریں گے اس وقت ہم میدانِ وغا میں نکلیں گے۔ ابھی طاغوت مسلّط ہے۔ ہر طرف باطل کا دور دورہ ہے۔ لہٰذا کیوں ہم مدرسہ و مسجد کے پُر امن گوشوں سے نکل کر اقامتِ دین کی خطرناک گھاٹی میں کود دیں اور کیوں ایسے حالات پیدا کرنے کی جانگسل جدو جہد کا عذاب مول لیں جس میں صالحین کے غلبہ و اقتدار کا امکان پیدا ہو سکے۔

"اقتدارِ الٰہی" کے الفاظ ادا کرنے آسان ہیں لیکن یہ تصور تو کوئی دیوانہ ہی کر سکتا ہے کہ خدا خود ایک روز انسان کی شکل میں اُتر کر کسی حکومت کا صدر یا وزیرِ اعظم بنے گا۔ خلفائے راشدین انسان ہی تھے خدا نہیں تھے لیکن "اقتدارِ الٰہی" کا دور انھی کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اب جب کبھی اس طرح کا دَور آئے گا اچانک اور دفعتاً نہیں آئے گا بے شمار تدریجی مراحل سے گذر کر آئے گا۔ جو لوگ یہ گمان رکھتے ہیں کہ بڑی برائی کے مقابلے میں چھوٹی برائی گوارا کر لینے کے عوض داعیانِ حق کو ایک ہی جست میں اُس حکومتِ الٰہیہ تک پہنچ جانا چاہئے جو ہر نقص و عیب سے پاک ہے اور جب تک ایسا ممکن نہ ہو کونے میں پڑ کر صرف تسبیح و مصلےٰ سے واسطہ رکھنا چاہئے وہ لوگ شاعر اور آرٹسٹ تو کہلائے جا سکتے ہیں مبصر اور مدبّر نہیں۔

بڑا صدمہ یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ یہ سو فیصدی غلط بات بار بار دہرائی جا رہی ہے کہ پاکستان کی انتخابی جنگ جمہوریت ہی کی دو متبادل شکلوں یعنی برطانوی اور امریکی نظام کی جنگ تھی۔ اللہ جانے ان حضرات نے جمہوریت کی کیا تعریف سمجھ رکھی ہے۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے روس بھی اپنے نظام کو جمہوری کہتا ہے بلکہ سب سے زیادہ کہتا ہے اور وہاں کی حکومت "عوام کی حکومت" کہلاتی ہے۔ اب اگر کسی ملک میں سوال یہ درپیش ہو کہ وہاں برطانیہ جیسا نظامِ سلطنت قائم کیا جائے یا روس جیسا تو کیا یہ کہنا کسی بھی درجے میں معقول ہوگا کہ یہ ایک حقیر سا اختلاف ہے جسے اسلام کی نظر میں کوئی اہمیت حاصل نہیں اور سچے مسلمانوں کو ان میں سے کسی بھی نظام کی حمایت اور مخالفت میں حصّہ نہیں لینا چاہئے۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے اسلام کا کیسا رسوا کن تصور گھڑ رکھا ہے ان لوگوں نے جو یہ باور کرانا چاہا ہے کہ جس طرزِ حکومت کا نام اس کے حامی اور واضع "جمہوری نظام" رکھ دیں وہ یقیناً جمہوری ہی ہوگا اور اس کی مزاحمت کرنے کی جدو جہد فقط ایک سیاسی جدو جہد ہوگی جس سے وابستگی

اہل دین اور اربابِ حق کے لئے باعثِ ننگ ٹھیرے گی یہ تصور ناسمجھی اور سادہ لوحی کی انتہا ہے اسلام فقط ناموں کے غلافوں اور اصطلاحوں کے پردوں کو نہیں دیکھتا بعانی و حقائق پر نظر رکھتا ہے۔ پاکستان کے صدرِ محترم نے فوجی انقلاب کی راہ سے اقتدار حاصل کر کے ایک نیا دستور وضع کیا اور اس کا نام "جمہوری دستور" رکھدیا تو کیا فقط اس دلیل سے اسے جمہوری مان لینا چاہیئے کہ اس کے بعض پہلو ظاہراً امریکن دستور جیسے ہیں۔ کیا واضعین کا رکھا ہوا نام ہی سب کچھ ہے کام کی کچھ اہمیت نہیں ؟

خدا دیدۂ بینا دے ان لوگوں کو جو یہ سیدھی سی بات نہیں سمجھ پا رہے کہ ایوبی نظامِ حکومت صرف بعض صوری پہلوؤں کے اعتبار سے امریکی طرز کی جمہوریت سے مشابہ ہے لیکن اس کی روح آمرانہ ہے، اس کے عناصر و اجزاء کا دروبست اور اس کی آئینی تکنک مطلق العنانی کے فلسفہ سے ہم آہنگ کی گئی ہے۔ اگر فرق صرف شکل اور ڈھانچے کا ہوتا اور جمہوریت کی مسلمہ قدریں پامال نہ کی گئی ہوتیں تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مولانا مودودی اور ان کی جماعت ایک عظیم خطرہ مول لیکر ایوب خاں صاحب کی مخالفت کرتی۔

خلاصۂ کلام کے طور پر ہم مولانا دریابادی کی خدمت میں عرض کریں گے کہ یا تو وہ صاف صاف کہدیں کہ مسندِ اقتدار پر اسلام کو رونق افروز کرنے کی کوشش ہرگز ہرگز قابلِ تحسین نہیں ہے، بلکہ امتِ مسلمہ پیدا کی ہی گئی ہے اس لئے کہ غیر اسلامی اقتدار کے زیر سایہ بس نماز روزہ کرتی رہے اور اہل اقتدار معاشرے کو جس سانچے میں ڈھالنا چاہیں اس کے خلاف صرف زبانی فریاد و احتجاج اور وعظ و پند پر اکتفا کرے اور عملی جدوجہد سے کوئی سروکار نہ رکھے۔

یا پھر وہ ایسا جادو بتائیں جس کے ذریعے دنیا کا یہ سب سے بڑا اعجوبہ ظہور میں آسکے کہ حق کے داعی سیاست سے کنارہ کش رہتے ہوئے اسلام کو تختِ اقتدار پر بٹھا سکیں۔

ایک لطیف مکتوب

مولانا عامر عثمانی صاحب! السلام علیکم

ایک عریضہ مولانا امین احسن اصلاحی کی خدمت میں پہنچانا چاہتا ہوں۔ کیا میں امید رکھوں کہ تجلی کے ذریعہ آں محترم کی تشریح کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔ وہو ہذا۔ (لطف الرحمن۔ بھوپال)

مولانا محترم! السلام علیکم

تازہ "میثاق" میں آپ نے فرمایا ہے کہ "جماعت اسلامی کے متعلق تو ہماری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ اس وقت اسلام کے لئے اس ملک میں اس سے زیادہ مضر جماعت کوئی نہیں ..... دین اور عقل دونوں سے بعید تر جماعت اس ملک میں اگر کوئی ہے تو جماعت اسلامی ہے۔"

میرے جیسے ایک عام آدمی کو آپ جیسے ذمہ دار علماء کی رائے پر اعتماد کرنا ہی چاہئیے اسی لئے آں محترم سے اپنی ایک الجھن کو صاف کرنے کی درخواست ہے۔

میں یہ دریافت نہیں کروں گا کہ اس موقعہ پر آپ کو اپنی رائے کے ساتھ "ایماندارانہ" لکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ کیا آپ کی کوئی رائے ایمانداری سے خالی بھی ہوتی ہے؟ یا ایک خاص نفسیاتی کیفیت نے جس کو ہم جیسے عوام احساسِ کمتری کے نام سے جانتے ہیں آپ کے قلم سے یہ بات نکلوادی۔ بہرحال میں اسکے متعلق کچھ عرض نہیں کروں گا۔ البتہ آپ کی رائے پر اعتماد کرتے ہوئے یہ الجھن ضرور پیش آتی ہے کہ آپ جماعت اسلامی میں پندرہ سولہ سال ذمہ دارانہ مقام پر رہے اور آپ کی نہایت گرم تقریریں اور مدلل و ضخیم تحریریں شاہد ہیں کہ اس وقت آپ کی نظر میں جماعت اسلامی ایک ہی حق کی علمبردار جماعت تھی اور اس سے اختلاف کرنا یا تو علم و فہم کا قصور تھا یا نیت کا فتور۔ ایسی صورت میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ پندرہ سولہ سال اس کے اندر ذمہ دارانہ حیثیت میں رہنے کے بعد اس کی ضلالت و مضرت نہ سمجھ سکے تو ہم کو کیسے اطمینان ہو کہ اب جو رائے آپ ظاہر فرما رہے ہیں وہ درست ہوگی۔ ممکن ہے ۱۹۷۲ء میں آپ پر انکشاف ہو کہ آج جو رائے آپ ظاہر فرما رہے ہیں وہ صحیح نہیں تھی۔

آپ نے تازہ میثاق میں صحیح فرمایا ہے کہ اپوزیشن پارٹیاں جو وعدے کرتی ہیں وہ اُدھار ہوتے ہیں اور برسرِ اقتدار پارٹی جو وعدے کرتی ہے وہ نقد ہوتے ہیں اور "نقد اور نسیہ میں جو فرق ہے وہ معلوم ہے" میں دوسری مخالف پارٹیوں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ اسلام کی علمبردار جماعتیں جن وعدوں پر جی رہی ہیں اور جن وعدوں کی طرف لوگوں کو دعوت دیتی ہیں وہ تو بے شک ادھار ہی ہیں اور برسرِ اقتدار لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اسکا نقد ہونا ظاہر ہے۔ میں آپ کی ذاتِ گرامی پر بدگمانی نہیں کرتا۔ لیکن فارس کا دلی دکنی ایک ہزار سال پہلے "عطاءِ کردگار" اور "عطاءِ شہریار" کا موازنہ کرتے ہوئے کہہ گیا ہے

آں بہشتے ناپدید است ایں بہشت استے عیاں
آں بہ نسیہ ایں بہ نقد است آں نہاں ایں آشکار

آں مکافاتِ جہاد است ایں مکافاتِ مہیج
آں عطاءِ کردگار است ایں عطاءِ شہریار

آپ کی تفسیر ابھی سورۂ مائدہ تک نہیں پہنچی ہے اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ "ولا یجرمنکم شنآن قوم۔ الخ" کی تفسیر آپ کی رائے میں کیا ہے۔ البتہ اتنا مجھے معلوم ہے کہ یہ جذبہ علماء حضرات تک کو اتنا مغلوب کر دیتا ہے کہ مولٰنا اسمٰعیل شہیدؒ کے بارے میں ایک زبردست عالم ہی نے فرمایا تھا کہ "اسمٰعیل جس چیز کو حلال کہے گا اس کو میں حرام کہوں گا۔ اور اسمٰعیل جس چیز کو حرام کہے گا اس کو میں حلال کہوں گا" اس بات کا جو جواب حضرت شہیدؒ نے دیا تھا اسے میں نقل نہیں کرتا آں محترم کو خود معلوم ہوگا۔ میں تو آپ کا نیازمند اور معتقد ہونے کی حیثیت سے اپنے اور آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہٗ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہٗ۔

لطف الرحمٰن۔ بھوپال

تجلّی

یہ دیکھ ہنسی آئی کہ آں جناب نے مولانا اصلاحی سے اپنی الجھن دور کرنے کی درخواست فرمائی ہے!

اطمینان رکھیئے ایسی درخواستوں کا حاصل کچھ بھی نہ ہوگا۔ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے تقویٰ شعار معترضین نے مدت سے جو روش اختیار کر رکھی ہے وہ صریح طور پر یہ ہے کہ اپنی ہی اپنی کہے جاؤ دوسرے کی بالکل مت سنو۔ وہ اپنی کہنے میں دنیا کے سب سے بڑے لفّاظ نظر آئیں گے لیکن گل افشانیوں کا جواب سننے کیلئے آپ ان کے پاس کان نہیں دیکھیں گے۔ وہ مولٰنا اصلاحی ہوں یا مولانا دریابادی۔ مولوی فرقان الحق ہوں یا مفتی مہدی علی۔ یہ سب اس رویّہ پر متفق ہو چکے ہیں کہ طعن و ملامت تضحیک و تخفیف اور طنز و افتراء کے جتنے تیر میسر آسکیں چلائے جاؤ اور کوئی بھی اللہ کا بندہ اس ظلم پر کتنا ہی خدا کا خوف دلائے، دلائل و شواہد پیش کرے، معقول ترین جوابات دے اس پر التفات ہی نہ کرو۔

پھر لطف یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے ہی قلم سے اپنے آپ کو بڑے سرے کا متقی، عدل پسند اور عالم و فاضل بھی باور کرتے جاتے ہیں۔ ان کی ایک ایک سطر سے ایسا معلوم ہوگا جیسے اسلام کی محبت کا طوفان ان کے سینوں میں ٹھاٹھیں مار رہا ہے اور دینِ حق کے عشق کی شدت انھیں دُہرا کئے دے رہی ہے ــ لیکن ان کے مجموعی طرزِ عمل اور اندازِ فکر کو نفسیات کے آئینے میں دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت تقویٰ اور خشیتِ الٰہی سے ان کے قلوب و اذہان اتنے ہی دور ہیں جتنا زمین سے آسمان۔ ان میں سے بعض کے کاسۂ سر میں انانیت کی ہوا بھری ہے۔ بعض جہل مرکب میں گرفتار ہیں، بعض افلاسِ فہم و ذکا کے باعث غلط فہمیوں کے جال میں الجھے ہوئے ہیں اور بعض کے سینوں میں کینے اور رقابت کی آگ جل رہی ہے۔ یہ کسی اور کی الجھن کیا دور کریں گے:-

یہ خود اپنی ہی شبِ تار سحر کر نہ سکے

مختصر یہ کہ ان سے کسی تشفی بخش جواب کی توقع نہ رکھیئے۔ ہاں تشفی مطلوب ہو تو حدیثِ رسولؐ کی طرف رجوع کیجئے۔ آپ کی الجھن وہ حدیث بہترین طور پر دور کر سکتی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ:-

"ایک بندہ زندگی بھر اہل جنت جیسے عمل کرتا ہے لیکن پھر وہ دفعتاً دوزخ میں جا گرتا ہے اور ایک بندہ عمر بھر دوزخیوں جیسے عمل کرتا ہے مگر پھر اچانک اہلِ جنت میں درج کر لیا جاتا ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ تمام اہل اللہ اور اصحاب علم نے ہمیشہ اس دعا کو ہر دعا پر فوقیت دی ہے کہ اے اللہ ہمارا خاتمہ ایمان پر ہو۔

مولانا اصلاحی نے بہت سال جماعت اسلامی کے ساتھ کاٹے۔ یہ سال ان کی زندگی کے بہترین سال تھے۔ میدانِ وغا میں باطل سے نبرد آزما ہونے اور سرد و گرم جھیلنے سے بڑھکر سعادت اور کیا ہوگی، لیکن سعادت و شقاوت کی وہ تحریر تو آقائے کائنات ہی کے علم میں ہے جو لوحِ محفوظ میں رقم کر دی گئی۔ یہ شقاوت و نحوست کی انتہا ہے کہ پوری جوانی

جس شخص نے مجاہدینِ حق کے دوش بدوش طاغوت سے لڑنے میں گذاری آج وہی طاغوت کا معاون اور مجاہدینِ حق کا بدترین دشمن بنا ہوا ہے۔ حیرت یقیناً ہوتی اگر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ صداقت نظام نے پہلے ہی اس انقلاب حال اور قلا بازی کی نشاندہی نہ کر دی ہوتی، لیکن حدیث مذکورہ کے بعد ہمیں اس پر کوئی حیرت نہیں —— اور آپ کو بھی نہ ہونی چاہیئے کہ مولانا اصلاحی اور وحیدالدین خاں جیسے لوگ شیطان کی چال میں آگئے اور اب سوائے خدائے مقلب القلوب کے کسی کے بس میں نہیں جو انھیں صراطِ مستقیم دکھا سکے۔

یہ بالکل درست ہے کہ جماعت اسلامی میں شریک ہونے نہ ہونے پر اسلام کا دارومدار نہیں ہے۔ جماعت سے باہر کے تمام مسلمان بھی مسلمان ہی ہیں اور ان میں بڑے بڑے اولیاء اللہ ہیں جن کی کفش بردار ی ہم جیسوں کے لئے باعث صد افتخار ہوسکتی ہے لیکن جماعت اسلامی سے باہر ہونا اور بات ہے اور جماعت اسلامی کا دشمن ہونا اور۔ جس طرح اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد اللہ کے رسول اور قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اسی طرح اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جماعت اسلامی کی پیش کردہ دعوتِ حق عین وہی دعوت ہے جسے قرآن وحدیث نے کہیں اسلام کہیں ایمان کہیں دین اور کہیں حق کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ اس دعوت کی مخالفت میں زور لگانا، اس کے حاملین کو ذلیل و رسوا کرنے کی کوشش کرنا، اسے باطل قرار دینا، اس سے عناد رکھنا اور اس کے موجودہ داعی کے خلاف طعن واعتراض اور الزام وافتراء کا طوفان اٹھا کر مخلوقِ خدا کو گمراہ کرنا اتنی بڑی شقاوت اور بدنصیبی ہے کہ دس ہزار سال کی عبادتیں بھی شاید ہی اس کا بدل ہوسکیں۔ یہی بات ہے جس کی طرف حدیث نبوی نے توجہ دلائی ہے کہ اے ظلوم وجہول انسان! اپنی عبادت وریاضت پر مت پھول جا! اپنے زہد وتقویٰ پر مت اترا۔ تجھے کیا معلوم کہ تیرا ایک ہی عمل بد کب تجھے جہنم میں دھکیل دے گا اور کب تیری ایک ہی قلا بازی تیرے سارے کئے دھرے پر پانی پھیر دے گی۔

ہم ولی وقطب نہیں ہیں جو کوئی مکاشفہ کر سکیں۔ لیکن قرآن وحدیث کا عطا فرمودہ علم اگر درست ہے تو خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ کوئی بھی وہ شخص آخرت کی جوابدہی سے نہ بچ سکے گا جو آج کے دورِ ظلمت میں جلنے والے اس چراغ کو بجھانے کے درپے ہوگا۔ یہ چراغ "جماعت اسلامی" سے عبارت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو تو معمولی تادیب کے بعد معاف فرمادے جو علم وفہم کی کمی اور سادہ لوحی کے باعث جماعت اسلامی کے مخالفت کر رہے لیکن جو حضرات مخالفت کے مشن میں قیادت وامارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں وہ تو اکابر مجرمین میں سے ہیں۔ وہ عبادت وریاضت اور پوشش کے اعتبار سے اپنے وقت کے جنید وشبلی ہی کیوں نہ ہوں، لیکن مالک یوم الحساب ان سے بڑی شدید باز پرس کرے گا۔ وہ میک اپ سے دھوکا کھانیوالا نہیں

مولانا امین احسن کے اس اداریئے پر —— جس میں وہ اپنی دانست میں کشورِ علم واستدلال کے سارے جگر گوشے جمع کر لائے تھے —— تفصیلی تنقید ہم ابھی جنوری کے تجلی میں کر چکے ہیں۔ اس کے بعد ضرورت نہیں معلوم ہوتی کہ "عورت کی سربراہی" کے مسئلہ پر ان کی مزید مفوات پر التفات کریں۔ ہاں آنجناب نے ان کے ایک فرمودے پر دلی دکھی کی جو بیت چسپاں کی ہے اس کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ آپ نے اس بیت کے ذریعے ان کے چہرے کا نقاب اُلٹ دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دوسروں کو سبق پڑھانے کے لئے وہ چاہے "تذکیۂ نفس" جیسی ہزار کتابیں لکھتے رہیں لیکن خود اپنے نفس پر توجہ دینے کی مہلت وہ نہ نکال سکے۔ خود تنقیدی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ جس کاسۂ سر میں اَنا ولاغیری کا لاوا جوش مار رہا ہو وہاں خود تنقیدی کے تصور کا گذر کہاں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس لاوے کا سرچشمہ خود اعتمادی نہیں بلکہ احساس کمتری ہو۔ کاش کوئی مشین ایسی ہوتی جو ان کے لاشعور کا عکس دنیا کے سامنے پیش کر سکتی۔ اس وقت یہ حیرتناک حقیقت ہر خاص وعام پر واضح ہوسکتی کہ مولٰنا اصلاحی کے سارے پیچ وتاب،

شور و شیون، نمائش علم و دراست اور طنطنۂ عقل و تفقہ کا اصل سرچشمہ اس وقت صرف یہ احساس بنا ہوا ہے کہ میں مولانا مودودی کی قامتِ بلند کے آگے بالشتیا کیوں نظر آتا ہوں میں پستہ قد کیوں ہوں اور وہ قد آور کیوں — اس احساس کی چبھن سے نجات پانے کے لئے وہ اپنے جسم کو ربر کی طرح کھینچکر اونچا کرنے اور مولانا مودودی کی ٹانگیں کاٹ کر انھیں اپنی برابر لانے کی تگ و دو میں نیم دیوانے ہو کر رہ گئے ہیں۔ زندگی کے بقایا ایام وہ شاید اسی کرب و تعب میں گذار دیں گے اور ہوسکتا ہے اس کرب و تعب کا ازالہ کسی خداوند نعمت کی بارانِ نوازش کر ہی دے۔ یہ انکی محنتوں کا قرار واقعی بدل ہوگا۔

قرآن اور حمائلیں۔ رنگین اور عکسی

آرڈر میں صرف نمبر لکھدینا کافی ہے۔ ڈاک خرچ خریدار ہی کے ذمّہ ہوگا۔ لہٰذا کئی آدمی مل کر کئی نسخے طلب کرلیں تو بنڈل ریل سے جاسکے گا جس میں کفایت ہوگی۔

مترجم

قرآن نمبر ۱ ترجمہ:۔ مولانا شیخ الہندؒ
تفسیر:۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ۔
پاکستانی ایڈیشن۔ مجلد بائیس ۲۲ روپے۔ ہندوستانی ایڈیشن مجلد بیس ۲۰ روپے

قرآن نمبر ۶۴ ترجمہ و تفسیر:۔ مولانا اشرف علیؒ
مجلد ریگزین دس روپے۔
مجلد پلاسٹک گیارہ ۱۱ روپے۔ مجلد چرمی تیرہ ۱۳ روپے۔

قرآن نمبر ۶۸ دو ترجمے۔ حضرت شاہ رفیع الدینؒ۔ اور مولانا اشرف علیؒ۔
حاشیے پر مختلف مستند تفاسیر کا نچوڑ۔
مجلد ریگزین ـ ساڑھے گیارہ روپے۔ مجلد پلاسٹک تیرہ ۱۳ روپے
مجلد چرمی پندرہ روپے

حمائل نمبر ۲۵ ترجمہ:۔ فتح الحمید۔
حاشیہ:۔ موضح القرآن۔
مجلد ریگزین ۸ روپے۔ پلاسٹک ۹ روپے۔ چرمی ۱۰ روپے۔

حمائل نمبر ۸ ترجمہ:۔ شاہ عبدالقادر جیلانیؒ
تفسیر:۔ موضح القرآن۔ ریگزین ساڑھے سات
پلاسٹک دس روپے ـ چرمی بارہ روپے۔

حمائل نمبر ۳۶ ترجمہ:۔ فتح الحمید۔ تفسیر:۔ موضح القرآن۔
ریگزین آٹھ روپے۔ پلاسٹک نو روپے

بلا ترجمہ

قرآن نمبر 3B اعلیٰ سفید کاغذ پر۔ مجلد ریگزین چھ روپے۔ پلاسٹک ساڑھے سات روپے

حمائل نمبر ۸۶ چھپائی بلاک۔ کاغذ معمولی۔
جلد ریگزین تین روپے ۵۰ پیسے۔

حمائل نمبر ۲۳ قرآن 3B کا کچھ چھوٹا سائز۔ بہت ہی روشن۔ سفید کاغذ پر موتیوں کی مانند۔
مجلد ریگزین چار روپے۔ پلاسٹک پانچ روپے۔
مجلد سالم چرمی سات روپے۔

حمائل نمبر ۲۲ آرٹ پیپر۔ دو رنگی چھپائی۔ ہر سطر کے بعد لائن۔ اعلیٰ قسم۔ مجلد ریگزین۔
ہدیہ سات روپے۔

حمائل نمبر ۵ (پاکٹ سائز) مجلد پلاسٹک
ہدیہ چار روپے

حمائل نمبر ۲۶ (پاکٹ سائز) مجلد پلاسٹک
ہدیہ تین روپے

یازدہ سورہ بہت ہی نفیس۔ اعلیٰ کاغذ پر۔ مجلد پلاسٹک۔ ہدیہ ڈھائی روپے۔

تاج کمپنی لاہور کی ایک شاندار مترجم حمائل
ترجمہ و تفسیر:۔ موضح القرآن۔ آٹھ روپے۔

(مکتبہ تجلّی دیوبند (یو۔پی))

شاہ ولی اللہؒ کی چند کتابیں

کتاب	پیسہ	روپیہ
حجۃ اللہ البالغہ۔ اردو مع عربی در دو جلد مجلّد	-	۲۴
ازالۃ الخفاء۔ اردو در دو جلد مجلّد	-	۲۴
اختلافی مسائل میں اعتدال کی راہ اردو	۷۵	۱
بلاغ المبین (بمعہ سوانح) شاہ ولی اللہؒ	-	۴
خیر کثیر اردو مجلد	-	۶
فیوض الحرمین۔ اردو مع عربی مجلد	۵۰	۴
شریعت اور تصوف اردو غیر مجلد	۵۰	-
سیرت رسولؐ "	۷۵	۱
تحفۃ الموحدین (رد بدعت میں)	۴۰	-

تصانیف مولانا منظور نعمانی

کتاب	پیسہ	روپیہ
معارف الحدیث۔ اردو مع عربی۔ حصہ اول مجلّد	-	۵
" " " حصہ دوم "	۵۰	۵
" " " حصہ سوم "	-	۸
تذکرہ مجدد الف ثانیؒ "	-	۴
قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟ "	-	۴
دین و شریعت "	-	۳
اسلام کیا ہے؟ "	-	۲
" " غیر مجلد	۷۵	۱
آپ حج کیسے کریں؟ مجلد	-	۲
نماز کی حقیقت غیر مجلّد	-	۱
اسمٰعیل شہیدؒ اور معاندین اہل بدعت کے الزامات غیر مجلّد	۷۵	-
برکات رمضان "	۷۵	-
آسان حج (پاکٹ سائز) "	۵۰	-
کلمہ طیبہ کی حقیقت	۳۷	-

مولانا ابوالکلام آزادؒ کی کتابیں

کتاب	پیسہ	روپیہ
تبرکات آزاد	-	۶
آزاد کی تقریریں	۵۰	۵
غبار خاطر	-	۵
مضامین الہلال	۷۵	۳
مضامین البلاغ	۷۵	۳
طنزیات آزاد	-	۳
قول فیصل	۵۰	۲
مسلمان عورت	-	۴
صدائے حق	۲۵	۲
مضامین آزاد	-	۲
مقالات آزاد	-	۲
شہید اعظم	۵۰	۱

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتابیں

کتاب	پیسہ	روپیہ
تاریخ دعوت و عزیمت۔ جلد اول مجلّد	-	۸
" " " جلد دوم	-	۸
" " " جلد سوم	-	۶
اسلام اور مغربیت کی کشمکش "	-	۵
انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر "	۵۰	۴
مکاتیب مولانا الیاس	۵۰	۱

تصانیف مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ

کتاب	پیسہ	روپیہ
تفسیر حقانی۔ علیحدہ علیحدہ پاروں میں مکمل مجلد در چار جلد	-	۶۰
البیان فی علوم القرآن غیر مجلد -/۶ ۔ مجلد	۰۰	۷
عقائد اسلام مجلّد	-	۴

تصانیف جناب سلام اللہ صدیقی

کتاب	پیسہ	روپیہ
تاجدار مدینہؐ کی شہزادیاںؓ غیر مجلّد	-	۱
حضرت عائشہ صدیقہؓ	۸۸	-
حضرت معاویہؓ بن ابی سفیانؓ مجلّد	۵۰	۱
حضرت عمرو بن العاصؓ (فاتح مصر) "	۵۰	۲
رسومات محرّم و تعزیہ غیر مجلّد	۲۵	-

برہان کا اداریہ

نظرات

جو علما مس فاطمہ جناح کی حمایت کر رہے ہیں اب انھوں نے کہنا شروع کیا ہے کہ عام حالات میں تو عورت بے شک کسی اسلامی مملکت کی سربراہ نہیں ہو سکتی، لیکن اس وقت جب کہ اسلام کو خطرہ ہو اور ایک عورت کے ذریعہ اسے بچایا جا سکتا ہو تو اب عورت کو سربراہ مملکت بنانا جائز ہے۔ گذارش یہ ہے کہ یہ صورت امر جنبی کی ہے اور امر جنبی کی حالت میں عورت کو سربراہ بنانا ہی نہیں بلکہ اور بھی بعض شرعی ممنوعات مثلاً اعضائے ستر کا کشف، شراب کا استعمال، اکل خنزیر وغیرہ سب چیزیں جائز ہو جاتی ہیں اور جائز نہیں بلکہ بعض اوقات واجب اور فرض ہو جاتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا پاکستان میں یہ امر جنبی پیدا ہو گئی ہے؟ اگر درحقیقت موجودہ حکومت نے جیسا کہ بڑے زور شور سے کہا جا رہا ہے اسلام کو تباہ و برباد کر کے رکھدیا اور گویا کمال اتاترک کی روح نے صدر ایوب خاں کے روپ میں دوبارہ جنم لیا ہے تو یقیناً پاکستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے دل میں اس کا درد اور صدر ایوب کے خلاف سخت غم و غصہ اور نفرت و بیزاری کا جذبہ ہونا چاہیئے اور اب ہونا یہ چاہیئے تھا کہ ایک عمر رسیدہ خاتون جس نے اپنی زندگی میں اسلام کے ساتھ وابستگی اور اس کی روایات کے احترام کی کوئی شاندار مثال کبھی قائم نہیں کی اس کا سہارا لینے کے بجائے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو صدارت کے لئے کھڑا کیا جاتا جو ملک میں اسلام کے سب سے بڑے چیمپین اور اس کے داعی ہیں، اچھا مولانا نہ سہی! اتنے بڑے ملک میں ایک مرد بھی ایسا نہیں جو صدر ایوب خاں ایسے اسلام شکن کے مقابلہ میں آ سکتا، حالانکہ جب معاملہ اس درجہ سنگین اور سخت تھا اور ملک کے مسلمانوں کی اکثریت اسلام کی حمایت کے جذبہ سے موصوف سے اسقدر بیزار اور نفور تھی تو ایک مولانا مودودی کیا ایک معمولی حیثیت کا مسلمان بھی انھیں آسانی سے شکست دے سکتا تھا، لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو اب اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ یا تو سرے سے یہ کہنا ہی غلط ہے کہ وہاں اسلام کو خطرہ ہے اور یا اگر واقعی خطرہ ہے تو اس ملک کے مسلمانوں کی اکثریت اسلام کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں رکھتی اور صدر ایوب خاں کی اسلام شکن حرکات و اقدامات کا انھیں کوئی رنج اور صدمہ نہیں ہے۔ یہ دوسری بات حد درجہ بعید از قیاس ہے اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام کو خطرہ ہرگز نہیں ہے اور اس بنا پر یہ کہنا کہ امر جنبی کی صورت پیدا ہو گئی ہے بالکل غلط ہے، بلکہ اصلی اور سچی بات یہ ہے کہ صدر ایوب خاں نے جن جماعتوں، پارٹیوں اور جن افراد و اشخاص کو ناراض کر کے ملک میں استحکام پیدا کیا اور اسے آگے بڑھایا ہے انھوں نے موجودہ حکومت سے گلو خلاصی کے لئے قائد اعظم کی بہن کا سہارا لیا ہے۔

محترمہ فاطمہ جناح کی جو تقریریں اور بیانات ہماری نظر سے گذرے ہیں اُن میں موصوفہ نے کہیں اسلام کا نام نہیں لیا اور کہا تو بس یہ کہ "پاکستان میں جمہوریت کو پامال کر دیا گیا ہے اور وہ اس کو ہی بحال کرنے کی غرض سے میدان میں اُتری ہیں"۔

اور لطف یہ ہے کہ اُن کے حامی علماء نے بھی موصوفہ کے سر سے سر ملا کر وہی ایک راگ الاپنا شروع کر دیا ہے حالانکہ سچی اور صاف بات یہ ہے کہ اسلام بے شبہ حقوقِ انسانی میں مساوات اور عوامی فلاح و بہبود کا سب سے بڑا حامی اور علمبردار ہے لیکن چونکہ وہ جذبات اور نعروں کا کبھی شکار نہیں ہوتا اور ہر چیز کو حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھتا اور جانچتا ہے اس لئے جہاں تک حکومت اور ملک کے نظم و نسق کا تعلق ہے اس میں وہ عالم اور عامی کے درمیان فرق کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ہے:۔ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ اس لئے جب تک پورا معاشرہ علم کی دولت سے مالامال ہو کر اپنے ملکی اور قومی مسائل پر سنجیدگی اور ایمانداری سے غور کرنے کے قابل نہیں بن جاتا۔ اسلام ہر شخص کو حکومت کے معاملات میں دخل دینے اور اسکو بنانے بگاڑنے کا حق نہیں دے سکتا۔ قطع نظر اس سے کہ ووٹ دینے والے کس قسم کے لوگ ہیں۔ محض ووٹوں کی اکثریت پر کسی فیصلہ کا دارومدار رکھنا اسلام کے فلسفۂ سیاسیات میں معاشرہ کے ساتھ انصاف نہیں نا انصافی ہے اور ایک ماہرِ فن ڈاکٹر اور عطائی کو ایک ہی درجہ میں رکھنے کے برابر ہے۔ جس کا نتیجہ مریض کی ہلاکت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس بناء پر سخت حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ علماء کا ایک طبقہ بھی وقت کے ان چلتے ہوئے نعروں کے فریب کا شکار ہو گیا، جن کا عنوان اگرچہ بڑا دل کش ہے لیکن اس کا کامیاب عملی تجربہ عہدِ حاضر میں برطانیہ کے سوا اور کسی ملک میں اب تک نہیں ہو سکا ہے اور وہاں بھی اُس کی کامیابی کی وجہ عوام کا تعلیم یافتہ اور اپنے مسائل و معاملات سے باخبر و باشعور ہونا ہے۔ اسی لئے اسلام پہلے عوام کی تعلیم و تربیت کرتا ہے اور پھر اُن کے حالات کے مناسب حکومت کی تشکیل کرتا ہے۔ جمہوریت اُس کا مقصد نہیں، محض ایک ذریعہ ہے۔ اصل مقصد عوام کی فلاح و بہبود ہے اور ظاہر ہے حالات کے بدلنے سے حصولِ مقصد کے ذرائع بھی بدل جاتے ہیں، کس درجہ عبرت اور افسوس کا مقام ہے کہ جو شاندار اور مفید تحریک حکومتِ الٰہیہ کے نام سے شروع ہوئی اور بعد میں اس حکومتِ الٰہیہ نے "اسلامی حکومت" اور "اسلامی جمہوریت" کا چولا بدلا۔ اب اس تحریک کا بانی اور موسس صرف جمہوریت کا سب سے بڑا منادی و حامی بنا ہوا ہے۔ تاریخ میں اسی طرح کی کتنی عظیم الشان مذہبی تحریکیں اُٹھیں اور انھوں نے شاندار خدمات دین کی انجام بھی دیں، لیکن آخر وقت کی سیاست کے دلدل میں ایسی پھنسیں کہ پھر انھیں پنپنا نصیب نہیں ہو سکا۔ فآها ثم آها!!

تجلّی

اس اداریئے کی پہلی ہی سطر ایک ایسے الزام سے شروع ہوتی ہے جو محترم معترض کی طباعی اور خیال آرائی کے سوا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ وہ اپنے پڑھنے والوں کو ابتدا ہی میں یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ جس موقف کو وہ نقد کی کسوٹی پر کس کر کھوٹا ثابت کرنے چلے ہیں اس کے حاملین کا کوئی کیرکٹر نہیں، کوئی مربوط فکر نہیں، کوئی اصول و ضابطہ نہیں۔ وہ کل کچھ کہہ رہے تھے اور آج انھوں نے کچھ اور کہنا شروع کر دیا ہے۔

قارئین کے ذہنوں میں کسی بھی فریق بحث کے بارے میں اگر ابتداءً ہی بدگمانی اور تعصب کی تخم ریزی ہو جائے تو کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کی قوتِ فیصلہ بے لاگ اور منصفانہ نتائج تک پہنچ سکے گی۔ اپنی بات منوانے کی یہ ٹکنک شاطرانہ ضرور ہے، لیکن حق پسندانہ نہیں کہی جا سکتی۔ اگر محترم اداریہ نگار نے یوں کہا ہوتا کہ:۔

"ایک بلت مس فاطمہ جناح کی حمایت کرنے والے علماء یہ کہتے ہیں۔"

تب تو کوئی مغالطہ پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن یہ لفاظ کہ

"اب انھوں نے یہ کہنا شروع کیا ہے۔"

صریح مغالطہ انگیز ہیں۔ ہم پورے وثوق و اعتماد

کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ فاطمہ جناح کی حمایت کرنے والے قابلِ ذکر علماء نے پہلے دن سے آج کے دن تک کوئی تضاد بیانی نہیں کی۔ اپنی کسی بات کو نہیں پلٹا اور جن فکری بنیادوں پر انھوں نے حمایت کی تھی وہ شروع سے اب تک جوں کی توں ہیں۔ یہ توقع تو ہمیں نہیں کہ ممدوح نے جان بوجھ کر افترا کیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انھوں نے زیر بحث مسئلہ پر علماء مذکور کے تمام فرمودات کا مطالعہ کئے بغیر قلم اُٹھالیا ہے اور بہت سا وہ مواد ان کی نظر سے اوجھل رہا ہے جو ان فرمودات کو مربوط و منظم شکل میں پیش کر سکتا تھا۔ زنجیر کو زنجیر اس کی کڑیوں کا اتصال وارتباط ہی بناتا ہے۔ آپ درمیان کی کوئی کڑی ہٹادیں حلقے بکھر جائیں گے۔ اسی طرح کئی مہینوں کی مختلف ساعتوں میں فاطمہ جناح کے حامی علماء جو کچھ کہتے رہے ہیں اس کا غیر مربوط مطالعہ کیا جائے اور سابق ولاحق کی منطقی ترتیب و تدریج کو نظر انداز کر دیا جائے تو بے شک ناواقفوں کو یہ یقین دلایا جا سکتا ہے کہ یہ علماء انتشارِ فکر کا شکار ہیں اور آئے دن اپنی باتیں بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن بصیرت اور ارادۂ انصاف کے ساتھ تمام فرمودات کو ان کے سیاق و سباق اور پس منظر کے ساتھ دیکھا جائے تو اس کے سوا کچھ نظر نہ آئے گا کہ ہر آنے والے دن میں ان علماء نے جو کچھ کہا وہ اسی اجمال کی تفصیل اور اسی متن کی شرح تھی جسے انھوں نے گذرے ہوئے کل میں پیش کیا تھا۔ تفصیل اور شرح اگر متن سے مختلف شے کا نام نہیں تو اداریے کی پہلی ہی سطر میں کئے گئے ریمارک کو اس کے سوا کیا کہیں گے کہ صاحبِ اداریہ نے قصداً یا سہواً فریق ثانی کی غلط تصویر پیش کی ہے۔

غنیمت ہے اس اداریہ میں ممدوح نے یہ تو مانا کہ ایمرجنسی کی حالت میں عورت کو سربراہ بنانے کے جواز سے وہ بھی متفق ہیں ورنہ ان کے جس اداریئے پر ہم نے دسمبر ۶۴ء کے تجلی میں اظہارِ رائے کیا تھا اس میں تو انھوں نے سرے سے یہی ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ کوئی ناجائز شے کسی ضرورت کی بناء پر جائز بھی قرار پا سکتی ہے۔ گستاخی معاف ہو۔ فکری انتشار اور پراگندہ بیانی کا جو الزام انھوں نے علماء پر عائد کرنا چاہا ہے وہ حقیقتاً خود ان پر زیادہ عمدگی اور صحت کے ساتھ عائد کیا جا سکتا ہے۔ جس کا جی چاہے ان کا مذکرہ اور پیش نظر اداریہ تقابلی طور پر پڑھ کر دیکھ لے اسے ایک سے زیادہ تضاد نظر آئیں گے اور یہ بھی نظر آئے گا کہ فاطمہ جناح کی حمایت کرنے والوں سے اختلاف کا آغاز انھوں نے کسی مربوط اور ٹھوس فکر کی بنیاد پر نہیں کیا تھا بلکہ دفعتاً کسی ہنگامی تحریک کے نتیجے میں کر دیا تھا۔ یہ کوئی نادر اور انہونی بات نہیں بارہا ایسا ہوتا ہے کہ ہم پہلی ہی نظر میں کسی شے کو پسند یا ناپسند کرنے لگتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ ہم نے گہرے فکر و تدبّر کے بعد اس کی پسندیدہ یا ناپسندیدہ حیثیت کا سراغ لگایا ہے بلکہ فقط "موڈ" یا افتادِ طبع یا تحت الشعور کے کسی غیر محسوس عمل کی بناء پر یہ فیصلہ صادر ہو جاتا ہے اور ابتداءً اس کی حیثیت کسی واضح فیصلے کی بھی نہیں ہوتی بلکہ یہ محض ایک رجحان و میلان ہوتا ہے۔ مگر بعد میں ہم اسے نکھارتے ہیں، دلائل و شواہد سے اس کا سنگار کرتے ہیں اور اگر اس کے بارے میں بحث چھڑ جائے تو ایسا جوش و خروش ظاہر کرتے ہیں جیسے گہرے تدبّر اور مکمل جائزے کے بعد ہی ہم نے رائے قائم کی تھی۔ انسانی نفسیات میں انا اور خود پسندی کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔ وہ ابتداءً چاہے بلا دلیل ہی کسی شے کو پسند یا ناپسند کر بیٹھا ہو لیکن پھر وہ ایڑی چوٹی کا زور یہ ثابت کرنے میں لگا دیتا ہے کہ اس کا رجحان و میلان اور ذوقِ انتخاب ہی فی الحقیقت حرفِ آخر ہے۔ معقول ترین ہے عقل و منطق سے مربوط ہے۔ خدا سوءِ ظن سے بچائے ہم تو ممدوح کے دونوں اداریئے پڑھ کر اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ عورت کی سربراہی کے مسئلے میں ابتداءً ان کا قلم کسی منضبط اور گہرے تدبر کے نتیجے میں نہیں خیال کی کسی وقتی لہر اور تخیّل کی کسی الھڑ سی موج کے نتیجے میں اٹھا۔ پھر جب بات آگے بڑھی اور متعدد اہلِ علم نے ان کے خیالات کا رد کیا تو اب وہ اس کوشش میں ہیں کہ جس طرح بھی ہو اپنے موقف کو ایک سوچا سمجھا موقف ثابت کر

دکھائیں اور جتنے دلائل مہیا ہو سکیں صفحۂ قرطاس پر پھیلادیں۔

تاہم اپنے کسی بھی نفسیاتی مطالعے کی صحت واصابت پر اصرار کئے بغیر ہم جائزہ لیتے ہیں کہ ان کے دلائل کا وزن کیا ہے اور مسئلہ کو اس کی حقیقی اہمیت و حیثیت کی سطح پر زیر بحث لانے میں وہ کس حد تک سنجیدہ ہیں۔

خوب سمجھ لیجئے۔ اس وقت بحث ان مولانا اصلاحی سے نہیں جو دنیا بھر کے فقہاء اور مجتہدین کے اصول و قواعد کو دیوار پر مارتے ہوئے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ شریعت کا کوئی حرام کبھی حلال ہوتا ہی نہیں۔ بلکہ اُن مولانا اکبر آبادی سے ہے جنھوں نے یہ مان لیا ہے کہ ہنگامی حالات میں شریعت کے بعض حرام حلال ہو سکتے ہیں اور عورت کی سربراہی بھی ایسا ہی "حرام" ہے۔ البتہ ان کا خیال ہے کہ پاکستان میں ایسی ایمر جنسی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ عورت کی سربراہی کا جواز تسلیم کر لیا جاتا۔ گویا گفتگو کسی اصول میں نہیں۔ اصول کے انطباق اور حالات کی تشخیص میں ہے۔ طے یہ کرنا ہے کہ آیا پاکستانی حالات اس درجے میں پہنچ گئے تھے یا نہیں کہ شریعت کے متفق علیہ اصولِ استثناء سے فائدہ اٹھا لیا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ یہ مسئلہ فقط اجتہاد اور اپنی اپنی صوابدید کا رہ گیا۔ لہٰذا اعتراض و واویلا کے وہ تمام بم اور گولے تو ہوا میں تحلیل ہو گئے جن کا مقصود مولانا مودودی، مولانا اشرف علیؒ اور مولانا مفتی محمد شفیع جیسے حضرات کی دینی شخصیت کو پارہ پارہ کرنا تھا۔ بات صرف اتنی رہ گئی کہ مولانا مودودی، مولانا محمد شفیع اور ان کے ہم رائے دیگر زندہ علماء نے پاکستانی حالات کے باب میں جو اندازہ کیا وہ اجتہادی اعتبار سے درست تھا یا نادرست۔

اب ہم عرض کرتے ہیں کہ اوّل تو یہی بات یکسر غلط اور طبع زاد ہے جسے ایک طے شدہ امر مان کر مولانا اکبر آبادی گفتگو شروع کر رہے ہیں کہ عورت کی سلطنت شرعاً حرام ہے!۔ تین ماہ سے ہم گوناگوں دلائل پیش کرتے آرہے ہیں۔ اسی شمارے میں آپ ملاحظہ فرمائیں "زندگی" کے رسائل و مسائل نقل ہوئے ہیں۔ ان میں فقہ حنفی کی مشہور کتاب بحر الرائق سے جلد اور صفحے کے حوالے کے ساتھ ابن نجیم کا فتویٰ مذکور ہے جس کے صریح الفاظ یہ ہیں۔ واما سلطنتها فصحيحة (رہی عورت کی سلطنت تو وہ شرعاً صحیح ہے) اسی کے ساتھ ابن نجیم نے تاریخی مثال بھی پیش کر دی ہے۔ جو لوگ قرآن وسنّت اور عقل و منطق کے دلائل سے زیادہ اپنے امام کی فقہ کا حوالہ ضروری سمجھتے ہیں انھیں بھی اب اپنی زبانیں بند کر لینی چاہئیں یہ بہر حال مسلم ہے کہ نارمل حالات میں عورت کا حاکم بننا اگرچہ مادّی سطح پر خوش آئند اور نیک فال نہیں کہا جا سکتا لیکن شرعاً وہ حرام و باطل نہیں ہے لہٰذا وہ ساری گفتگو ہی مہمل ہے جو اس مفروضے کی بنیاد پر کی گئی ہو کہ عورت کی سربراہی حرام ہے۔

چلئے اگلے مرحلے میں آتیے۔ آپ ہمیں بتائیں کہ روس یا فرانس، یا آئرلینڈ یا کسی بھی ایسے ملک کے سیاسی حالات کے تمام جلی و خفی پہلوؤں کا زیادہ بہتر اندازہ اور ادراک وہ اہلِ نظر کر سکتے ہیں جو وہیں رہ بس رہے ہوں یا وہ لوگ کر سکتے ہیں جو کبھی اس ملک میں گئے تک نہ ہوں۔ ہم اور آپ ہندوستان میں بس رہے ہیں۔ پاکستان زیادہ دور نہیں لیکن ویزا اور پاسپورٹ سسٹم نے اسے "دوسری دنیا" بنا دیا ہے۔ وہاں کے سیاسی، سماجی، ثقافتی، صنعتی، اقتصادی اور ہر قسم کے حالات کی اونچ نیچ، "اُتار چڑھاؤ"، دروبست اور تمام پہلوؤں کا غائر مطالعہ اور مبصرانہ جائزہ تو کسی ایسے شخص کے لئے بھی ممکن نہیں ہے جو پاسپورٹ بنوا کر وہاں مہینے دو مہینے قیام کر آیا ہو۔ پھر ایسے شخص کے لئے کیونکر ممکن ہو سکتا ہے جس نے کبھی ایک دن کے لئے بھی وہاں قدم بھی نہ رکھا ہو۔ ہماری معلومات یہ ہیں کہ مولانا اکبر آبادی نے کبھی ایک دن کے لئے بھی سرزمین پاکستان کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نہیں نوازا۔ فقط دور ہی دور سے کچھ اندازے اور تخمینے لگا کر اس طمطراق اور شدّ و مد سے اُن اہلِ نظر کا رد کر رہے ہیں جن کی زندگی ہی پاکستان میں گذر رہی ہے۔ جو ہر طرح کے حالات کو بہت قریب سے اور

بہت مدّت سے دیکھ رہے ہیں۔ جن کے تجربات مسلسل اور جن کا مطالعہ بالکل قریب کا مطالعہ ہے۔

سیاست اگر صرف شاعری کا فن ہوتا یا وہ محض ایک فلسفہ ہوتا جس پر دماغ سوزی کے لئے خارجی حقائق کے ادراک کی کوئی ضرورت نہ ہوتی تب تو بے شک یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی کہ کوئی شخص اپنے گھر کے کونے میں بیٹھکر دور افتادہ ملکوں کی سیاست پر مبصرانہ انداز کے فیصلے دے سکے۔ لیکن سیاست نہ شاعری ہے نہ کورا فلسفہ، نہ علم الحساب کا لگا بندھا فارمولا ہے، نہ محض خیالی منطق۔ وہ ایک ایسا فن ہے جس کا تمام تر مدار حالات و واقعات کے صحیح جائزے اور مشاہدے پر ہی ہے۔ پھر یہ کہاں کی معقولیت ہے کہ فقط چند اخبار پڑھ اور ریڈیو کی کچھ خبریں سنکر ایک شخص یہ باور کرانا چاہے کہ وہ ان تمام اہل نظر کو مات دے گیا ہے جو پیہم تجربات اور قریبی مطالعے کے بعد کوئی رائے اور اندازہ قائم کر رہے ہیں۔

بات نفس اصول کی ہوتی تو بے شک ہندوستان یا آئرلینڈ کا باشندہ بھی اس کا حقدار تھا کہ پاکستان جائے اور رہے بغیر اصولی گفتگو کر سکے۔ اصول و فنون کا تعلق عقل و دراست سے ہوتا ہے۔ علم و تفقہ سے ہوتا ہے۔ زمان و مکان اور مقامی حالات سے نہیں، لیکن یہ طے ہو چکا ہے کہ مولٰنا اکبرآبادی اصولی اختلاف نہیں فرما رہے ہیں بلکہ اختلاف ایک اصول کے انطباق میں ہے اور انطباق کی صحت اور عدم صحت کا مدار ظاہر ہے کہ حالات کے گہرے اور ہمہ جہتی مطالعے ہی پر ہو سکتا ہے ذرا اندازہ کیجئے۔ ایک شخص اگر روس اور امریکہ سے شائع ہونے والے چند اخبارات پڑھکر یہ دعویٰ کرنے لگے کہ روسی سیاست کے ہر پہلو اور وہاں کے حالات کی تمام نزاکتوں اور پیچیدگیوں کا علم و ادراک مجھے اس حد تک ہو گیا ہے کہ اب روس ہی میں بسنے والے اہل نظر اور ارباب بصیرت کا علم و مشاہدہ بھی میرے آگے گرد ہے تو اسے آپ کیا کہیں گے! خاص کر ایسے زمانے میں جب دنیا کی ہر حکومت نے بیرونی دنیا میں اپنے حسب مطلب پروپگنڈہ کرنے کا مستقل شعبہ کھول رکھا ہے' ڈپلومیسی کے تحت اپنے ملک کی ایک مخصوص تصویر پیش کرنا عین حکمت قرار پا چکا ہے چاہے یہ تصویر حقیقت سے کتنی ہی مختلف ہو' حد ہے کہ اسی ڈپلومیسی کے تحت بعض ممالک دوسرے ملکوں سے ایسے وفود بلاتے ہیں جو وہاں آکر اپنی آنکھوں سے "سب کچھ" دیکھیں اور پھر واپس جاکر ویسی ہی شہادت دیں جیسی میزبان ملک کو مطلوب تھی۔ یہ "سب کچھ" وہ ہوتا ہے جو حقیقتہً کچھ بھی نہیں ہوتا اور حالات و حقائق اس سے کہیں مختلف ہوتے ہیں جس کی نمائش ترتیب دیئے ہوئے مناظر اور نہایت چالاکی سے بنائے ہوئے پروگرام کے ذریعہ کی جاتی ہے۔

ایسے زمانے میں کوئی شخص کیونکر یہ تصور بھی کر سکتا ہے کہ ریڈیو اور اخبارات کے تھوڑے سے مطالعہ کے ذریعہ وہ اس لائق ہو گیا ہے کہ کسی دور افتادہ ملک کے پوست کندہ حالات اور سیاسی نشیب و فراز پر ماہرانہ فیصلے دے سکے۔ مولانا اکبرآبادی کی پوزیشن بحالتِ موجودہ ٹھیک اس شخص کی سی ہے جسے زندگی بھر دریا میں قدم رکھنے کا موقع نہ ملا ہو لیکن وہ طوفانی لہروں کے پیچ و تاب اور منجدھار کے خروش پر ان لوگوں کو چیلنج کرتا نظر آئے جو طوفانوں اور گردابوں میں رہ کر حقائق کا سامنا کر رہے ہیں اور سطح کے نیچے کی ہر تہہ ان کی نظر میں ہے یا پھر ان کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے ایٹم بم کی ساخت پر چند اخباری مضامین پڑھ کر یہ خوش فہمی دماغ میں بسا لی ہو کہ اب وہ ایٹم کے موضوع پر ان تمام لوگوں کو للکار سکتا ہے جو مدت سے ایٹمی ریسرچ میں دماغ سوزی اور عرق ریزی کر رہے ہیں۔

حالات تو وہ چیز ہیں کہ درمیان کی فقط ایک کڑی نظروں سے اوجھل رہ جائے تو بات کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ یہاں صورتِ حال یہ ہے کہ پاکستان کی حقیقی تصویر اور قرار واقعی حالات سے پوری واقفیت تو کجا ادھوری

واقفیت کا بھی کوئی ایسا ذریعہ موجود نہیں ہے جس پر ایک محتاط اور ذمہ دار آدمی بھروسہ کر سکے۔ بس موٹی موٹی باتیں سامنے آتی ہیں اور ان کے بارے میں بھی یہ اطمینان مشکل ہے کہ کتنا حصہ ان کا حقیقت پر مبنی ہے اور کتنا حصہ پروپگنڈے کی تکنک کا ساختہ پرداختہ ہے۔ خصوصاً جب سے وہاں پریس پر غیر معمولی پابندیاں عائد کی گئی ہیں اور بڑے بڑے اخبارات پر حکومت کا تسلّط ہو گیا ہے یہ اور بھی دشوار ہے کہ دور بیٹھ کر صحیح حالات و حقائق کا ادراک کیا جا سکے

لہٰذا یہ سوال تو دور جا پڑتا ہے کہ مولانا اکبر آبادی ہندوستان میں بیٹھ کر پاکستانی سیاست کا جو اندازہ لگا رہے ہیں وہ کس حد تک لائق اعتماد ہے۔ سب سے پہلے تو یہی سوال کھڑا ہوتا ہے کہ انھیں پاکستانی سیاست پر گفتگو کا حق بھی ہے یا نہیں۔ وہ اس پوزیشن میں ہیں بھی یا نہیں کہ اس مسئلہ میں اظہار خیال کر سکیں۔

کون نہیں جانتا کہ کسی مقدمے کے فیصلے کی صحت اور عدم صحت کا دعویٰ کرنے سے قبل یہ دیکھنا بجائے خود ایک مسئلہ ہے کہ فیصلہ دینے والے کو فیصلے دینے کا حق بھی پہنچتا ہے یا نہیں۔ کتاب قانون کے صرف چند اوراق پڑھ لینے سے تو ہر شخص قاضی یا جج نہیں بن جاتا۔ فیصلے ایسے ایسے ہی لوگوں کے لائق توجہ ہو سکتے ہیں جن کے بارے میں یہ اطمینان حاصل ہو کہ واقعات کی چھان پھٹک کے وسائل انھیں حاصل ہیں، جھوٹ اور سچ میں تمیز کرنے کا ذریعہ انھیں میسر ہے اور واقعات کی تفصیلات تک پہنچنا ان کیلئے ممکن ہے

مولانا اکبر آبادی عقل و نقل کے کسی بھی معیار سے اس پوزیشن میں نہیں کہ پاکستانی سیاست پر انکی معلومات اور فیصلوں کو کسی قدر و قیمت کا حامل سمجھا جا سکے۔ ہاں جو لوگ سیاست کی فنی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتے، جنھیں عملی حقائق اور نظریاتی منطق کا فرق معلوم نہیں، جو سطح کے نیچے دیکھنے کی استعداد نہیں رکھتے وہ بے شک داد و تحسین کے جتنے تحفے چاہیں موصوف کے فرمودات کو بخش دیں۔

اب ہم ان کی تحریر کے ایک ایک جزو کو لیکر بتاتے ہیں کہ علم و عدل کی بارگاہ میں اس کا وزن کیا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ حقائق کو جھٹلانے اور مفروضات کو حقائق باور کرانے کا اسلوب انھوں نے آغاز ہی سے اختیار فرما لیا ہے۔ یہ اسلوب چاہے قصداً اختیار کیا گیا ہو یا سہواً۔ اسکے پیچھے خواہ بدنیتی کارفرما ہو یا زاویۂ نظر کی کجی۔ اس کا علم خدا ہی کو ہے۔ ہم تو اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ان کے خوشنما الفاظ کے بطن میں معانی خوشنما نہیں ہیں۔

وہ جب طنز بھرے انداز میں فرماتے ہیں کہ:-

"اگر درحقیقت موجودہ حکومت نے جیسا کہ بڑے زور شور سے کہا جا رہا ہے اسلام کو تباہ و برباد کرکے رکھدیا اور گویا کمال اتاترک کی روح نے صدر ایوب خاں کے روپ دوبارہ جنم لیا ہے"

تو اس کا صریح مطلب یہ ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک ایوبی حکومت کے بارے میں علمائے پاکستان کا یہ مشاہدہ درست نہیں ہے کہ وہ اسلام کو تجدد اور مغربیت کی سان پر چڑھا کر معاشرے کو غیر اسلامی سانچے میں ڈھالنے کا رویّہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ یہ مطلب صرف اسی فقرے سے نہیں نکلتا بلکہ پورا اداریہ آپکے سامنے ہے۔ کیا مولانا نے یہی ثابت کرنا نہیں چاہا ہے کہ ایوبی حکومت کو اسلام کے حق میں مضرت رساں سمجھنا فقط مولویوں کی کج فکری ہے ورنہ اس کے اقدامات اور طرز طریق نہ اسلام کی تحریف کر رہے ہیں نہ ایسا کوئی اندیشہ ہے کہ وہاں "کمال ازم" نشوونما پائے۔

اب ہم ایماندار اور بیدار ذہن لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ حقائق کو جھٹلانا نہیں ہے؟ کیا اکیلے عائلی قوانین ہی ایک دستاویزی ثبوت اس بات کا نہیں ہیں کہ ایوبی حکومت کی تجدد پسندی اور قرآن و سنت والے اسلام سے دوری کس منزل میں ہے اور کیا ایوبی دور حکومت کے وہ سالانہ بجٹ دنیا کی نظر سے نہیں گذرے جن میں خطیر امداد فقط ان اداروں کو دی گئی ہے جو اسلامی ثقافت اور اسلامک ریسرچ کے پردے میں براہ راست یا بالواسطہ اسلام کو مسخ کر نہیں

ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں اور قرآن و سنت والے اسلام کی خدمت کرنے والے ادارے یا تو امداد سے بالکل محروم کس مپرسی کے عالم میں ہیں یا کسی کو نوازا گیا ہے تو بس برائے نام۔

اور کیا وہ سرکاری اعداد و شمار کوئی رائے قائم کرنے میں مدد نہیں دیتے جن سے پتہ چلتا ہے کہ شراب نوشی کو ختم کرنے کی تدریجی کوششوں کے عوض روز افزوں فروغ دیا جا رہا ہے اور باضابطہ بادہ خواری کی مقدار سال بہ سال ترقی پر ہے۔

اور کیا یہ بات کوئی راز ہے کہ ایوبی سرکار کی مستند "مجلسِ فقہاء" ابھی تک اس پر بھی متفق نہیں ہوسکی ہے کہ شراب حلال ہے یا حرام۔

اور کیا دنیا کے اسلام پسند حلقوں کی وہ حیرت کسی کے علم میں نہیں جس کا تعلق پاکستان میں عیسائیت کے فروغ سے ہے۔ باقاعدہ شائع شدہ اعداد و شمار گواہ ہیں کہ ایوبی دورِ حکومت میں عیسائیت قبول کرنے والے مسلمانوں کی تعداد پاکستان میں تمام ایشیا اور افریقہ سے بڑھ چڑھ کر رہی اور یہ سلسلہ آج بھی خاصی رفتار سے جاری ہے۔ حکومت اگر عیسائی مبلغین کو آسانیاں اور مواقع مہیا نہ کرتی تو کیونکر ممکن تھا کہ ارتداد کا یہ فتنہ یوں پر پھیلائے جاتا۔

اور کیا مولانا اکبر آبادی نے کسی بھی پاکستان سے آنے والے سے یہ معلوم نہیں کیا کہ وہاں خواتین کے چہروں سے نقاب میں ہٹنے کی رفتار کیا ہے۔ داڑھی کو عیب سمجھنے کی ذہنیت فروغ کے کن مرحلوں میں ہے۔ مادّہ پرستانہ طرزِ فکر کی زد میں دینی اور روحانی قدریں کس اوسط سے پاش پاش ہو رہی ہیں۔

پاکستان کے کسی بھی ذمہ دار عالم نے یہ تو کبھی نہیں کہا کہ صدر ایوب اور کمال اتاترک ایک ہی سطح پر ہیں۔ نہ یہ کہا کہ ایوب خاں نے اسلام کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اس طرح کے انتہا پسندانہ فقرے دل سے گھڑ کر علماء کی طرف منسوب کر دینا اور پھر ان کا رد کرنا متانت و شرافت کے شایانِ شان نہیں۔ کمال اتاترک کا نام ایک اسلام دشمن ازم کے نقطۂ عروج کا نام ہے۔ کب کس نے کہا ہے کہ ایوب خاں کے قدم اس نقطۂ عروج تک آپہنچے۔ ہاں علمائے پاکستان کا یہ تصور ضرور ہے کہ اپنی حکومت کے مجموعی طرزِ عمل اور معاشرے میں نمودار ہونے والے اس کے اثرات و نتائج کا مشاہدہ اور تجربہ کرتے ہوئے وہ یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ حکومت کمال ازم کی راہیں ہموار کر رہی ہے اور اسلام کے نام پر کافرانہ تصورِ حیات کو رواج دیا جا رہا ہے۔ یہ تصور تجدد پسند اور دنیا پرست لوگوں کی نگاہ میں گردن زدنی ہو تو ہو لیکن تعجب ہے کہ وہ محترم مولانا بھی اسے لائقِ تعزیر ہی قرار دے رہے ہیں جن کے بارے میں حسنِ ظن یہ تھا کہ اسلام اور اعیانِ اسلام کی مظلومیت اور بے بسی پر ان کا قلب کسی بھی اسلام پسند اور حق پرست کے قلب سے کم پارہ پارہ نہ ہوگا۔

افتراء اور طنز کے بعد جو استدلال ممدوح نے کیا ہے وہ بھی حیرت ناک ہی ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ اگر ایوبی حکومت کے طور طریق واقعتہً اسلام بیزاری پر مشتمل ہوتے تو عوام کے دل میں اس کے خلاف سخت غم و غصہ اور نفرت و بیزاری کا جذبہ ہونا چاہئے تھا۔

یہ استدلال منطق اور حقائق دونوں کے خلاف ہے۔ منطق کے تو یوں کہ مسلمان حکمراں تجدد اور تحریف کا کام اس احمقانہ اعلان کے ساتھ نہیں کرتے کہ ہم اسلام کو بدلنے اور مسخ کرنے چلے ہیں۔ وہ اس کام کو نہایت چالاکی اور بناؤ سنگار کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ اسلام کا وظیفہ پڑھتے ہیں۔ ظاہر فریب اصطلاحیں وضع کرتے ہیں۔ تلبیس و تدلیس کے حربے کام میں لاتے ہیں اور تدریج و ترتیب کے ساتھ من مانی تبدیلیوں کے نوک پلک درست کرتے ہیں۔ بیچارے عوام اس تکنک اور سیاست کا کیا ادراک کر سکتے ہیں۔ ان کی مثال تو ہر زمانے میں ان تنکوں کی سی رہی ہے جو حالات کی موجوں پر بہنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ ان کے محسوسات کو بیدار کرنا' ان سے کام لینا' انھیں روشنی دکھانا خواص کا کام ہوتا ہے۔ خواص ہی جانتے ہیں کہ حکومت کے کون سے اقدام و عمل کا مطلب و منشاء کیا ہے۔ وہ کن مقاصد کو کن ذرائع اور ترکیب سے حاصل

کرنا چاہتی ہے اور اس کے نعروں کے پس پردہ کیا اغراض کارفرما ہیں۔

علماءِ پاکستان نے حکومت کے نظریاتی رُخ اور اسلام کے سلسلے میں اس کی خطرناک روش کا اظہار وا علان کرنے میں کوئی دھوکا نہیں کھایا۔ البتہ یہ خطا ان کی ضرور ہے کہ اصلاحِ حال کی خاطر انھوں نے کوئی ٹھوس قدم نہیں اُٹھایا۔ ایسی کوئی اسکیم نہیں بنائی جس کے ذریعے رائے عامہ کو حکومت کی غلط روش کی مؤثر مزاحمت میں استعمال کیا جاسکے۔ انتخاب تو ایک وقتی شے تھی۔ یہ کام بہت پہلے کرنے کا تھا کہ اسلامی اقدار و تصورات کے تحفظ کی خاطر رائے عامہ کو منظم کیا جائے لیکن علماء باہمی اختلافات میں انرجی ضائع کرتے رہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ فروعی اختلاف کو ہوّا بنا کر لڑتے رہنا ان کا دیرینہ شغل رہا ہے، اور آج تو یہ اپنے شباب پر ہے۔ پھر کیسے ممکن تھا کہ حالات کے دھارے پر بہتے ہوئے عوام حکومت کی شاطرانہ روش کا پورا ادراک کر سکتے اور ان کا غم و غصہ انقلابی شکل میں ظاہر ہو سکتا۔

لیکن اتنا تو ساری دنیا دیکھ ہی چکی ہے کہ ہر طرح کے خطرات کے باوجود پاکستانی عوام کی بہت بھاری تعداد نے حزبِ مخالف کا ساتھ دیا۔ حزبِ مخالف کے جلسوں اور جلوسوں کی بے مثال کامیابیاں افسانہ نہیں ہیں آنکھوں دیکھی حقیقتیں ہیں جن کا اعتراف نہ صرف امریکہ اور برطانیہ کے پریس نے کیا ہے بلکہ خود پاکستان کے حکومتی پریس کو بھی اس کے انکار کی جرأت نہیں ہو سکی ہے۔ پھر بنیادی جمہوریتوں کے انتخاب میں جو قتل و غارت اور بے مثال دھاندلیاں ہوئیں کیا وہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت نہیں کہ ایوبی حکومت کو رائے عامہ کی کتنی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ہر ہوشمند سمجھ سکتا ہے کہ جس طرح ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات میں فساد کا محرک اقلیتی فرقہ نہیں ہو سکتا بلکہ وہ صرف مدافعت کر سکتا ہے اور مدافعت بھی اس وقت کر سکتا ہے جب جان پر بن آئے اسی طرح ایک فوجی حکومت کے انتخابات میں دھاندلی، بے ضابطگی اور زبردستی حکومت ہی کے حالی موالی کر سکتے ہیں، حزب مخالف فقط دفاع کرے گی۔ وہ بھی اس وقت جب صبر وضبط کی حدیں ختم ہو جائیں کھلی بات ہے کہ قتل و غارت تو کجا معمولی سا ہنگامہ بھی انتخابات میں نظر نہ آتا اگر حکومتی گروہ یہ توقع رکھتا کہ رائے عامہ کی اکثریت اس کے ساتھ ہے۔ اس توقع کی صورت میں دھاندلی اور بے ایمانی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جب رائے عامہ بھی گولے بارود والوں کے ساتھ ہوتی تو آخر کیسے ممکن تھا کہ طاقت سے محروم حزب مخالف جارحیت کا ارتکاب کر سکتی۔ بڑے پیمانے پر گڑبڑ اور قتل و غارت اس حقیقت کا واضح ثبوت ہیں کہ رائے عامہ حزبِ مخالف کی طرف تھی اور طاقت، وسائل اور انتظامی مشینری حزبِ حکومت کی طرف۔ تب کیا یہ کوئی نئی بات ہے کہ طاقت نے رائے عامہ کو ہرا دیا اور جمہور کو ڈنڈے کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اس تفصیل سے عیاں ہے کہ مولنٰا کا یہ کہنا واقعاتی طور پر بھی غلط ہے کہ عوام کے دلوں میں ایوب خاں کے خلاف غم و غصہ اور بیزاری کا جذبہ نہیں تھا۔

رہا یہ کہنا کہ عوام ایسے ہی اسلام پسند تھے تو مولنٰا مودودی کو صدارت کے لئے کھڑا کیا جاتا تو ہم ندامت کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ خفتہ دماغی کا برا نمونہ ہے۔ کیا ممدوح اس قدر جلد بھول گئے کہ جس وقت صدارتی امیدواروں کی نامزدگی ہو رہی تھی مولنٰا مودودی اپنے رفقاء سمیت جیل میں تھے اور ان کی پارٹی خلاف قانون قرار دی جا چکی تھی۔ بات وہ کہئے جو دو قدم چل بھی سکے۔ یہ واقعات و مشاہدات کو یکسر نظر انداز کر کے گفتگو کرنا آپ جیسے متین حضرات کی نیکنامی پر بدنما داغ سے کم نہیں۔ جس کا جی چاہے ماضی قریب کے اخبارات اُٹھا کر دیکھ لے مولنٰا مودودی کی رہائی کا مرحلہ تو بعد میں آیا ہے۔ اس سے قبل ہی حزبِ مخالف فاطمہ جناح کو چن چکی تھی۔ پھر کیا

شک رہجاتا ہے ہمارے اس خیال کی صداقت میں کہ محترم مولانا حقائق سے منھ موڑ کر بات کر رہے ہیں۔

پھر یہ بھی سُن لیجئے کہ اگر مولانا مودودی آزاد ہوتے اور ان کی پارٹی بھی خلاف قانون نہ قرار دی گئی ہوتی تب بھی ان کا صدارتی مقابلے میں بطور اُمیدوار کھڑا ہونا اتنا غیر معقول اور بد نما فعل ہوتا کہ سیاسی، دینی اور فکری کسی بھی نقطۂ نظر سے اس کی تحسین نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس مظلوم انسان پر تو بلا دلیل اور بغیر کسی بنیاد ہی کے چاروں طرف سے اقتدار پرستی اور جاہ طلبی کے اتہامات آئے دن لگائے جاتے رہتے ہیں۔ اگر کہیں وہ صدارت کے لئے بھی کھڑا ہوجاتا تو کونسی کسر تھی جسے معاندین اُٹھا رکھتے۔

علاوہ ازیں وہ داعیِ اسلام اور مولانا اکبر آبادی کے طنزیہ الفاظ میں "اسلام کے چیمپین" بے شک ہیں لیکن کیا محترم طنّاز اس تاریخی حقیقت سے بے خبر ہیں کہ وقت کے ہر داعیِ حق اور مجدد کے خلاف خود مسلمانوں ہی کے مختلف فرقوں اور گروہوں نے بدترین مخالفت اور شدید ترعناد کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ کیا موصوف کو نہیں معلوم کہ ملّت کے اسلام پسند حلقوں ہی میں مولانا مودودی کی شخصیت کیسی کیسی عداوت اور بیزاری کی ہدف ہے۔

پھر اس باب میں مولانا مودودی ہی کی تخصیص نہیں۔ آپ حضرت اسماعیل شہیدؒ، مولانا اشرف علیؒ، مولانا گنگوہیؒ وغیرہم کی مثالیں سامنے رکھیں۔ یہ حضرات مسلمہ طور پر اسلام کے "چیمپین" تھے۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کا کتنا بڑا حصّہ ان سے علی الاعلان بیزاری کا اظہار کرتا اور انھیں بُرا بھلا کہتا ہے حالانکہ یہ مخالفین خود بھی اسلام پسند ہی ہیں پھر بھی ان کی مخالفت اس درجہ کی رہی کہ اگر مذکورہ بزرگوں میں سے کوئی کسی منصب جلیلہ کے لئے انتخابی جنگ لڑتا تو ان مخالفین کا ایک ووٹ بھی اسے نہ ملتا۔

مولانا مودودی کی مخالفت کا دائرہ تو بڑا وسیع ہے۔ اہلِ بدعت کے غول تو ٹھیک ان وجوہ کی بناء پر ان سے دشمنی رکھتے ہیں جن وجوہ سے وہ علمائے دیوبند اور علمائے اہلِ حدیث کو گالیاں دیتے ہیں۔ قادیانی اور منکرین حدیث بھی ان کے دشمن ہیں۔ مغرب زدوں کو بھی ان سے بَیر ہے، بہت سے اہلِ حدیث اور شیعہ صاحبان بھی ان سے خوش نہیں۔ ایوبی حکومت بھی ان سے جس درجہ پرخاش رکھتی ہے وہ راز نہیں۔

یہاں ہم ان مخالفتوں کے اسباب و علل پر گفتگو نہیں کریں گے۔ یہ الگ موضوع ہے۔ دیکھنا تو فقط اتنا ہے کہ موجودہ صورتِ حال کیا ہے۔ موجودہ صورتِ حال جب صاف طور پر یہ ہو کہ پاکستانی عوام کی بنیادی اسلام پسندی کے باوجود مولانا مودودی کے حق میں فضا سازگار نہ ہو تو کسی بھی نکتہ سنج کا یہ مشورہ دینا کہ وہ صدارت کے مقابلے میں کھڑے ہوجاتے اس بات کی دلیل ہے کہ سیاسی بصیرت اسے میسر نہیں۔ سیاست میں واقعات سے باخبری اور حقائق کا احساس و ادراک ہی بنیادی پتھر ہے۔ حقائق چاہے کتنے ہی تلخ ہوں لیکن سیاست داں ان سے صرفِ نظر نہیں کرتا انھیں تسلیم کرتے ہوئے فکر و عمل کی راہیں نکالتا ہے۔ اسلام پسند حلقوں میں مولانا مودودی کی مخالفت کیوں ہے۔ مخالفت میں کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ کسے ظالم کہیں اور کسے مظلوم۔ ان سوالات پر تو اختلاف ہوسکتا ہے لیکن اس امرِ واقعہ کی موجودگی میں دو رائے کی گنجائش نہیں کہ مولانا مودودی کی شخصیت شدید مخالفتوں کا نشانہ ہے لہٰذا سیاست کا کوئی طالب علم یہ کچی بات منھ سے نہیں نکال سکتا کہ انھیں صدارت کا امیدوار بن کر کھڑا ہوجانا چاہیئے تھا۔

اور بہ سبیلِ تنزل یہ کہنا کہ:-

"مولانا نہ سہی! اتنے بڑے ملک میں ایک مرد بھی ایسا نہ ملا جو صدر ایوب خاں ایسے اسلام شکن کے مقابلے میں آسکتا۔"

اس بات کا ثبوت ہے کہ مولانا اونچی سطح کے دقیق مسائل کو پرائمری سطح پر رکھ کر سوچ رہے ہیں اور سیاست کی گتھیوں کو انھوں نے جمع تفریق کے سیدھے سادے سوالوں

قیاس کرلیا ہے۔ ہم نہایت ادب سے عرض کریں گے کہ سیاست کے کسی ذہین طالب علم سے پوچھئے وہ آپ کو بتائے گا کہ ملک میں ایک دو نہیں ہزار ایسے افراد موجود ہوں جن کی صالحیت، بلند کرداری، ایمان و دیانت اور علم و فہم پر بھروسہ کیا جاسکتا ہو مگر ان کی موجودگی ہی اس بات کی ضمانت نہیں کہ پارٹی پالٹیکس میں بھی انھیں کامیابی سے استعمال کیا جاسکے گا اور عوام انکی سیادت و قیادت کو بہ دل و جان قبول کرلیں گے۔ خاص کر ایسے زمانے میں جب کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئی کے مطابق فضا ایسی بنتی جارہی ہے کہ چرب زبانی کرنیوالے کذاب سچے شمار ہوتے ہیں اور سیدھے سادے راست بازوں کو احمق سمجھا جاتا ہے۔ خائن و غاصب امین خیال کئے جاتے ہیں اور امانت داروں پر طرح طرح الزامات لگتے ہیں۔ جہلاء فقاہت کی مسند پر قابض ہیں اور فقیہوں کو نادان اور رجعت پسند ٹھیرا کر طاقِ نسیاں میں بٹھایا جارہا ہے۔ پروپیگنڈوں کے جھکڑ چل رہے ہیں دروغ و دغا کو ڈپلومیسی کا مرعوب کن نام دے دیا گیا ہے، صریح غلط بیانی اور دجل و فریب حکمت و سیاست کہلاتے ہیں ایسے زمانے میں یہ تصور کیا ہی نہیں جاسکتا کہ عوام الناس آسانی کے ساتھ حقائق کا ادراک کرسکیں گے اور صداقتیں سہولت کے ساتھ کذب و فریب کو ہزیمت دے سکیں گی۔

ایک اپنے ہی گھر کی مثال سے بات سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ پاکستان اسلام کے نعروں پر بنا ہے۔ یاد ہوگا مسلم لیگی فکر کا مرکزی شوشہ یہی تو تھا کہ مشترکہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمان مامون و محفوظ نہیں انھیں اپنی بقا اور ارتقاء کے لئے ایک الگ مملکت چاہیئے تاکہ اسلامی تصورِ حیات کو فروغ دیا جاسکے اس شوشے کی مخالفت کرنے والے مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا حفظ الرحمٰنؒ جیسے "اسلام کے چیمپین" تھے اور خود مولانا اکبر آبادی بھی مخالفین ہی کی صف میں شامل رہے۔ ان حضرات کا دعویٰ تھا کہ یہ طرزِ فکر تباہ کن ہے۔ غیر اسلامی ہے۔ فریب ہے۔ اپنے دعوے کو اسلام پسند عوام کے دماغوں میں اُتارنے کی جدوجہد بھی انھوں کم نہیں کی، لیکن انجام کیا ہوا ـــــ چیمپینوں کی شکستِ فاش اور اُس محمد علی جناح کی جیت جو نہ اسلام کا چیمپین تھا نہ صاحبِ جُبّہ و دستار، نہ شیخ تھا نہ صوفی۔ ایک کھلا دنیا دار انسان تھا اور اس کے باوجود "اسلام پسند" مسلمانوں کی اکثریت نے اسلامی چیمپینوں کو چھوڑ کر اس کا ساتھ دیا اور پاکستان بن گیا۔

فرمائیے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے ـــ کیا یہ صاف مثال اس بات کی نہیں کہ عوام، اسلام پسند ہونے کے باوجود ہمیشہ اسلامی چیمپینوں ہی کے پیچھے نہیں چلتے بلکہ کسی ایک نعرے کا بھرپور نشہ انھیں کہیں اور بھی لے جاتا ہے۔ مسلم لیگی مسلمان قبلِ تقسیم کے جنرل الیکشن کے وقت بھی اور آج بھی اس صداقت کے ہرگز منکر نہیں ہیں کہ مولانا حسین احمدؒ اور کانگریس کے مؤید دیگر معروف علماء زہد و عبادت، صالحیت و تقویٰ، دینداری اور اسلام پسندی میں بحیثیت ایک فرد کے مسٹر محمد علی جناح سے ارفع و اعلیٰ تھے، ممتاز تھے، مگر اس علم و اعتراف کے باوجود وہ مقبولیتِ عامہ کا تاج محمد علی جناح کے سر پر رکھ گئے۔

اسی طرح کسی بھی پاکستانی "چیمپین" اور شیخ الاسلام کے لئے سیاسی سطح پر اس توقع کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ پاکستانی عوام فقط اپنی اسلام پسندی کے تحت اس کے سر پر وہ تاجِ مقبولیت رکھدیں گے جو وہ فاطمہ جناح کے سر پر رکھ سکتے ہیں۔

افسوس جو منطق مولانا نے استعمال فرمائی ہے اسکی رو سے تو دنیا کے کسی بھی مسلمان ملک میں وہاں کے مسلمان حکمرانوں کی کوئی بد سے بدتر اسلام دشمن پالیسی اور کافرانہ آئین سازی بھی خلاف اسلام نہیں پا سکتی کیونکہ وہ قاعدہ کلیہ یہ قائم کررہے ہیں کہ اگر مسلمان حکمراں اسلام دشمنی کریں گے تو مسلم عوام لازماً ان سے بری طرح

بیزار ہوں گے اور جب عوام بیزار ہوں گے تو کوئی بھی معمولی سا آدمی یا پارٹی چٹکی بجاتے اس حکومت کو ختم کر کے اپنی حکومت قائم کر لے گی۔ لہٰذا حکمرانوں کو اگر شکست نہیں دی گئی تو ثابت ہو گیا کہ ان کے افکار و اعمال اسلام دوستی پر مبنی ہیں!۔

یہ قاعدہ کلیہ جہاں واقعات کی روشنی میں مضحکہ خیز ہے وہیں اس المناک ذہنیت کا بھی آئینہ دار ہے کہ مولانا جیت ہار اور غلبہ و قوت کو حق و باطل کی کسوٹی قرار دے رہے ہیں۔ ان کی دراست کے اعتبار سے تو مصر، انڈونیشیا، الجزائر کسی بھی مسلمان مملکت کے بارے میں یہ کہنے کی ہمت کسی کو ہو ہی نہیں سکتی کہ وہاں کے حکمراں کا کوئی فعل و عمل اسلام دشمنی پر بھی مبنی ہے!

خیر۔ فکر و نظر کی غلطی تو کوئی نادر بات نہیں۔ ہم دوسروں کے فکر و نظر کی غلطیاں چھانٹتے ہیں کیا بعید ہے کہ خود ہمارے فکر و فہم بھی وقتاً فوقتاً غلط راہوں پر نکل جاتے ہوں۔ لیکن سوءِ ظن کی بھیانک شکلوں سے خدا بچائے۔ اندازہ فرمائیے جب مولانا یہ کہتے ہیں کہ:۔

"اصلی اور سچی بات یہ ہے کہ صدر ایوب خاں نے جن جماعتوں، پارٹیوں اور جن افراد و عناصر کو ناراض کر کے ملک میں استحکام پیدا کیا اور اسے آگے بڑھایا ہے انھوں نے موجودہ حکومت سے گلو خلاصی کے لئے قائدِ اعظم کی بہن کا سہارا لیا ہے۔"

تو آخرت کی جوابدہی سے کتنی لاپروائی اور بے نیازی کا مظاہرہ فرماتے ہیں۔ گویا وہ تمام لوگ جنھوں نے فاطمہ جناح کی حمایت کی صرف کج فکر ہی نہیں ہیں بلکہ بلا استثناء خود غرض، عناد پرست اور وطن دشمن بھی ہیں۔ وہ ایسے پاجی اور بدنہاد ہیں کہ اپنے ملک کا استحکام انھیں کھل رہا ہے۔ اپنے ملک کی ترقی انھیں کھٹک رہی ہے اور ایوب خاں کو وہ فقط اس لئے مسندِ حکومت سے ہٹا دینا چاہتے ہیں کہ پاکستان کا استحکام ان کی نظر میں خار بن کر چبھ رہا ہے یہ کیسی ظالمانہ اور انتہا پسندانہ بدگمانی ہے۔ کیسا شدید الزام ہے۔ یہ تو وہی پست زاویۂ نظر ہے جو ہمارے ہندوستان میں فرقہ پرستوں کا طرۂ امتیاز ہے کہ جہاں کسی نے کوئی بات ان کے مزاج اور رائے کے خلاف کہی انھوں نے اسے غدار کہنا شروع کر دیا۔ وطن دشمنی کی اصطلاح کھینچ ماری۔ کاش مولانا اکبرآبادی محسوس فرماتے کہ ضمیر و دیانت کی ساری متاع صرف ان کے یا ایوب خاں کے حصے میں نہیں آگئی ہے فاطمہ جناح کے حامیوں میں بھی ایسے اللہ کے بندے ضرور رہے ہوں گے جنھوں نے بدنیتی اور ملک دشمنی کے جذبے سے ایوب خاں کی مخالفت نہ کی ہو گی۔ نیتوں پر اندھا دھند حملے کرنا اور بدگمانی کی لاٹھی گھمانا سنجیدہ اور خدا ترس لوگوں کا شیوہ نہیں۔

پھر ہم پوچھتے ہیں کہ یہ "استحکام" آخر ہے کیا چیز؟ آج کل اصطلاحوں کی مٹی جیسی پلید ہے اور الفاظ کو جس طرح من مانے مفاہیم میں استعمال کیا جا رہا ہے اس کے پیشِ نظر ہم تشریح چاہیں گے کہ استحکام کے آخر معنی کیا لئے گئے ہیں؟

اگر پاکستان پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ مستحکم اس دلیل سے ہے کہ وہاں کے اربابِ اقتدار نے ہزار بار دعوۂ استحکام کو دہرایا ہے تب تو این و آں کی گنجائش ہی نہیں لیکن اگر سچ مچ مولانا کی نظر میں کچھ ٹھوس چیزیں ایسی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہو کہ پاکستان پہلے کے مقابلے ایوبی دور میں زیادہ مستحکم ہو گیا تو ان کی تفصیل ہم ضرور معلوم کرنا چاہیں گے۔

حالانکہ فقط استحکام کو اہمیت دینا اور یہ نہ دیکھنا کہ پاکستان جس نظریاتی بنیاد اور مقصد کی خاطر بنایا گیا تھا اس کے رُخ پر وہاں کیا پیش رفت ہوئی ہے نہایت کوتاہ نظری ہے۔ استحکام اور ترقی وغیرہ تو ایسی اصطلاحیں ہیں جن کی کسی بھی ملک کے لئے کوئی خصوصیت نہیں ——

ہندوستان، امریکہ، روس، جاپان سبھی اپنے اپنے انداز میں زیادہ سے زیادہ استحکام اور ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔ خصوصیت پاکستان کو یہ تھی کہ وہ اسلام کی نظریاتی بنیادوں پر اسلام ہی کے نعروں کے سہارے بنایا گیا تھا۔ وہاں اس بنیادی مقصد کے لئے کس نے کیا کردار ادا کیا اور ایوبی حکومت اس مقصد کے حصول کی راہیں ہموار کرنے میں کیا پارٹ ادا کرتی رہی اولین جائزہ اس کا لینا چاہئے تھا اور اسی جائزے پر اس فیصلہ کا مدار تھا کہ پاکستان فقط لفظاً نہیں بلکہ معناً بھی مستحکم ہوا ہے یا نہیں۔

لیکن مولانا کے طرزِ فکر میں اس تنقیدی زاویئے کی ادنیٰ سی جھلک بھی نظر نہیں آتی۔ وہ بڑے اطمینان کے ساتھ وہی الفاظ دہرا رہے ہیں جنھیں ایوبی حکومت دہراتی رہی ہے اور کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کونسی ترقی اور استحکام ہے جس کی داد وہ ایوب خاں کو دے رہے ہیں۔

کیا وہ ایوب خاں کی اس خارجہ پالیسی کو استحکام کا نام دیتے ہیں کہ عین اس وقت جب چین نے ہندوستان کی پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا ایوب خاں نے چین کو اہلاً و سہلاً مرحبا کہا، تپاک سے بڑھ کر ہاتھ ملایا اور ایک مستقل اندیشہ ہندوستان کے لئے اس بات کا کھڑا کر دیا کہ یہ گٹھ جوڑ کسی بھی وقت ہندوستان کے خلاف استعمال ہو سکتا ہے۔

ہم جیسے پرانے مسلم لیگی اگر اس استحکام کا قصیدہ پڑھیں تو یہ توجیہہ ممکن بھی ہے کہ یہ تو پرانے غدار ہیں لیکن چشمِ بد دور مولانا کا تعلق تو اس جمعیۃ العلماء سے ہے جو وطن دوستی اور متحدہ قومیت کے میدان کی سچ مچ چیمپین ہے۔ کیا وطن دوستی کا نقطۂ عروج اب یہی رہ گیا ہے کہ پاکستان کو جو استحکام ہندوستان دشمنی کے رُخ پر ملا ہو اس کے گُن گائے جائیں۔ کیا ایک سچے نیشنلسٹ اور وطن دوست کی حیثیت میں کسی ہندوستانی کا یہ رویہ پسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ وہ پاکستانی استحکام و ترقی کا حقیقت پسندانہ اور تقابلی جائزہ لئے بغیر اس کے حق میں رطب اللساں ہو اور اس واقعے کو نظر انداز کر دے کہ ایوبی حکومت اپنی خارجہ پالیسی کا سب سے کامیاب حربہ جسے قرار دیتی ہے وہ وہی چینی دوستی ہے جس کے بارے میں ہم ہندوستانیوں کا جذبۂ وطن دوستی کسی طرح بھی حسنِ ظن قائم نہیں کر سکتا۔

ہم ان لوگوں میں ہیں جو فقط یہ دیکھ کر کسی حکومت کے قصیدہ خواں نہیں ہو سکتے کہ اس نے بہت سی بلڈنگیں بنا دی ہیں، مشینیں لگا دی ہیں، پُل اور سڑکیں تعمیر کرا دی ہیں۔ مادی ترقی کے ان مظاہر کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھنا چاہیں گے کہ ان تعمیرات کے لئے وسائل کیونکر فراہم کئے گئے اور فراہم شدہ وسائل سے کیا اتنا ہی کچھ ہونا چاہئے تھا جتنا ہوا ہے یا اس سے بہت زیادہ بھی ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ ہم یہ بھی تحقیق کرنا چاہیں گے کہ مادّی ترقیات کے اس تدریجی عمل کے دوران معاشرے کے افکار و کردار پر کیا اثرات پڑے ہیں۔ قدریں کونسی فروغ پائی ہیں، اخلاقی احساسات کس رُخ پر گئے ہیں اور ذہنیت و کیریکٹر کے سانچے کس قسم کے بنے ہیں۔ یہ سب دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کر سکیں گے کہ فلاں حکومت نے قدم واقعتہً استحکام و ترقی کی طرف بڑھایا ہے یا وہ کھوکھلے ستونوں پر رنگ و روغن چڑھا رہی ہے۔

لیکن مولانا اکبر آبادی تفتیش اور جائزے کی ادنیٰ سی مشقت اُٹھائے بغیر نہ صرف یہ کہ پاکستان کے استحکام اور ترقی پر مطمئن ہو گئے ہیں بلکہ یہ تک ان پر منکشف ہو گیا ہے کہ جتنے بھی ایوب خاں کے مخالف ہیں سب وطن دشمن ہیں، غدار ہیں اپنے ملکی استحکام کے بیری ہیں۔ اِنا للہ و انا الیہ راجعون۔

اب ہم اُس حصۂ مضمون پر کچھ عرض کرنا چاہینگے جس میں مروّجہ تصورِ جمہوریت کی تردید کرتے ہوئے محدود نوع کی آمریت اور شخصی حکومت کی توصیف کی گئی ہے۔

یہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام تو کیا کوئی بھی ازم اور

فلسفۂ سیاست ہر کس و ناکس کو معاملات حکومت میں دخل اندازی کی اجازت نہیں دیتا اور ڈاکٹر اور عطائی میں فرق کرتا ہے، لیکن بالغ رائے دہندگی کا مطلب اگر معاملات حکومت میں دخل دینا ہے تو کیا بات ہے کہ ہندوستانی نظام سیاست و حکومت کی مخالفت میں آج تک ایک لفظ بھی مولانا کی طرف سے سننے میں نہیں آیا۔ یہاں ایوبی دستور کی "بنیادی جمہوریت" تو رائج نہیں بلکہ بالغ رائے دہندگی کا وہی نظام رائج ہے جس کا حق پاکستانی عوام ایوب خاں سے طلب کرتے ہیں۔ پھر کیا یہاں کا پورا معاشرہ علم کی دولت سے مالامال اور ملکی و قومی وسائل پر سنجیدہ اور ایماندارانہ غور و فکر کا اہل ہے کہ مولانا بالغ رائے دہندگی پر معترض نہیں ہوتے۔ ہندوستان ہی کیا بالغ رائے دہندگی کا رواج تو آج ملک ملک میں ہے۔ کیا مولانا کے نزدیک تمام ملکوں نے ڈاکٹروں اور عطائیوں کو ایک ہی صف میں شمار کر کے اپنے پاگل پن کا اعلان کر دیا ہے اگر بالغ رائے دہندگی کا واحد مفہوم اور حاصل مولانا کی تصریح کے مطابق یہی ہوتا ہے کہ یہ ہر راہ چلتے کو معاملات حکومت میں دخل انداز ہونے کا اذن دینا ہے اور اس اصول انتخاب کے عاملین ڈاکٹر اور عطائی میں فرق نہیں کرتے تب تو ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ:۔

میں بھی پاگل تو بھی پاگل، پاگل کل سنسار

لیکن اگر یہ مطلب نہیں تو خدا کے لئے بتایا جائے کہ فاطمہ جناح کے حامیوں نے ہر شخص کو معاملات حکومت میں دخل دینے کی اجازت کب دی تھی اور ڈاکٹر اور عطائی کو ایک صف میں رکھنے کا اذن کب مانگا تھا۔ ان کا بنیادی مطالبہ "بالغ رائے دہندگی" ہے۔ وہ چاہتے ہیں حکومت عوام کی پسند سے بنے۔ ایسی بنے جو ملکی استحکام اور ترقی کے دعووں کی آڑ میں عوام کے جائز حقوق نہ چھینے ان پر غلامانہ پابندیاں نہ لگائے، ان کی جائز آزادی کو آرڈیننسوں کی باڑھ پر نہ رکھ لے۔

اس خواہش اور مطالبے کو یہ معنے پہنانا کہ وہ عطائی اور ڈاکٹر کو ایک صف میں رکھ رہے ہیں اور یہ باور کرانا کہ اسلام عوامی پسند اور مرضی کو کوئی اہمیت نہیں دیتا عدل و علم کا آئینہ دار تو نہیں۔

اور ایک پُر لطف اعتراض ہم یہ کرتے ہیں کہ جمہوریت پر آمریت کو ترجیح دینے کے سلسلے میں مولانا موصوف اور ایوب خاں کے دیگر ثنا خواں جس وقت عوام کو جاہل و بے شعور قرار دے کر بالغ رائے دہندگی کا دروازہ بند کرنا چاہتے ہیں اس وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ ایوب خاں کا اختیار کردہ طریقِ انتخاب انھیں منہ چڑا رہا ہے۔ کیا پاکستان کی بنیادی جمہوریت کے اسّی ہزار نمائندے آسمان سے منتخب ہو کر آتے ہیں یا انھیں عوام ہی منتخب کرتے ہیں۔ وہی عوام جن کے بارے میں بار بار یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ صدر چُننے کے اہل نہیں ہیں! ہر شخص کو معلوم ہے کہ جن اسّی ہزار نے صدر چُنا ہے وہ خود عوام کالانعام ہی کے چُنے ہوئے تھے۔ پھر یہ کیسا لطیفہ ہے کہ فقط ایک صدر چُننے کے باب میں تو عوام اعتماد کے قابل نہ ہوں، لیکن دو نہ چار! اسّی ہزار نمائندے منتخب کرنے میں ان پر اعتماد کر لیا جائے اور ان کے مبیّنہ جہل و بے شعوری کو نظر انداز کر کے یہ مان لیا جائے کہ وہ یقیناً ایسے ہی اسّی ہزار آدمی منتخب کر لیں گے جو صدر کا انتخاب کرنے کے لئے کلیتہً موزوں اور لائق فائق ہوں ہے نا عجوبہ!۔ اگر یوں کہئے کہ صدر کے انتخاب میں سارے عوام کی رائے لو تو للکار یہ سنئے کہ عوام تو جاہل ہیں، بے شعور ہیں۔ گدھے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو صدر چُننے کا حق دیا جاتا ہے ان کا انتخاب انھی گدھے اور اجہل عوام سے کرایا جائے تو اس کا نام ہے دانائی اور انصاف!

کاش مولانا سوچتے کہ وقت کے نعروں سے فریب جمہوریت کے حامی علماء نے نہیں کھایا ہے بلکہ خود موصوف ہی کا ذہن صاف نہیں ہے اور مسائل کا جائزہ وہ سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں۔

اچھا یہ مان ہی لیا کہ بالغ رائے دہندگی کا حق عوام کو اسی وقت ملنا چاہیے جب وہ مولانا کی تصریح کے مطابق برطانوی عوام کا سا علم و شعور حاصل کرلیں۔ لیکن اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ جب تک ایسا نہ ہو پاکستان پر ایوب خاں ہی کا پرچم صدارت لہراتا رہے۔ کیا اسلام یہ بھی کہتا ہے کہ غیر تربیت یافتہ عوام پر ایسے حاکموں کو مسلط کردو جو عائلی قوانین جیسے کارنامے انجام دیں۔ جو جماعت اسلامی جیسی جماعتوں کو فنا کے گھاٹ اتار کر ان کے اعیان کو قید میں ڈال دیں اور زنداں کا دروازہ اس وقت تک نہ کھولیں جب تک ملک کی اعلیٰ عدالت کے جراَت مندانہ جج کھل کر یہ فیصلہ نہ دیدیں کہ حکومت کی یہ ساری کارروائی ظلم اور دھاندلی پر مبنی تھی۔

کیا قرآن کی محولہ آیت ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ کا ذکر یہ یقین دلانے کے لئے کیا گیا ہے کہ حکومت چلانے اور نظم و نسق قائم کرنے کے معاملے میں ایوب خاں ہی واحد عالم ہیں۔ فاطمہ جناح کے حامی قطعی طور پر جاہل و نااہل تھے یا پھر اور کیا مطلب ہے؟

ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن کی آیات اور اسلام کا نام غیر ذمہ داری کے ساتھ استعمال مت کیجئے۔ یہ طریقہ کچھ عادلانہ نہیں کہ خواہ مخواہ بھی آیتِ قرآنی شامل کرکے کم فہم قارئین کے دماغ میں اپنی بات اتاری جائے۔ آیت پیش فرمائی ہے تو یہ بھی واضح کیجئے کہ اس کے ذریعے آپ کے موقف کی تائید کیونکر ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ عالم و جاہل یکساں نہیں ہوسکتے۔ باخبر اور بے خبر کو ایک درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ حکومت کے معاملات میں ہرایرے غیرے کا دخل اچھا نہیں۔ لیکن یہ بات زیر بحث ہی کب تھی اور جن غریب علماء کو نشانۂ ملامت بنایا جارہا ہے انھوں نے آخر کب یہ لغو دعویٰ کیا تھا کہ عالم و جاہل یکساں ہیں۔ حکومتی نظم و نسق ہرکس و ناکس چلا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ بڑی غلط بات ہے کہ اپنی طرف سے کچھ باتیں فریق ثانی کی طرف منسوب کردو اور پھر شد و مد سے ان کا رد کرو۔ اگر ملک کے عوام کی رائے کسی کی دانست میں علم و شعور کے ایک خاص تناسب کے بغیر لائق التفات نہیں ہے، تو جب یہ شخص پارلیمنٹری نظام اور بالغ رائے دہندگی کے طریقے پر معترض ہوتا ہے تو اسے ایوب خاں کی بنیادی جمہوریت پر بھی لازماً معترض ہونا چاہئے کہ صدر کے انتخاب کا حق اس میں بھی بالواسطہ عوام ہی کو دیا گیا ہے۔ صدر کو چننے والے اسی ہزار جمہوریئے عوام ہی چنتے ہیں اور یہ وہی عوام ہیں جن کی بے شعوری اور جہل و نادانی کا اعلان ہو رہا ہے۔ اب اگر ایک شخص بلاواسطہ بالغ رائے دہندگی پر تو اسلام کے فلسفۂ سیاست کی دہائی دیتا ہے۔ لیکن بالواسطہ بالغ رائے دہندگی پر کوئی احتجاج نہیں کرتا تو اس کے سوا کیا سمجھا جائے کہ اس کا مقصد کسی اصول و نظریہ کی مخالفت نہیں بلکہ فقط ان لوگوں کی مخالفت ہے جنھوں نے اس کے ممدوح کی مخالفت کی ہے۔ فاطمہ جناح کے حامی مطالبہ کریں کہ حکومت کا صدر براہ راست عوام کی رائے سے بنایا جائے تو یہ اسلامی فلسفۂ سیاست کے بالکل خلاف اور جاہل اور عالم کو ایک صف میں رکھدینے کے ہم معنی ہوا، لیکن ایوب خاں کے پسند فرمودہ طریق انتخاب میں ایک واسطہ درمیان میں رکھ کر عوام کو رائے دہندگی کا حق دیا جائے تو یہی جاہل عوام اس درجہ باشعور مان لئے جائیں کہ ایک دو نہیں اسی ہزار انسانوں کا انتخاب یہ ٹھیک ٹھیک کرلیں گے۔

ہے اس عدل و فراست کا کوئی جواب!

کاش مولانا نے یہ بتانے کے ساتھ کہ اسلام حکومت سازی کے کس طریقے کو نادرست قرار دیتا ہے۔ یہ بھی بتا دیا ہوتا کہ کس قسم کی حکومت اور کس اسوۂ و کردار کے حکمراں اسے مطلوب ہیں۔ اس تندرست پہلو پر لب کشائی ہوتی تب ہم اور جملہ قارئین دیکھتے کہ ایوب خاں صاحب کے اسوۂ و کردار کی نوک پلک درست کر دکھانے میں ان کا ذہن رسا اور خامۂ عنبر شمامہ کتنی مہارت کا ثبوت دیتا ہے۔ یہ تو بجا ہے کہ اسلام کو مس فاطمہ جناح جیسی ہستیوں کی حکمرانی نہیں چاہئے، لیکن کیا یہ بھی بجا ہے کہ اسلام کو ایوب خاں جیسے حکمراں مطلوب ہیں؟

شکر ہے کہ مولانا دریابادی کی طرح مولانا اکبرآبادی بھی "حکومتِ الٰہیہ" کا نام تحسین و تقدیس ہی کے سیاق میں لیتے ہیں۔ جزاہم اللہ۔ لیکن جس فکری خلاء کا احساس ہم نے مولانا دریابادی کے معاملے میں کیا وہی خلاء یہاں بھی نظر آرہا ہے۔ حکومتِ الٰہیہ اگر بتدریج نہیں بنتی اور اس کی تشریف آوری کا راستہ جمہوریت کے باب الامن سے نہیں نکلتا تو کیا وہ یکلخت بنی بنائی آسمان سے اُتر آتی ہے یا دفعتاً طاقت اور انقلاب آفریں سازشوں کے ذریعے بنائی جاتی ہے۔ کسی منزل کے مختلف مراحل کو اگر کوئی شخص منزل کی ضد اور نقیض قرار دیتا ہے تو اسے دوسروں کی حالت پر آہ سرد بھرنے کے عوض خود اپنے مبلغ فکر کا جائزہ لینا چاہیئے۔ حکومتِ الٰہیہ کے لئے جس وقت "اسلامی حکومت" کے الفاظ استعمال کئے گئے اس وقت بھی استعمال کرنے والوں نے کوئی ذہنی قلابازی نہیں کھائی تھی بلکہ ایک قدرے مبہم اور تصریح طلب اصطلاح کو عام فہم نام دیا تھا اور "اسلامی حکومت" کی جگہ جب "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح استعمال کیگئی اس وقت بھی یہ منزل اور نصب العین کی تبدیلی نہیں تھی فقط لفظی تغیر تھا۔ ہمارا تو ناقص خیال یہ ہے کہ جو داعی الفاظ کو محض طوطے کی طرح نہیں رٹتا بلکہ لوگوں کے احوال اور حالات کی مناسبت سے ان میں مفید تبدیلیاں کرتا رہتا ہے وہ قابل تعریف ہے نہ کہ مستحق ذم۔ ایک ہی مضمون کو رنگارنگ اسالیب اور مختلف الفاظ میں پیش کرنا عیب نہیں ہنر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ:-

ہنر بہ چشمِ حسوداں بزرگ تر عیب است

"جمہوریت" اگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے ٹھیک اس ذہنیت کا نام ہے کہ ظلم و تشدد اور فریب سازش کے عوض رائے عامہ کو ہموار کر کے آگے بڑھا جائے تو مولانا مودودی یوم اول ہی سے جمہوریت کے منّاد و حامی ہیں۔ ان کو اگر شدید اختلاف رہا تو اس باطل اور کافرانہ ذہنیت سے رہا کہ عوام کی مرضی کو خدا اور رسول صلعم تک کی مرضی پر فوقیت دے دی جائے اور زمین کے اصل مالک اللہ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا تصور دماغوں سے بالکل خارج کر دیا جائے۔ اس سے انھیں آج بھی پہلے ہی جیسا اختلاف ہے۔ رہی "اسلامی جمہوریت" تو اس کی مخالفت کا سوال ہی اس لئے پیدا نہیں ہوتا کہ مالک الملک کی حاکمیت کا تصور تو اس کی وضع اور سرشت میں داخل ہے۔ یہی تصور ہے جس کی وجہ سے "اسلامی" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ یہ تصور نہ ہو تو "اسلامی" کے کوئی معنی ہی نہیں۔

حاصل یہ کہ مولانا اکبرآبادی فقط الفاظ کے پھندوں میں پھنس گئے ہیں حالانکہ اقبال نے متنبہ کیا تھا:-

الفاظ کے پھندوں میں اُلجھتے نہیں دانا
غوّاص کو مطلب ہے صدف سے کہ گہر سے

بجا ہے کہ حکومتِ الٰہیہ نے اسلامی حکومت اور اسلامی جمہوریت کا چولا بدلا لیکن چولے اور لباس تو بدلنے ہی کے لئے ہوتے ہیں۔ اعتراض اس وقت بجا ہوتا جب یہ ثابت کر دیا جاتا کہ مصداق و معنی میں بھی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔

یہ ہم جنوری کے شمارے میں شرح و بسط کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ موجودہ حالات میں اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ ہی کے نصب العین کی خاطر آمریت کے خاتمے کی جدوجہد اور جمہوریت کے قیام و بقا کی سرتوڑ کوشش کس لئے ضروری تھی۔ ایک شخص کھانا تیار کرنے کی خاطر اگر جنگل سے لکڑیاں کاٹنے کی مشقت میں پسینے پسینے ہو رہا ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کھانا تیار کرنے کے عوض اس کا مقصود فقط لکڑیاں کاٹنا رہ گیا ہے بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ کھانے کی پُخت و پَز بغیر آگ روشن کئے ممکن نہیں ہے اور آگ روشن کرنے کے لئے ایندھن نہ ہو تو ایندھن کے حصول پر تمام توجہ صرف کر دینا ہی حصولِ مقصد کی واحد راہ ہے۔ جو لوگ تخیلات کے بندے ہیں اور فقط نظریات ہی کی دنیا میں رہتے ہیں وہ تو اس قسم کی خوش فہمی بھی رکھ سکتے ہیں کہ کھانا آپ سے آپ پک کر

حلق تک پہنچ جائے گا' لیکن جنھیں حقائق سے واسطہ ہے اور واقعات کی اسٹیج پر کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ تو وسائل و اسباب ہی کے لئے ہاتھ پاؤں ماریں گے اور فقط تمنّا' فقط خوش خیالی اور فقط الفاظ کی چار دیواریوں میں قید ہو کر نہیں رہ جائیں گے۔

مولٰنا نے اپنے اداریہ کا اختتام جن فقروں پر کیا ہے وہ بھی مجمل اور تشریح طلب ہیں۔ کونسی مذہبی تحریکیں تھیں جو سیاست کی دلدل میں پھنس کر فنا ہو گئیں یہ متعین طور پر معلوم ہو تبھی غور کیا جا سکتا ہے کہ بات کیا بنی۔ بحالت موجودہ تو اتنا ہی سمجھ میں آتا ہے کہ مولٰنا ہر قیمت پر نفسِ سیاست کو شجرِ ممنوعہ باور کرا دینا چاہتے ہیں۔ ہم اس طرزِ فکر کو درست نہیں سمجھتے۔ سیاست کو دلدل کہئے یا آتش کدہ سمندر کہئے یا گھاٹ۔ حکومت و اقتدار کی منزل بہرحال اسی راہ سے آتی ہے۔ حکومتِ الٰہیہ حکومت ہی کی ایک قسم ہے۔ اس تک بھی رسائی سیاست سے قطعاً محترز رہ کر نہ عقلاً ممکن ہے نہ عادۃً۔ معلوم نہیں حکومتِ الٰہیہ کی تحسین و مدح کرنیوالے حضرات کس چیز کو حکومتِ الٰہیہ سمجھتے ہیں اگر ان کا تصور یہ ہے کہ سیاست اور دین ایک دوسرے کی ضد ہیں!

مجاہدین کے لشکر میدانِ جہاد میں اُترتے ہیں تو بیشمار مجاہد شہید بھی ہوتے ہیں اور بعض مرتبہ اہلِ حق کے عساکر کو شکستِ فاش بھی نصیب ہوتی ہے —— تو کیا شہادت اور شکست کے خوف سے نفسِ جہاد کو جنسِ فاسد اور زہرِ ہلاہل قرار دیدینا چاہیئے؟

اسی طرح اقامتِ دین اور غلبۂ حق کی خاطر اُٹھنے والی تحریکیں قدرتاً سیاست کی دَل دَل میں بھی قدم رکھتی ہیں۔ پھر کامیابی اور ناکامی' جیت اور ہار دونوں ہی سے واسطہ پیش آنا ناگزیر ہے تو کیا فقط اس لئے سیاست کو جنسِ حرام قرار دیدینا چاہیئے کہ اس کے چکر میں قید و بند' تباہی' موت سبھی کچھ ممکن ہے؟

مذہبی تحریکیں اگر سیاست کے دلدل میں پھنسکر فنا ہو گئیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آیا ثم آیا وہ کہے جو میدانِ جہاد میں قتل ہونے والے شہداء کی حقیقی کامیابی پر یقین نہ رکھتا ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ نتیجۂ جہاد چاہے عساکرِ حق کی کامل شکست ہی کیوں نہ ہو لیکن شہداء اپنی منزلِ مقصود کو پا گئے اور انھیں دوبارہ زندگی مل جائے تو مشورہ یہی دیا جائیگا کہ جاؤ پھر میدانِ جہاد میں جاؤ اور اپنے لہو سے میدان کو رنگین کرو۔

جہاد فقط تلواروں ہی کے ٹکرانے کو نہیں کہتے۔ نیک نیت داعیانِ حق کے لئے میدانِ سیاست بھی میدانِ جہاد ہی ہے۔ اس دلدل میں اگر وہ حریف کا شکار ہو جاتے ہیں تو ہزار بار ہوں مشیتِ الٰہی اور تکوینی اُمور کا واحد ذمہ دار خالقِ کائنات ہے۔ مشیت یہی تھی کہ کتنے ہی نبیوں کو ان کی قوم ظلم و تشدد کی بھٹی میں جھونک دے' زخموں سے چُور کر دے۔ آروں سے چیر ڈالے' مگر ڈیوٹی ہر نبی کی آخر تک یہی رہی کہ اپنی قوم کے آگے وہی دعوتِ حق پیش کرتا رہے جس کے نتیجے میں پچھلے بہتیرے انبیاء جبر و جور کا نشانہ بنائے گئے حتیٰ کہ جان تک کی بازی ہار گئے۔ اسی طرح اقامتِ دین کی تحریکیں اگر ہزار بار بھی سیاست کی دلدل میں پھنس کر فنا کے گھاٹ اُترتی رہیں گی تو ڈیوٹی ان کی بہرحال یہی باقی رہے گی کہ حق کو مسندِ اقتدار پر بٹھانے کی خاطر سیاست کی دَلدل میں قدم رکھیں اور اُس ابتلاء' آفت اور انجام کا سامنا کریں جو مشیتِ ایزدی نے مقدر کر دی ہے۔ جسے ہلاکت اور ابتلاء سے گریز ہو وہ اقامتِ دین کا نام ہی کیوں لے اور دعویٰ ہی کیوں کرے کہ ہیں حکومتِ الٰہیہ کی منزل کا مسافر ہوں۔ راہبوں اور چلّہ کشوں کو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ مسجد و خانقاہ میں شب و روز عبادت کیجئے' صائم الدہر اور قائم اللیل بن جائیے۔ امن ہی امن کی بارش ہو گی اور عساکرِ طاغوتی کا کوئی سپاہی ایک تیر بھی آپ پر ضائع نہیں کریگا ہاں جب آپ اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کی بات کریں گے تو کمانیں کھینچ جائیں گی۔ تیر چلّوں پر چڑھا لئے

جائیں گے۔ پھر آپ اگر صرف زبان و بیان اور وعظ و خطابت تک محدود رہے تب بھی خیریت میں فرق آنے کا کم ہی خطرہ ہے لیکن جس دم آپ نے عملی حدود میں قدم رکھا اور سیاست کا رُخ اپنی منزل کی طرف موڑنا چاہا بس تیر ہی تیر برسیں گے پتھر ہی پتھر ضیافت کریں گے۔

یہ قدم قدم بلائیں، یہ سوادِ کوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

ہمیں اس سے کوئی اختلاف نہیں کہ کتنی ہی مذہبی تحریکوں کو وقت کے جبّاروں نے کچلا ہے اور حق کی داعی جماعتیں انتہائی بے دردی کے ساتھ روند ڈالی گئی ہیں، لیکن ایسی کوئی راہ ہمیں نظر نہیں آتی جو داعیانِ حق کے کسی قافلے کو جھولا جھلاتے اور لوریاں سناتے حکومتِ الٰہیہ کی منزل تک پہنچانے کی ضامن ہو۔ دو ہی راستے ہیں۔ یا تو کہدو کہ اقامتِ دین اور حکومتِ الٰہیہ کا خواب اب کبھی نہ دیکھا جائے۔ کبھی اس کی تمنّا نہ کی جائے۔ یا پھر کہدو کہ تباہی اور آفت و ابتلاء کا ڈر داعیانِ حق کو سیاسی جہاد سے باز نہیں رکھ سکتا۔ یہ کیا کہ آسمان پر چڑھنا بھی چاہتے ہو اور فضائی سفر کو حرام بھی قرار دیتے ہو۔ یا للعجب۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

کتاب و سنت اور اقامتِ دین

(مولانا مودودی کی تفسیر تفہیم القرآن کا ایک ٹکڑا جو "تعبیر کی غلطی" کے مرکزی خیال کا مکمل طور پر قاطع ہے)

اُس نے تمہارے لئے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمھاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسٰےؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔ یہی بات ان مشرکین کو سخت ناگوار ہوئی ہے جس کی طرف (اے محمدؐ) تم انھیں دعوت دے رہے ہو۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنا کر لیتا ہے اور وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اسی کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔ (الشوریٰ)

یہ آیت چونکہ دین اور اس کے مقصود پر بڑی اہم روشنی ڈالتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس پر پوری طرح غور کر کے اسے سمجھا جائے۔

فرمایا کہ شَرَعَ لَكُمْ "مقرر کیا تمھارے لئے" شرع کے لغوی معنی راستہ بنانے کے ہیں اور اصطلاحاً اس سے مراد طریقہ اور ضابطہ اور قاعدہ مقرر کرنا ہے۔ عربی زبان میں اسی اصطلاحی معنی کے لحاظ سے تشریع کا لفظ قانون سازی LEGISLATION کا، شرع اور شریعت کا لفظ قانون LAW کا اور شارع کا لفظ واضع قانون LAW-GIVER کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ یہ تشریع خداوندی اور اصل فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ ان اصولی حقائق کا جو اوپر آیت نمبر ۹ و ۱۰ میں بیان ہوئے ہیں کہ اللہ ہی کائنات کی ہر چیز کا مالک ہے اور وہی انسان کا حقیقی ولی ہے اور انسانوں کے درمیان جس امر میں بھی اختلاف ہو اُس کا فیصلہ کرنا اسی کا کام ہے۔ اب چونکہ اصولاً اللہ ہی مالک اور ولی اور حاکم ہے۔ اس لئے لامحالہ وہی اس کا حق رکھتا ہے کہ انسان کے لئے قانون اور ضابطہ بنائے اور اسی کی یہ ذمّہ داری ہے کہ انسانوں کو یہ قانون و ضابطہ دے۔ چنانچہ اپنی اس ذمہ داری کو اس نے یوں ادا کر دیا ہے،

پھر فرمایا مِنَ الدِّيْنِ "از قسم دین" شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس کا ترجمہ "از آئین" کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو تشریع فرمائی ہے اس کی نوعیت آئین کی ہے، لفظ "دین" کی جو تشریح ہم اس سے پہلے سورۂ زمر حاشیہ نمبر ۳ میں کر چکے ہیں، وہ اگر نگاہ میں رہے تو یہ سمجھنے میں کوئی اُلجھن پیش نہیں آسکتی کہ دین کے معنی ہی کسی کی سیادت و حاکمیت تسلیم کر کے اس کے احکام کی اطاعت کرنے کے ہیں اور جب یہ لفظ طریقے کے معنی میں بولا جاتا ہے تو اس سے مُراد وہ طریقہ ہوتا ہے جسے آدمی واجب الاتباع اور جس کے مقرر کرنے والے کو مُطاع مانے۔ اس بنا پر اللہ کے مقرر کئے ہوئے اس طریقے کو دین کی نوعیت رکھنے والی تشریع کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی حیثیت محض سفارش (RECOMMENDATION) اور وعظ و نصیحت کی نہیں ہے، بلکہ یہ بندوں کے لئے ان کے مالک کا واجب الاطاعت قانون ہے جس کی پیروی نہ کرنے کے معنے بغاوت کے ہیں اور جو شخص اس کی پیروی نہیں کرتا، وہ دراصل اللہ کی سیادت و حاکمیت اور اپنی بندگی کا انکار کرتا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا کہ دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع وہی ہے جس کی ہدایت نوح اور ابراہیم اور موسٰی

علیہم السلام کو دی گئی تھی اور اُسی کی ہدایت اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہے۔ اس ارشاد سے کئی باتیں نکلتی ہیں — ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس تشریع کو براہ راست ہر انسان کے پاس نہیں بھیجا ہے بلکہ وقتاً فوقتاً جب اس نے مناسب سمجھا ہے ایک شخص کو اپنا رسول مقرر کر کے یہ تشریع اس کے حوالے کی ہے۔ دُوسرے یہ کہ یہ تشریع ابتداء سے یکساں رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کسی زمانے میں کسی قوم کے لئے کوئی دین مقرر کیا گیا ہو اور کسی دوسرے زمانے میں کسی اور قوم کے لئے اس سے مختلف اور متضاد دین بھیجا گیا ہو۔ اللہ کی طرف سے بہت سے دین نہیں آئے ہیں بلکہ جب بھی آیا ہے یہی ایک دین آیا ہے — تیسرے یہ کہ اللہ کی سیادت و حاکمیت ماننے کے ساتھ ان لوگوں کی رسالت کو ماننا جن کے ذریعے سے یہ تشریع بھیجی گئی ہے اور اس وحی کو تسلیم کرنا جس میں تشریع بیان کی گئی ہے۔ اس دین کا لازمی جزء ہے اور عقل و منطق کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کو لازمی جزء ہونا چاہئیے۔ کیونکہ آدمی اس تشریع کی اطاعت کر ہی نہیں سکتا، جب تک وہ اس کے اللہ کی طرف سے مستند AUTHENTIC ہونے پر مطمئن نہ ہو۔

اقامتِ دین

اس کے بعد فرمایا کہ ان سب انبیاءؑ کو دین کی نوعیت رکھنے والی یہ تشریع اس ہدایت اور تاکید کے ساتھ دی گئی تھی کہ اَقِیۡمُوا الدِّیۡنَ۔ اس فقرے کا ترجمہ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے "قائم کنید دین را" کیا ہے اور شاہ رفیع الدین صاحبؒ اور شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے "قائم رکھو دین کو" یہ دونوں ترجمے درست ہیں۔ اقامت کے معنی قائم کرنے کے بھی ہیں اور قائم رکھنے کے بھی اور انبیاء علیہم السلام ان دونوں ہی کاموں پر مامور تھے۔ ان کا پہلا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ دین قائم نہیں ہے وہاں اسے قائم کریں اور دوسرا فرض یہ تھا کہ جہاں یہ قائم ہو جائے یا پہلے سے قائم ہو، وہاں اسے قائم رکھیں۔ ظاہر بات ہے کہ قائم رکھنے کی نوبت آتی ہی اُس وقت ہے جب ایک چیز قائم ہو چکی ہو، ورنہ پہلے اسے قائم کرنا ہوگا۔ پھر یہ کوشش مسلسل جاری رکھنی پڑے گی کہ وہ قائم رہے۔

اب ہمارے سامنے دو سوالات آتے ہیں — ایک یہ کہ دین قائم کرنے سے مراد کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ خود دین سے کیا مُراد کیا ہے۔ جسے قائم کرنے اور پھر قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے؟ ان دونوں باتوں کو بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیے۔

قائم کرنے کا لفظ جب کسی مادّی یا جسمانی چیز کے لئے استعمال ہوتا ہے تو اس سے مراد بیٹھے کو اٹھانا ہوتا ہے — مثلاً کسی انسان یا جانور کو اٹھانا یا پڑی ہوئی چیز کو کھڑا کرنا ہوتا ہے جیسے بانس یا ستون کو قائم کرنا یا کسی چیز کے بکھرے ہوئے اجزاء کو جمع کر کے اسے بلند کرنا ہوتا ہے۔ جیسے کسی خالی زمین میں عمارت قائم کرنا' لیکن جو چیزیں مادی نہیں بلکہ معنوی ہوتی ہیں ان کے لئے جب قائم کرنے کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد اُس چیز کی تبلیغ کرنا نہیں بلکہ اس پر کما حقہٗ عمل درآمد کرنا' اسے رواج دینا اور اسے عملاً نافذ کرنا ہوتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے اپنی حکومت قائم کی تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس نے اپنی حکومت کی طرف دعوت دی' بلکہ یہ ہوتے ہیں کہ اس نے ملک کے لوگوں کو اپنا مطیع کر لیا اور حکومت کے تمام شعبوں کی ایسی تنظیم کر دی کہ ملک کا سارا انتظام اس کے احکام کے مطابق چلنے لگا۔ اسی طرح جب ہم کہتے ہیں کہ ملک میں عدالتیں قائم ہیں تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ انصاف کرنے کے لئے منصف مقرر ہیں اور وہ مقدمات کی سماعت کر رہے ہیں اور فیصلے دے رہے ہیں۔ نہ یہ کہ عدل و انصاف کی خوبیاں بیان کی جا رہی ہیں اور لوگ ان کے قائل ہو رہے ہیں۔ اسی طرح جب قرآن مجید میں حکم دیا جاتا ہے کہ نماز قائم کرو تو اس سے مراد نماز کی دعوت و تبلیغ نہیں ہوتی بلکہ یہ ہوتی ہے کہ نماز کو اس کی تمام شرائط کے ساتھ نہ صرف خود ادا کرو' بلکہ ایسا انتظام کرو کہ وہ اہل ایمان میں باقاعدگی کے ساتھ رائج ہو جائے۔ مسجدیں ہوں' جمعہ و جماعت کا اہتمام ہو۔ وقت کی پابندی کے ساتھ اذانیں دی جائیں۔ امام اور خطیب مقرر ہوں اور لوگوں کو وقت پر مسجدوں میں آنے اور نماز ادا کرنے کی عادت پڑ جائے —

اس تشریح کے بعد یہ بات سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی کہ انبیاء علیہم السلام کو جب اس دین کے قائم کرنے اور قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تو اس سے مراد صرف اتنی بات نہ تھی کہ وہ خود اس دین پر عمل کریں اور اتنی بات بھی نہ تھی کہ وہ دوسروں میں اس کی تبلیغ کریں تاکہ لوگ اس کا برحق ہونا تسلیم کرلیں، بلکہ یہ بھی تھی کہ جب لوگ اسے تسلیم کرلیں تو اس سے آگے قدم بڑھا کر پورا کا پورا دین ان میں عملاً رائج اور نافذ کیا جائے تاکہ اس کے مطابق عملدرآمد ہونے لگے اور ہوتا رہے۔ اس میں شک نہیں کہ دعوت و تبلیغ اس کام کا لازمی ابتدائی مرحلہ ہے جس کے بغیر دوسرا مرحلہ پیش نہیں آسکتا۔ لیکن ہر صاحب عقل آدمی خود دیکھ سکتا ہے کہ اس حکم میں دعوت و تبلیغ کو مقصود کی حیثیت نہیں دی گئی ہے بلکہ دین قائم کرنے اور قائم رکھنے کو مقصود قرار دیا گیا ہے دعوت و تبلیغ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ضرور ہے مگر بجائے خود مقصد نہیں ہے۔ کجا کہ کوئی شخص اسے انبیاء کے مشن کا مقصد وحید قرار دے بیٹھے۔

ایک سطحی اور خطرناک رائے

اب دوسرے سوال کو لیجئے۔ بعض لوگوں نے دیکھا کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام انبیاء علیہم السلام کے درمیان مشترک ہے اور شریعتیں ان سب کی مختلف رہی ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا۔ اس لئے انھوں نے یہ رائے قائم کرلی کہ لامحالہ اس دین سے مراد شرعی احکام و ضوابط نہیں ہیں، بلکہ صرف توحید و آخرت اور کتاب و نبوت کا ماننا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت بجالانا ہے یا حد سے حد اس میں وہ موٹے موٹے اخلاقی اصول شامل ہیں جو سب شریعتوں میں مشترک رہے ہیں لیکن یہ ایک بڑی سطحی رائے ہے جو محض سرسری نگاہ سے دین کی وحدت اور شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر قائم کرلیگئی ہے اور یہ ایسی خطرناک رائے ہے کہ اگر اس کی اصلاح نہ کردی جائے تو آگے بڑھ کر بات دین و شریعت کی اس تفریق تک جا پہنچےگی

جس میں مبتلا ہو کر سینٹ پال نے دین بلا شریعت کا نظریہ پیش کیا اور سیدنا مسیح علیہ السلام کی امت کو خراب کردیا۔ اس لئے کہ جب شریعت دین سے الگ ایک چیز ہے اور حکم صرف دین کو قائم کرنے کا ہے نہ کہ شریعت کو، تو لامحالہ مسلمان بھی عیسائیوں کی طرح شریعت کو غیر اہم اور اس کی اقامت کو غیر مقصود بالذات سمجھ کر نظر انداز کردیں گے۔ اور صرف ایمانیات اور موٹے موٹے اخلاقی اصولوں کو لیکر بیٹھ جائیں گے۔ اس طرح کے قیاسات سے دین کا مفہوم متعین کرنے کے بجائے آخر کیوں نہ ہم خود اللہ کی کتاب سے پوچھ لیں کہ جس دین کو قائم کرنے کا حکم یہاں دیا گیا ہے آیا اس سے مراد صرف ایمانیات اور چند بڑے بڑے اخلاقی اصول ہی ہیں یا شرعی احکام بھی۔

دین کیا ہے؟

قرآن مجید کا جب ہم تتبع کرتے ہیں تو اس میں جن چیزوں کو دین میں شمار کیا گیا ہے۔ ان میں حسب ذیل چیزیں بھی ہمیں ملتی ہیں:-

(۱) وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَٰلِكَ دِينُ الْقَيِّمَةِ (البیّنہ، آیت ۵)

"اور ان کو حکم نہیں دیا گیا مگر اس بات کا کہ یکسو ہو کر اپنے دین کو اللہ کے لئے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی راست رو ملّت کا دین ہے۔" ان دونوں کے احکام مختلف رہے ہیں۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تمام پچھلی شریعتوں میں نماز کی یہی تشکل و ہیئت یہی اس کے اجزاء یہی اس کی رکعتیں یہی اس کا قبلہ، یہی اس کے اوقات اور یہی اسکے دوسرے احکام رہے ہیں۔ اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق بھی کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ تمام شریعتوں میں یہی اس کا نصاب، یہی اسکی شرحیں اور یہی اس کی تحصیل اور تقسیم کے احکام رہے ہیں۔ لیکن اختلاف شرائع کے باوجود اللہ تعالیٰ ان دونوں چیزوں کو

دین ہیں شمار کر رہا ہے۔

(۲) حُرِّمَتْ عَلَیْكُمُ الْمَیْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِیْرِ وَمَا اُهِلَّ بِهٖ لِغَیْرِ اللّٰهِ ... اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ .... (المائدہ ۳) "تمہارے لئے حرام کیا گیا مُردار اور خون اور سُور کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور وہ جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو سوائے اس کے جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا اور اور وہ جو کسی آستانے پر ذبح کیا گیا ہو۔ نیز یہ بھی تمہارے لئے حرام کیا گیا کہ تم پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو۔ یہ سب کام فسق ہیں۔ آج کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے لہذا تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے مکمّل کر دیا ....."

اس سے معلوم ہوا کہ یہ سب احکامِ شریعت بھی دین ہی ہیں۔

(۳) قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ (التوبہ ۔ ۲۹) "جنگ کرو اُن لوگوں سے جو اللہ اور یومِ آخر پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسولؐ نے حرام کیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دینِ حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔"

معلوم ہوا کہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے کیساتھ حلال و حرام کے ان احکام کو ماننا اور ان کی پابندی کرنا بھی دین ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے دیئے ہیں۔

(۴) اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ .... (النور ۔ ۲) "زانیہ عورت اور مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سَو کوڑے مارو اور ان پر ترس کھانے کا جذبہ اللہ کے دین کے معاملے میں تم کو دامنگیر نہ ہو۔ اگر تم اللہ اور روزِ آخر پر ایمان رکھتے ہو۔" مَا كَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِكِ (یوسف ۔ ۷۶) یوسفؑ اپنے بھائی کو بادشاہ کے دین میں پکڑ لینے کا مجاز نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فوجداری قانون بھی دین ہے۔ اگر آدمی خدا کے فوجداری قانون پر چلے تو وہ خدا کے دین کا پیرو ہے اور اگر بادشاہ کے قانون پر چلے تو وہ بادشاہ کے دین کا پیرو

دین کس لئے آیا ہے؟

یہ چار تو وہ نمونے ہیں جن میں شریعت کے احکام کو بالفاظ صریح دین سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جن گناہوں پر اللہ تعالیٰ نے جہنم کی دھمکی دی ہے (مثلاً زنا، سود خوری، قتلِ مومن، یتیم کا مال کھانا، باطل طریقوں سے لوگوں کے مال لینا وغیرہ) اور جن جرائم کو خدا کے عذاب کا موجب قرار دیا ہے (مثلاً عملِ قومِ لُوط اور لین دین میں قومِ شعیب کا رویّہ) ان کا سدِّباب لازماً دین ہی میں شمار ہونا چاہیئے اس لئے کہ دین اگر جہنم اور عذابِ الٰہی سے بچانے کے لئے نہیں آیا ہے تو اور کس چیز کے لئے آیا ہے؟ اسی طرح وہ احکامِ شریعت بھی دین ہی کا حصّہ ہونے چاہئیں جن کی خلاف ورزی کو خلود فی النار کا موجب قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً میراث کے احکام جن کو بیان کرنے کے بعد آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَیَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ یُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِیْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ (النساء ۔ ۱۴) "جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی اور اللہ کے حدود سے تجاوز کرے گا اللہ اُس کو دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لئے رُسواکن عذاب ہے۔" اسی طرح جن چیزوں کی حُرمت اللہ تعالیٰ نے پوری شدّت اور قطعیت کے ساتھ بیان کی ہے۔ مثلاً ماں اور بہن اور بیٹی کی حرمت، شراب کی حرمت، چوری کی حرمت، جوے کی حرمت، جھوٹی شہادت کی حرمت، ان کی تحریم کو اگر اقامتِ دین میں شامل نہ کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کچھ غیر ضروری احکام بھی دے دیئے

ہیں جن کا اجراء مقصود نہیں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جن کاموں کو اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے مثلاً روزہ اور حج، ان کی اقامت کو بھی محض اس بہانے اقامتِ دین سے خارج نہیں کیا جا سکتا کہ رمضان کے ۳۰ روزے تو پچھلی شریعتوں میں نہ تھے اور کعبے کا حج تو صرف اس شریعت میں تھا جو اولادِ ابراہیمؑ کی اسماعیلی شاخ کو ملی تھی۔

در اصل ساری غلط فہمی صرف اس وجہ سے ہوئی ہے کہ آیت لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجاً (ہم نے تم میں سے ہر امت کے لئے ایک شریعت اور ایک راہ مقرر کردی) کا الٹا مطلب لیکر اسے یہ معنی پہنا دیئے گئے ہیں کہ شریعت چونکہ ہر امت کے لئے الگ تھی اور حکم صرف اس دین کے قائم کرنے کا دیا گیا ہے جو تمام انبیاء کے درمیان مشترک تھا اس لئے اقامتِ دین کے حکم میں اقامتِ شریعت شامل نہیں ہے حالانکہ درحقیقت اس آیت کا مطلب اس کے بالکل برعکس ہے۔ سورۂ مائدہ میں جس مقام پر یہ آیت آئی ہے اس کے پورے سیاق و سباق کو آیت ۴۱ سے ۵۰ تک اگر کوئی شخص بغور پڑھے تو معلوم ہوگا کہ اس آیت کا صحیح مطلب یہ ہے کہ جس نبی کی امت کو جو شریعت بھی اللہ تعالیٰ نے دی تھی وہ اس امت کے لئے دین تھی اور اس کے دورِ نبوت میں اسی کی اقامت مطلوب تھی اور اب چونکہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ نبوت ہے اس لئے امتِ محمدیہ کو جو شریعت دی گئی ہے وہ اس دور کے لئے دین ہے اور اس کا قائم کرنا ہی دین کا قائم کرنا ہے رہا ان شریعتوں کا اختلاف تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعتیں باہم متضاد تھیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے جزئیات میں حالات کے لحاظ سے کچھ فرق رہا ہے۔ مثال کے طور پر نماز اور روزے کو دیکھئے نماز تمام شریعتوں میں فرض رہی ہے مگر قبلہ ساری شریعتوں کا ایک نہ تھا اور اس کے اوقات اور رکعات اور اجزاء میں بھی فرق تھا۔ اسی طرح روزہ ہر شریعت میں فرض تھا مگر رمضان کے ۳۰ روزے دوسری شریعتوں میں نہ تھے اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ مطلقاً نماز اور روزہ تو اقامتِ دین میں شامل ہے مگر ایک خاص طریقے سے نماز پڑھنا اور خاص زمانے میں روزہ رکھنا اقامتِ دین سے خارج ہے بلکہ اس سے صحیح طور پر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر نبی کی امت کے لئے اس وقت کی شریعت میں نماز اور روزے کے لئے جو قاعدے مقرر کئے گئے تھے انھی کے مطابق اس زمانے میں نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا دین قائم کرنا تھا اور اب اقامتِ دین یہ ہے کہ ان عبادتوں کے لئے شریعت محمدیہؐ میں جو طریقہ رکھا گیا ہے ان کے مطابق انھیں ادا کیا جائے۔ انھی دو مثالوں پر دوسرے تمام احکامِ شریعت کو بھی قیاس کر لیجئے۔

تعبیر کی غلطی

قرآن مجید کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ یہ کتاب اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کا پروگرام نہیں دے رہی ہے، بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی ہے۔ اپنے پیروں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ دین حق کو فکری، اخلاقی، تہذیبی اور قانونی و سیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لئے جان لڑا دیں اور ان کو انسانی زندگی کی اصلاح کا وہ پروگرام دیتی ہے جس کے بہت بڑے حصّے پر صرف اسی صورت میں عمل کیا جا سکتا ہے جب حکومت کا اقتدار اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ یہ کتاب اپنے نازل کئے جانے کا مقصد یہ بیان کرتی ہے کہ — اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ۔ (النساء ۱۰۵) "اے نبی ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تم پر نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اس روشنی میں جو اللہ نے تمھیں دکھائی ہے۔" اس کتاب میں زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کے جو احکام دیئے گئے ہیں وہ صریحاً اپنے پیچھے ایک ایسی حکومت کا تصور رکھتے ہیں جو ایک مقرر قاعدے کے مطابق زکوٰۃ وصول کر کے مستحقین تک پہنچانے کا ذمہ لے — (التوبہ ۶۰ — ۱۰۳) اس کتاب میں سود کو

بند کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اور سود خواری جاری رکھنے والوں کے خلاف جو اعلانِ جنگ کیا گیا ہے۔ (البقرہ ۲۷۵-۲۷۹)۔ وہ اسی صورت میں روبعمل آسکتا ہے جب ملک کا سیاسی اور معاشی نظام پوری طرح اہلِ ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ اس کتاب میں قاتل سے قصاص لینے کا حکم (البقرہ - ۱۷۸) چوری پر ہاتھ کاٹنے کا حکم (المائدہ - ۳۸) زنا اور قذف پر حد جاری کرنے کا حکم (النور - ۴۲) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ ان احکام کے مخاطب اہلِ ایمان کفار کی پولیس اور عدالتوں کے ماتحت رہیں گے۔ اس کتاب میں کفار سے قتال کا حکم (البقرہ - ۱۹۰-۲۱۶) یہ سمجھتے ہوئے نہیں دیا گیا ہے کہ اس دین کے پیرو کفر کی حکومت میں فوج بھرتی کریں گے۔ اس کتاب میں اہلِ کتاب سے جزیہ لینے کا حکم (التوبہ ۲۹) اس مفروضے پر نہیں دیا گیا ہے کہ مسلمان کافروں کی رعایا ہوتے ہوئے ان سے جزیہ وصول کریں گے اور ان کی حفاظت کا ذمہ لیں گے۔" اور یہ معاملہ صرف مدنی سورتوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ مکّی سورتوں میں بھی دیدۂ بینا کو علانیہ یہ نظر آسکتا ہے کہ ابتدا ہی سے جو نقشہ پیشِ نظر تھا وہ دین کے غلبۂ و اقتدار کا تھا نہ کہ کفر کی حکومت کے تحت دین اور اہلِ دین کے ذمّی بنکر رہنے کا۔

"سب سے بڑھ کر جس چیز سے تعبیر کی یہ غلطی متصادم ہوتی ہے وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ عظیم الشان کام ہے جو حضورؐ نے ۲۳ سال کے زمانۂ رسالت میں انجام دیا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ آپؐ نے تبلیغ اور تلوار دونوں سے پورے عرب کو مسخر کیا اور اس میں ایک مکمّل حکومت کا نظام ایک مفصّل شریعت کے ساتھ قائم کر دیا جو اعتقادات اور عبادات سے لیکر شخصی کردار، اجتماعی اخلاق، تہذیب و تمدّن، معیشت و معاشرت، سیاست و عدالت اور صلح و جنگ تک زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی تھی۔ اگر حضورؐ کے اس پورے کام کو "اقامتِ دین" کے اس حکم کی تفسیر نہ مانا جائے جو اس آیت کے مطابق تمام انبیاء سمیت آپؐ کو دیا گیا تھا تو پھر اس کے دو ہی معنی ہو سکتے ہیں۔ یا تو معاذ اللہ حضورؐ پر یہ الزام عائد کیا جائے کہ آپ مامور تو صرف ایمانیات اور اخلاق کے موٹے موٹے اصولوں کی محض تبلیغ و دعوت پر ہوئے تھے۔ مگر آپ نے اس سے تجاوز کر کے بطورِ خود ایک حکومت قائم کر دی اور ایک مفصّل قانون بنا ڈالا جو شرائع انبیاء کی قدرِ مشترک سے مختلف بھی تھا اور زائد بھی۔ یا پھر اللہ تعالےٰ پر یہ الزام رکھا جائے کہ وہ سورۂ شوریٰ میں مذکورۂ بالا اعلان کر چکنے کے بعد خود اپنی بات سے منحرف ہو گیا اور اس نے اپنے آخری نبیؐ سے نہ صرف وہ کام لیا جو اس سورۃ کی اعلان کردہ "اقامتِ دین" سے بہت کچھ زائد اور مختلف تھا۔ بلکہ اس کام کی تکمیل پر اپنے پہلے اعلان کے خلاف یہ دوسرا اعلان بھی کر دیا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ (آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کیا) اعاذنا اللہ من ذالک۔ ان دو صورتوں کے سوا اگر کوئی تیسری صورت ایسی نکلتی ہو جس سے "اقامتِ دین" کی یہ تعبیر بھی قائم رہے اور اللہ یا اس کے رسول پر کوئی الزام بھی عائد نہ ہوتا ہو تو ہم ضرور اسے معلوم کرنا چاہیں گے۔"

عمدہ کتابیں

قرآن مترجم

حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمے پر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے سیر حاصل تفسیری حواشی اتنے مشہور و مقبول ہو چکے ہیں کہ اب کسی تعارف کی ضرورت نہیں۔ عمدہ سفید کاغذ پر عکسی چھپائی کا پاکستانی اڈیشن خاصے کی چیز ہے۔ ہدیہ مجلّد بائیس ۲۲ روپے۔

قرآن اور حدیث

مولانا مودودی کے چند قیمتی مضامین قیمت ڈیڑھ روپیہ

تفسیر حقانی

قرآن کی تفسیریں بہت ہیں لیکن مولانا عبدالحق حقانیؒ کی تفسیر اپنا ایک خاص انداز اور امتیازی شان رکھتی ہے۔ قرآن کے قاموسِ معانی کی سیر کیلئے آپ اس مبسوط، مفصل، مستند اور معلومات سے لبریز تفسیر کو ضرور مطالعہ میں رکھیں۔ کامل کا ہدیہ ساٹھ روپے۔ بطور نمونہ جس کا جی چاہے کوئی سا ایک یا چند پارے بھی طلب کر سکتا ہے۔

فی پارہ دو روپے

حجۃ اللہ البالغہ

شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی معرکۃ الآراء کتاب اُردو لباس میں۔ یہ کتاب معارف اسلامیہ کے تعلق سے لاجواب سمجھی گئی ہے۔ مکمل دو جلدوں میں قیمت بیس روپے

حیاتِ انورؒ

علامہ انور شاہ کشمیری کا مفصل تذکرہ ان کے علوم و فنون اور غیر معمولی صلاحیتوں کا تعارف ان کی سبق آموز زندگی کا دلکش خاکہ۔ مجلد چار روپے۔

کیا ہم مسلمان ہیں؟

شمس نوید کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شہ پاروں کا مجموعہ۔ سوز و گداز، اخلاص اور دلکشی کا گنجینہ۔ قیمت مجلد سوا دو روپے۔

فتاویٰ دار العلوم (دیوبند)

"دار العلوم" دیوبند کے مستند فتاوی جو ہر طرح کے مسائل میں آپکی دینی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ مجموعہ گھر میں رہے تو ضرورت کے وقت کسی بھی مسئلے کے متعلق شرعی حکم و ہدایت کا علم حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ تازہ اڈیشن عمدہ ترتیب اور اچھی طباعت کیساتھ مکمل آٹھ حصوں کی قیمت اکیس ۲۱ روپے مجلّد در دو جلد پچیس ۲۵ روپے۔

البیان فی علوم القرآن

یہ تفسیر حقانیؒ کا مقدمہ سمجھئے۔ ہے تو مقدمہ مگر اپنے کثیر علوم و معارف اور سیر حاصل مباحث کی وجہ سے مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے اس کے مطالعہ سے آپ فن تفسیر اور علوم قرآنیہ کے لطیف و دقیق اسرار اور اصول و مبانی سے واقف ہوں گے اگر تفسیر حقانیؒ کے علاوہ کوئی تفسیر آپ کے زیر مطالعہ ہے تب بھی "یہ مقدمہ" اسکی تفہیم میں مدد دیگا۔ چھ روپے

عقائد اسلام (حقانی)

اسلام کی بنیادی عقائد پر متعدد کتابیں ہیں مگر مولانا عبدالحق حقانیؒ کی کتاب "عقائد اسلام" صفِ اول کی چیز سمجھی گئی ہے ہر مسلمان کو اس سے ضرور باخبر ہونا چاہیئے کہ عقاید کی وہ فہرست کونسی ہے جو ضروری عقائد اسلامیہ کی جامع ہے۔ ایسا نہ ہو ہم بے خبری میں کسی ایسے عقیدے سے تہی دامن رہ جائیں جسکے بغیر ایمان و اسلام کا اعتبار ہی بارگاہِ شریعت میں نہیں ہوتا۔

قیمت چار روپے

روحِ تصوّف

صحابہؓ، علماء اور مشائخ و صوفیاء کے ارشادات کی روشنی میں تصوف کے جوہر اور حقیقت کی نشاندہی۔ دلچسپ اور فکر انگیز۔ مجلد تین روپے چھپن ۵۶ پیسے۔

کتابوں کا بڑا مرکز

مکتبہ تجلّی ــــ دیوبند (یو۔پی)

خط مولانا صدر الدین بنام مدیر تجلّی

"تعبیر کی غلطی" میں محترم مؤلف وحید الدین خاں صاحب نے جماعت اسلامی کے بعض ممتاز اراکین سے اپنی مراسلت کی بھی مفصّل روداد شامل کی ہے۔ اس روداد سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ جماعت اسلامی کی تحریک سے متعلق جو شبہات و اعتراضات میرے ذہن میں پیدا ہوئے ان کا اطمینان بخش جواب حاصل کرنے کی خاطر میں نے جماعت کے متعدد اکابر کا دروازہ کھٹکھٹایا لیکن وہ کوئی بھی تسلّی بخش جواب نہیں دے سکے، بلکہ ان کی روش کچھ ایسی ہی رہی جس سے صاف واضح ہوتا تھا کہ جواب ان کے بس کا نہیں اور اپنی بے مائگی کو چھپانے کے لئے انھوں نے غلط بیانی، ہٹ دھرمی، ضد اور دھاندلی کی راہیں بلا تکلّف اختیار کی ہیں۔

بے کردار بلکہ بدکردار پوز ہونے والے ان جماعتی افاضل میں مولانا صدر الدین بھی تھے جن پر یہ شائع کردہ مراسلت نہ صرف کج خُلقی، بد دماغی اور نخوت کا الزام عائد کرتی تھی بلکہ علمی بد دیانتی اور بے بضاعتی کا یقین بھی دلاتی تھی۔ ہم نے جب اس مراسلت کو پڑھا تو بے اختیار جی چاہا کہ خانصاحب کی گرفت اور اعتراض کا تنقیدی جائزہ قلم کے حوالے کریں اور تفسیر جلالین کے سلسلے میں حوالوں کی غلطی اور مطالب کی تحریف کا جو الزام وہ بڑی قطعیت سے مولانا موصوف پر عائد کر رہے ہیں اس کی کمزوری سامنے لائیں لیکن پھر خیال ہوا کہ اس خاص الزام کی جوابدہی اور متعلقہ واقعات کی توضیح کی استدعا خود مولانا ہی سے کرنی چاہیئے تاکہ "مدعی سست گواہ چست" کی پھبتی ہم پر نہ کسی جائے۔

اب مولانا موصوف کا مفصّل مکتوب آپ کے سامنے ہے جو انھوں نے ہماری استدعا کے جواب میں تحریر فرمایا ہے۔ آپ اسے بغور پڑھ کر خود ہی کسی فیصلے پر پہنچیں۔ ہم مولانا صدر الدین یا مولانا مودودی یا کسی بھی فرد یا جماعت کے وکیل نہیں ہیں بلکہ صرف حق و صداقت کے وکیل ہیں۔ ہمارے لئے شخصی اعتبار سے وحید الدین خاں صاحب بھی اتنے ہی محترم اور محبوب ہیں جتنے دوسرے اہلِ علم و فضل۔ مگر زیر بحث معاملے میں ہم دیانتہً اور ایماناً محترم خانصاحب کو حق سے منحرف سمجھتے ہیں اس لئے ہمیں اس فیصلے تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی کہ شیطان کے اُٹھائے ہوئے اس نئے نزاع میں ظالم اور جارح فی الاصل وہی ہے جو اپنے آپ کو مظلوم اور صلح جو باور کرا رہا ہے۔ ہزار بار کوئی ہم سے سُننا چاہے تو سُن لے کہ خدمتِ دین و ملّت کی صراطِ مستقیم تو ہر حال میں وہی اور صرف وہی ہے جسے مولانا مودودی نے ایک منظم فکر، ایک مربوط دعوت، ایک آفاقی تحریک، ایک جامع تصویرِ انقلاب اور ایک بلند مقصدِ زندگی کی حیثیت سے بندگانِ اسلام کے سامنے رکھا ہے۔ اب اگر کوئی اللہ کا بندہ دلائل کی کسی طبعزاد تکنک سے مولانا مودودی، مولانا صدر الدین اور مولانا ابو اللیث جیسے داعیانِ حق کو چور، ڈاکو، رشوت خور اور شرابی بھی ثابت کر دے تو یہ اُن لوگوں کی ذاتی برائیاں ہوں گی صراطِ مستقیم پر اس سے کوئی الزام نہیں آئے گا۔

(عامر عثمانی)

رام پور ۲۴ دسمبر ۱۹۶۳ء
مکرمی و محترمی زید مجدکم -
وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ - گرامی نامہ ملا اور جناب کی فرمائش علم میں آئی۔ جناب وحیدالدین خاں صاحب کی کتاب کے بارے میں میرا خیال یہ تھا کہ اس پر پریس میں کوئی تبصرہ کرنا ناموزوں اور غیر ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے متعدد ناقص اور گمراہ کن مندرجات کے باوجود میں نے حقیقتِ حال کی کوئی وضاحت کرنے کی طرف سے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی مگر اب جب کہ آپ اس کتاب پر "مفصلاً اظہار خیال" کرنا چاہتے ہیں اور اس غرض سے ضروری وضاحتیں طلب فرما رہے ہیں، کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ خاموشی کا یہ رویہ یہاں بھی برقرار رکھوں اس لئے تعمیل ارشاد میں ذیل کی سطریں پیش خدمت ہیں:-

(۱) آپ نے فرمایا ہے کہ اس کتاب میں جو "قضیہ" مجھ سے متعلق ہے اس پر "روشنی" ڈالوں۔ اس قضیے کے سلسلے میں آپ نے مخصوص طور پر جلالین کی شرحوں سے میرے پیش کئے ہوئے دو حوالوں کے مسئلے کا تذکرہ کیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حوالوں کا مسئلہ، کل قضیہ نہیں ہے بلکہ کل قضیے کا صرف ایک چھوٹا سا جزو ہے۔ کل قضیہ تو یہ ہے کہ میں نے خانصاحب کے اس تبصرے کا جواب دینے سے معذوری ظاہر کر دی تھی جو انھوں نے میرے جوابی مضمون پر کیا تھا۔ اور پھر جب انھوں نے میرے مضمون پر از سر نو کوئی مفصل تبصرہ قلم بند فرمایا اور اسے میرے پاس اس شرط کے ساتھ بھیجنا چاہا کہ اس پر ضرور اظہار خیال کروں تو میں ان کی یہ شرط مان لینے پر آخر وقت تک بھی آمادہ نہ ہو سکا اور برابر یہی عرض کرتا رہا کہ اگر آپ کے اس نئے تبصرے کو پڑھ کر میں نے محسوس کیا کہ اس پر اظہار خیال کرنا کسی افادیت کا حامل ہوگا تو ضرور اظہار خیال کروں گا ورنہ نہیں۔ لیکن چونکہ خاں صاحب بھی مجھ سے اظہار خیال کا غیر مشروط وعدہ لے لینے پر سختی سے مصر رہے۔ اسلئے اس دو طرفہ اصرار کا نتیجہ قدرتی طور پر یہی نکلا کہ نہ انھوں نے اپنا یہ تبصرہ مجھے ارسال فرمایا نہ میرے لئے اس کا جواب لکھنے کا کوئی سوال پیدا ہوا جس کے باعث جلالین کی شرحوں کے حوالوں پر ان کے وارد کئے ہوئے اعتراض کا بھی جواب دینے کی نوبت نہ آ سکی۔

اب آپ یہ جاننا چاہیں گے کہ آخر میں نے ایسا کیوں کیا کہ ان کے ابتدائی مختصر تبصرے کا بھی جواب دینے سے انکار کر دیا اور پھر بعد کے مفصل تبصرے پر بھی اظہار خیال کرنے سے غیر مشروط آمادگی ظاہر نہیں کی؟ تو اس بارے میں عرض ہے کہ خانصاحب کے اصل مضمون کو پڑھ کر ہی جس پر میں نے تبصرہ کیا تھا افہام و تفہیم کی افادیت کی طرف سے مجھے خاصی مایوسی ہو چکی تھی اور پھر جب ان کا ابتدائی جوابی تبصرہ میرے سامنے آیا تو اس کے مطالعہ کے بعد یہ مایوسی اپنی انتہا کو پہنچ گئی جس کے کچھ اہم وجوہ تھے:-

سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مجھے خاں صاحب کی نفسیاتی کیفیت کچھ ایسی محسوس ہوئی، وہ ایسی غیر معمولی بلندی سے بولتے نظر آئے۔ انھوں نے اپنے اور ہمارے ناپنے کے لئے جو پیمانے بنائے تھے ان میں ایسا حد سے گزرا ہوا تفاوت دکھائی دیا کہ مزید بحث و گفتگو کو لاحاصل ہی سمجھنا پڑا۔ میں اپنے اس احساس میں حق بجانب تھا یا نہیں اس کا فیصلہ کرنے کے لئے موصوف کی کتاب آپ کے پاس موجود ہے۔ میں یہاں اس کے ایسے تمام مقامات کی نشاندہی تو نہ کروں گا جن کے مطالعے سے میرے اندر یہ احساس پیدا ہوا لیکن کتاب کے صفحات ۱۲۹ ۲۲ ۱۰۶ ۲۳۶ کے جائزے کی، نیز اس کے ابواب "غلط تعبیر کے نتائج" اور "قبول حق کی رکاوٹیں" کو بغور ملاحظہ فرمانے کی اور اس کے بعد صفحہ ۱۰۹ کے مطالعے کی آپ سے ضرور گذارش کروں گا۔ صفحہ ۱۲۹ پر خاں صاحب محترم امیر جماعت اسلامی ہند کے متعلق ارقام فرماتے ہیں کہ "حقیقت یہ ہے کہ آپ نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں حق کا ساتھ دینے کے بجائے جماعت اسلامی کی وکالت کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے۔" صفحہ ۲۲ پر جماعت اسلامی ہند کے ایک شخص کے بارے میں جسے انھوں نے جماعت کے ایک چوٹی کے بزرگ قرار دیا ہے۔ اپنے خیالات و افکار پر اس کا مخالفانہ تبصرہ نقل کر کے لکھتے ہیں کہ "جماعت کے حلقے میں اب تک میں جن لوگوں سے

واقف ہوا ہوں ان میں صاحب موصوف پہلے شخص ہیں جن کو میں دین سے واقفیت کے معاملے میں سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہوں مجھے یقین ہے کہ اگر وہ جماعت کے عام رکن کی حیثیت میں ہوتے تو یقیناً ان کا تبصرہ کچھ اور ہوتا۔ مگر یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ایک سرکاری افسر کسی واقعہ کے بارے میں جو کچھ کہے گا اسمیں شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی منصبی حیثیت غالب آجائے گی۔" صفحہ ۱۰۶ پر میرے جوابی مضمون کے بارے میں اپنا یہ تبصرہ درج کرتے ہیں۔ "مولانا نے (یعنی اس سیہ کار نے) اس میں صدر الدین اصلاحی کی حیثیت سے جواب نہیں دیا ہے بلکہ جماعت اسلامی کی وکالت کی ہے۔" صفحہ ۴۸۶ و ۴۸۷ پر مولانا مودودی کے متعلق غلافِ کعبہ کے قضیے کے سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں کہ "غلافِ کعبہ کے ٹکڑوں کو جس دھوم دھام کے ساتھ مکہ روانہ کیا گیا اور لاکھوں آدمیوں کے جلوس کے ساتھ اس کو ایک تعزیئے کی شکل میں ہوائی اڈے تک پہنچایا گیا وہ خواہ اصطلاحی بدعت ہو یا نہ ہو مگر یہ یقینی ہے کہ یہ محض ایک عوامی تماشا تھا جس کا حقیقی دینداری سے کوئی تعلق نہیں۔ ... ابتداءً جب تک اس قسم کے عوامی واقعات ان (تحریکوں) کیلئے سیاسی سیاسی اہمیت کے حامل نہیں ہوتے وہ ان پر تنقید کرتی ہیں مگر اگلے مراحل میں پہنچنے کے بعد جب اس قسم کے واقعات میں ان کو سیاسی اہمیت نظر آنے لگتی ہے تو ان کی زبان اور ان کی اصطلاحات بدل جاتی ہیں۔" اسی طرح "قبول حق کی رکاوٹیں" کے زیر عنوان انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اگرچہ بظاہر ایک مجرد علمی اور خالص اصولی بحث ہے مگر ہر صاحب نظر محسوس کر سکتا ہے کہ حقیقتِ واقعی یہ نہیں ہے اور اس بحث کے ذریعے انھوں نے در اصل یہ بتانا چاہا ہے کہ میری اس طویل تنقید سے جو پچھلے صفحات میں میں نے کی ہے۔ جماعت اسلامی کے افکار کی غلطی اور میرے افکار کی حقانیت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے، لیکن اب بھی افرادِ جماعت بالعموم میرے پیش کئے ہوئے امرِ حق کو قبول نہ کر سکیں گے کیونکہ ان کے اندر "تمنزاز" شخصیت پرستی، استکبار، دنیا پرستی، جدل، توجیہ بازی، حق کو شئے عجیب کہنے اور ائتِ بقرآن غیر ھذا او بدّلہ کا مطالبہ کرنے والی ذہنیت جیسی باطنی بیماریاں اور کافرانہ نفسیات گھر کئے ہوئے ہیں۔ خاں صاحب کے ان ارشادات کے مطالعے اور جائزے کے بعد اب کتاب کے صفحہ ۱۰۹ پر نظر ڈالئے، جہاں وہ امیر جماعتِ اسلامی ہند کو خطاب کر کے لکھتے ہیں کہ "آپ کا یہ جملہ کہ یوں بعد کو پلٹا کھائیں تو بات دوسری ہے وہ تو اتنا سخت ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا گویا آپ نے مجھے ذبح کر دیا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے اندر یہ حس تو زندہ نہیں ہے کہ حق سامنے آئے تو اسے پہچان لوں اور اسے قبول کر لوں، البتہ اس ذلیل حرکت کی ضرور آپ مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ مصالح کی بنا پر میں قلابازی کھاؤں اور جس چیز کے خلاف آج تنقید کر رہا ہوں اس کو محض کسی مفاد کے پیش نظر آئندہ بلا دلیل قبول کر لوں۔ کاش آپ کا یہ خط دیکھنے کے لئے میں زندہ نہ رہتا، کاش اس سے پہلے میں مر چکا ہوتا۔"

خاں صاحب محترم کی فکر و نظر کے یہ دونوں زاویئے آپ کے سامنے ہیں وہ بھی جو ہم گنہگاروں کے دین و دیانت سے تعلق رکھتا ہے اور وہ بھی جو ان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتا ہے ــــ جماعت اسلامی ہند کا امیر ان کے نزدیک حق کی بجائے جماعت کی وکالت کرتا نظر آرہا ہے اور یہ خاکسار تو قطعی طور پر اس جرم کا مجرم ہے۔ نیز اس جماعت کے سب سے زیادہ واقفِ دین شخص کے بارے میں انھیں صرف خیال یا گمان غالب ہی نہیں۔ یقین بلکہ ڈبل یقین ہے کہ اس نے ان کے مضمون پر تبصرہ کرتے وقت اپنے علم و ایمان کے علی الرغم اظہار خیال ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ بدترین قسم کا مصلحت باز اور بے ضمیر انسان ہے۔ اسی طرح جماعت اسلامی پاکستان کے امیر جماعت کے بارے میں بھی ان کا فیصلہ یہ ہے کہ انھوں نے غلافِ کعبہ کی تیاری اور اس کے جلوس کے سلسلے میں جو کچھ کیا وہ یقینی طور پر محض ایک عوامی تماشا تھا جو سیاسی مصالح کی خاطر اسٹیج کیا گیا تھا۔ بالفاظ دیگر سیاسی مفاد پرستی کے مرض میں مبتلا ہو کر انھوں نے دین کو آلۂ کار بنایا تھا (آپ کو یاد ہوگا کہ مولانا کے غالی مخالفین نے بھی ان پر ٹھیک یہی الزام عائد کیا تھا اور مولانا نے ترجمان القرآن وغیرہ میں اس معاملے کی پوری تفصیل شائع کر کے یہ بالکل واضح کر دیا تھا کہ جلوس کا انتظام کسی منتبت پیشگی پروگرام کے تحت نہیں بلکہ محض حالات کی ایک بڑی خرابی سے بچنے کیلئے مجبوراً کیا گیا تھا۔ یہ وضاحت خاں صاحب کے علم میں تھی جسکو

رکھ کر وہ فرما سکتے تھے کہ مودودی صاحب کی یہ فکری غلطی تھی۔ حالات کا دباؤ خواہ کتنا ہی شدید رہا ہو اس سے نبٹنے کی یہ تدبیر انھیں ہرگز نہیں اختیار کرنا چاہئے تھی کیونکہ یہ فلاں فلاں وجوہ سے صحیح نہیں تھی وغیرہ۔ مگر اس وضاحت نے ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں پائی اور مولانا پر عوامی بازی گری اور سیاسی مفاد پرستی کا الزام لگانا ہی ان کے نزدیک زیادہ پسندیدہ رہا) پھر ان کی عدالت کے یہ فیصلے چند افراد ہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ تقریباً پوری جماعت ہی کو وہ استہزاء اور دنیا پرستی اور استکبار اور ائت بقرآن غیر ھذا او بدّلہ کا مطالبہ کرنے والی ذہنیت اور نہ جانے کن کن اندر باطنی امراض مہلکہ کا مریض ظاہر فرما رہے ہیں ۔۔ لیکن خود اپنے بارے میں یہ الفاظ سننا بھی انھیں زندگی سے بیزار کر دیتا ہے کہ "بعد کو پلٹا کھائیں تو بات دوسری ہے" اور ان الفاظ کو اپنے حلق پر قصاب کی چھری قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ امیر جماعت کے ان لفظوں میں خاں صاحب کی نیت قطعاً زیر بحث نہیں تھی، مگر ان کی حد سے بڑھی ہوئی قوتِ شامہ نے اس جملے میں اپنے (اوپر بدنیت اور مفاد پرست ہونے کے الزام کی بو سونگھ لی اور اس کے نتیجے میں انھیں اس بات کا انتہائی ملال ہوا کہ ان کے بارے میں لوگ اس قسم کا سوءِ ظن رکھتے ہیں۔ لیکن جب ہم "محرومِ القسمتوں" کی بات سامنے آئی تو حسنِ ظن اور اکرامِ مسلم کا یہ دینی اور ایمانی تقاضا یکسر فراموش ہو کر رہ گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے اور دوسرے کے دین و دیانت کو ناپنے کے لئے اس طرح کے الگ الگ پیمانے رکھتا ہو وہ بحث و استدلال کے میدان میں سنجیدہ اور منصفانہ افہام و تفہیم کا حق ادا کرنے پر کس طرح قادر ہو سکتا ہے؟ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ وہ غیر معمولی بلندی سے بول رہا ہو (اس "غیر معمولی بلندی سے بولنے" کی میں کوئی وضاحت نہیں کر رہا۔ کتاب پڑھنے کے بعد اس کی وضاحت انشاء اللہ آپ خود پالیں گے)۔

دوسری وجہ میری اس مایوسی کی یہ ہوئی کہ مجھے خاں صاحب کے جوابی تبصرے میں فکری رسائی، علمی سنجیدگی اور دلائل فہمی کا بڑا فقدان نظر آیا۔ انھوں نے میرے مضمون کے دس نکات منتخب کر کے ان پر تنقید کی تھی، تنقید نہیں بلکہ ان کی بڑے زور و شور سے تردید اور میری پوری پوری تجہیل اور تضحیک کی تھی۔ مگر میں نے ان کے اس جوابی تبصرے کو عموماً "جوابِ حاضر" سے زیادہ نہ پایا الفاظ میں بانکپن اور جملوں میں رعنائی تو ضرور دکھائی دی، مگر اپنے کسی استدلال کا واقعی رد کہیں نہ پا سکا۔ جواب بھی فرمائی، یا تو میری بات سمجھ لینے کی کوشش کے بغیر فرما دی یا اصل نقطۂ بحث کو بدل لیا یا جوشِ تنقید میں میری عبارتوں کو کچھ سے کچھ پڑھ لیا یا پھر تجہیل اور طنز و تعریض کے ذوق سے مغلوب ہو رہے

تیسری وجہ اس مایوسی کی یہ ہوئی کہ اس تبصرے اور جوابی تبصرے کا حاصل مجھے اس کے سوا اور کچھ نہیں دکھائی دیا کہ خاں صاحب میری تنقیدوں کو سامنے رکھ کر اپنے مضمون کو (جو اب ایک ضخیم کتاب بن چکا ہے) نقائص سے پاک کرتے جائیں گے اور فقط اس کے رخنوں کو پُر کرتے رہیں گے۔ نہ صرف یہ کہ مجھے اس سلسلۂ بحث و تنقید کا حاصل صرف یہی نظر آ رہا تھا، بلکہ خدا مجھے معاف فرمائے میں اس بدگمانی سے بھی اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکا تھا کہ خود خاں صاحب کا غیر شعوری طور پر مدعا اور منشاء بھی اب یہی رہ گیا ہے۔ مجھے خانصاحب نے اپنا مضمون تقریباً دو ڈھائی سال قبل جب پہلی بار مطالعہ کرنے کے لئے دیا تھا تو وہ چودہ پندرہ یا بیس پچیس صفحوں کا تھا جسے پڑھ کر میں نے پہلے وہ مختصر سی بات عرض کی جسے موصوف نے اپنی کتاب کے ص۲۲ پر درج فرمایا ہے۔ یعنی "مقاصد سے بڑی حد تک اتفاق، مباحث سے بڑی حد تک اختلاف" پھر اس پر تین چار صفحوں کے تنقیدی نوٹ لکھے جنھیں سامنے رکھ کر خانصاحب سے کوئی گھنٹہ بھر گفتگو کی۔ گفتگو کے بعد خاں صاحب کے اصرار پر وہ تنقیدی نوٹ بھی انھیں دے دیئے۔ چند مہینوں کے بعد دہلی میں اجتماع شوریٰ سنہ ۶۲ء کے موقع پر خاں صاحب کا مضمون پھر میرے سامنے آیا تو اب وہ تقریباً پچاس صفحوں کا ہو چکا تھا۔ اور اس میں جہاں بہت سی نئی بحثیں تھیں وہاں پرانی بحثیں بھی بہت کچھ بدل چکی تھیں۔ پھر جماعتی فیصلے کے تحت میں نے اس کا پچیس صفحوں میں جواب لکھا جس کے بعد معلوم ہوا کہ خاں صاحب نے اپنے اس پچاس صفحوں والے مضمون کو "بہت ناقص اور نامکمل" (ص۱۳۱) قرار دے کر اسے کوئی اور شکل

دیدی ہے اور اب مجھ سے نیز امیر جماعت سے فرمایا کہ میرے از سرِ نو مرتب کئے ہوئے اس مضمون کو پھر سے پڑھیئے اور اس پر دوبارہ تبصرہ کیجئے تو اسے آپ کے پاس بھیجدوں ـــــ یہ ہے مختصر تاریخ خان صاحب کی تحریر اور تصنیف کی انسے سامنے رکھ کر فیصلہ کیجئے کہ میں اپنے اس خیال اور احساس کے لئے معذور تھا یا نہیں کہ خاں صاحب اب اپنے مضمون کے اس تیسرے یا چوتھے ایڈیشن پر بھی جو تبصرہ کرانا چاہتے ہیں وہ افہام و تفہیم کی خاطر نہیں بلکہ اس لئے تاکہ اسے پریس میں لانے سے پہلے ہر طرح کیل کانٹے سے لیس کرلیں۔ وارد ہو سکنے والے ممکن اعتراضوں سے زیادہ سے زیادہ پاک کرلیں، اپنے محاذ کے رہے سہے کمزور مقامات سے باخبر ہو کر انھیں مضبوط بنادیں۔

یہ تھے وہ اہم ترو جوہ جن کی بناء پر میں خاں صاحب کی فرمائش پوری نہ کر سکا نہ ان کے ابتدائی جوابی تبصرے پر اظہارِ خیال کے لئے تیار ہوا نہ بعد کے مفصّل جوابی تبصرے پر پھر تبصرہ کرنے کا غیر مشروط وعدہ کر سکا۔ اسے آپ خاں صاحب کے سامنے ہتھیار ڈال دینے سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں اور اپنے دامنِ علم و کردار کو دھواں کر ڈالنے سے بھی۔ لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہ ہوگا، بلکہ میں تو یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر مجھے ان ساری باتوں کا پہلے سے علم و اندازہ ہوتا جو اَب اس کتاب کے مطالعے کے بعد ہو سکا ہے تو میں خاں صاحب کے مضمون پر اظہارِ خیال کی وہ جرأت بھی نہ کرتا جو اَب تک کر چکا ہوں۔ پھر یہی نہیں میرے نزدیک تو یہ بات بھی کچھ عجیب ہی سمجھی جائے گی کہ جب خاں صاحب کو میں اتنا بے ضمیر دکھائی دے رہا تھا کہ سمجھتا کچھ ہوں لیکن جماعتی وکیل ہونے کی مجبوری سے کہتا کچھ اور ہوں تو انھوں نے مجھ سے دوبارہ تبصرہ کرنے کے لئے اصرار کیوں فرمایا؟ جس شخص کی علمی دیانت ان کی نگاہوں میں اتنی ناقابلِ اعتبار تھی اس کے کسی مزید تبصرے کو پڑھنے کے لئے انھوں نے اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا صحیح کس طرح سمجھا؟

(۲) جیسا کہ عرض کر چکا ہوں جب میں نے مذکورہ بالا وجوہ کی بناء پر خاں صاحب کے پورے جوابی تبصرے پر پھر کسی اظہار خیال کو لا حاصل سمجھا تو قدرتی طور پر تفسیری حوالوں پر وارد کئے جانے والے اعتراض کا جواب بھی عرض نہ کر سکا۔ جواب دینا اگر مجھے کسی افادیت کا حامل نظر آتا تو پورے تبصرے ہی کا جواب عرض نہ کر دیتا، صرف اسی ایک اعتراض کے جواب پر اکتفا کیوں کرتا؟ ہاں اگر ان کے اور میرے درمیان بحث کا دارومدار صرف اسی ایک مسئلے پر ہوتا تو بھی اس کا جواب دے دیتا۔ مگر ان کا فرمانا تو یہ تھا کہ میرا پورا مضمون ہی فضول بحثوں سے بھرا پڑا ہے۔ ایسی حالت میں میں ان کی اس ایک گرفت کی حقیقت کھول کر کیا حاصل کر لیتا؟ جب پورا اعمالنامہ ہی سیاہ تھا تو کسی ایک گناہ کو دھو ڈالنے کی کوشش سے کیا فائدہ ہوتا؟ لیکن چونکہ آپ نے اس مسئلے کی بابت خاص طور سے وضاحت طلب فرمائی اس لئے اس پر تفصیلی روشنی ڈال دیتا ہوں۔

میں نے تو علامہ صاویؒ اور شیخ سلیمانؒ کے حوالے غلط درج کئے تھے نہ ان حوالوں کو غلط معانی پہنائے تھے بلکہ خود خاں صاحب بات نہیں سمجھ سکے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ انھوں نے نہ تو زبان کے مسلمہ اور معروف قواعد کو ملحوظ رکھا نہ ان مفسرین کے سارے الفاظ ہی پر ان کی نظر جم سکی۔ پہلی بات اس لئے کہ وہ الذی اوحینا الیک کو ایک ایسا فقرہ فرما رہے ہیں جس کا ان اقیموا الدین سے کوئی ناقابلِ انفکاک ربط نہیں۔ غور فرمایئے یہ کتنا عجیب و غریب خیال ہے۔ عربی کا ایک مبتدی بھی جانتا ہوگا کہ ـــ الذی اسم موصول ہے اور اوحینا الیک اس کا صلہ ہے اور پھر یہ دونوں مل کر "ما" پر عطف ہو کر شرع کا مفعول بہ بن گئے ہیں، کوئی مستقل جملہ نہیں ہیں کیونکہ عربی کیا دنیا کی کسی زبان میں بھی اسم موصول اور صلہ مل کر کبھی جملہ نہیں بنا کرتا، بلکہ یہ دونوں ملکر ہمیشہ ایک لفظ کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں اور کسی جملے کا محض ایک جزو ہوا کرتے ہیں۔ یعنی ان میں ایک پوری بات کبھی نہیں کہی گئی ہوتی بلکہ کچھ دوسرے الفاظ سے جڑنے کے بعد ہی ایک پوری بات کا مفہوم پیدا کرتے ہیں۔ غرض الذی اوحینا الیک کو ایک جملہ سمجھنا عربی دانی کے عجائبات میں سے ہوگا، وہ کوئی جملہ نہیں بلکہ ایک جملے کا جزو ہے جو شرع لکم سے شروع ہو کر ان اقیموا الدین پر ختم ہوتا ہے۔ جب کہ اس ان اقیموا الدین کو "ما" کا بدل مانا

جائے (جیسا کہ عام طور سے مفسرین نے مانا ہے) بصورتِ دیگر یعنی ان اقیموا الدین کو جملہ مستانفہ ماننے کی شکل میں یہ جملہ موسیٰ وعیسیٰ پر ختم ہوگا، لیکن اس شکل میں بھی شرع لکم سے شروع ہونے والا جملہ فی الواقع ان اقیموا الدین ہی پر جاکر ختم سمجھا جائیگا۔ کیونکہ اقیموا الدین میں جس الدین کا ذکر ہے اس سے مراد وہی الدین ہے جو شرع لکم من الدین میں مذکور ہوچکا ہے اور جس سے الذی اوحینا الیک کا ٹکڑا متعلق ہے۔ اس صورتِ واقعہ کا یہ ایک بدیہی تقاضا ہوگا کہ شرع لکم من الدین سے ان اقیموا الدین تک کے ارشادِ ربانی کا مفہوم و مدعا مقرر کرتے وقت الذی اوحینا الیک کا مفہوم و مدعا لازماً مدنظر رکھا جائے اور لکم میں جو گروہ مخاطب ہے یعنی امت محمدیہ اس کیلئے الدین کے مفہوم کی وسعت اور نوعیت متعین کرتے وقت الذی اوحینا الیک کو شرع لکم من الدین اور ان اقیموا الدین کیساتھ ضرور ہی جوڑ دیا جائے اور آیت کا منشاء تفصیلات کو حذف کرتے ہوئے یہ قرار دیا جائے کہ اے امتِ محمدیہ! تیرے لئے وہ دین مشروع اور مقرر کیا گیا ہے جس کی وحی ہم نے محمدؐ پر کی ہے یہ کہ اسے قائم کرو

اب چونکہ علامہ صاویؒ اور شیخ سلیمانؒ کے نزدیک الذی اوحینا الیک میں پوری شریعت محمدیہ داخل ہے اس لئے ان کی تشریح کے مطابق یہ آیت مسلمانوں کو پورے دین محمدی کی اقامت کا حکم دینے والی قرار پائے گی۔ ورنہ الذی اوحینا الیک کے الفاظ کا وجود معاذ اللہ بالکل فضول اور مہمل ہو کر رہ جائے گا نہیں معلوم خاں صاحب نے اپنے ذہن میں ان الفاظ کے وجود کی کیا غایت ٹھیرا رکھی ہے؟ اس ناممکن کو بھی ممکن فرض کر لیجئے کہ یہ الفاظ بجائے خود ایک علیحدہ فقرہ ہیں جس کا ان اقیموا الدین سے کوئی تعلق نہیں جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے۔ لیکن اس شکل میں بھی تو آیت زیر بحث کے عین وسط میں ان کا وجود کسی مقصد ہی کی خاطر تو ہوگا۔ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ مقصد کیا ہے۔ ترجمے کی حد تک تو موصوف نے اپنے اس دعوے کا حق ادا کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ یعنی آیت کا ترجمہ سارے مترجمین کے برعکس ایسا ہی کیا ہے کہ الذی اوحینا الیک کو ما وصّی پر عطف کرکے جزوِ جملہ بنانے کے بجائے ایک الگ جملے کی حیثیت دیدی ہے، لیکن یہ نہیں بتا سکے ہیں کہ آخر یہ جملہ اس موقع پر آیا کس لئے ہے؟ آیت کا ترجمہ موصوف نے یہ کر رکھا ہے "خدا نے تمھارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوحؑ کو اور ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو حکم دیا تھا اور اے محمدؐ! تمھاری طرف بھی ہم نے اسی کی وحی کی ہے یہ کہ اس دین پر قائم رہو اور اس میں متفرق نہ ہو" صفحہ ۳۱۲ ۔۔۔ جب کہ ہونا اس طرح چاہئے۔

"خدا نے تمھارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور اے محمدؐ! جس کی ہم نے تم پر وحی کی ہے اور جس کی ہم نے ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو وصیت کی تھی یہ کہ الخ"

یہ تو ہوئی زبان کے مسلّمہ اور معروف قواعد کو ملحوظ نہ رکھنے کی بات۔

اب موصوف کی دوسری چوک، یعنی مفسرین کے سارے الفاظ پر نظر ہی نہ جما سکنے کی بات کو لیجئے۔ ان حضرات نے دین کی اصولی تعلیمات اور تمام انبیاء میں متفق علیہ دین کی تشریح کرتے ہوئے صرف ایمانیات اور کچھ بنیادی اعمالِ خیر ہی کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ اس تشریح میں ۔ طاعۃ اللہ فی اوامرہ ونواھیہ کو بھی شامل کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین کی اصولی تعلیمات اور سارے انبیاءؑ کے لائے ہوئے دینوں کی مشترک و متفق علیہ ہدایات الٰہی میں ایک اصولی تعلیم اور متفق علیہ ہدایت یہ بھی تھی کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے سارے اوامر کی بجاآوری کرنی ہوگی اور اس کے تمام نواہی سے رُکنا پڑے گا۔ اس جامع اصولی ہدایت کا عملی مفہوم کیا ہوگا اور اس کی تعمیل کس شکل میں ہو سکے گی؟ یہ کوئی ایسا سوال نہیں جس کے جواب میں دو باتیں کہی جا سکیں۔ یہ جواب لازماً ایک ہی ہوگا اور وہ یہ کہ امت ان سارے احکام دین و شریعت کی مکمل پیروی کرے گی جو اسے اس کے پیغمبر کے ذریعے دیئے گئے ہوں۔ یعنی مسلمانوں کے لئے اس پوری شریعت کی پیروی اور اقامت اس آیت کی رو سے واجب ہوگی جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے انھیں عطا ہوئی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ آیت میں دوسرے انبیاء کے دینوں کا ذکر اسم موصول عام کے

ذریعے کیا گیا ہے لیکن آں حضرتؐ کے دین کا ذکر الّذی اسم موصول خاص کے ذریعے کیا گیا ہے۔ کیونکہ آیت میں لکم کا خطاب امتِ محمدیہؐ سے ہے اور عملاً اسی کا مسئلہ یہاں زیرِ بحث ہے۔ یہ بات کہ امت کے لئے اپنے پیغمبر کے لائے ہوئے سارے احکام کی پیروی ضروری ہوگی۔ اس لئے ہے کہ اس پیروی کے بغیر طاعۃ اللہ فی اوامر کا تحقق ہو ہی نہیں سکتا۔ کیوں کہ اپنے الفاظ "اوامر و نواہی" کو ان حضرات مفسّرین نے عام رکھا ہے، کچھ مخصوص باتوں ہی تک انھیں محدود نہیں کیا ہے۔ اس لئے ایسا خیال کرنا زبردستی کا دعویٰ ہوگا کہ ان اوامر و نواہی میں شریعت کے سارے اوامر و نواہی شامل نہیں ہیں۔ کسی تاویل سے بھی ہم انھیں محدود نہیں کر سکتے۔ چنانچہ ایک بلند ترین محقق کی تصریح بھی سن لیجئے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں اس آیت شرع لکم من الدین الخ پر بحث کرتے ہوئے اور سارے انبیاءؑ کے متفق علیہ امورِ دین کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں انہ اجمع الانبیاء علیهم السلام علیٰ توحید اللہ تعالیٰ ---- وکذالک اجمعوا علیٰ انواع البرّ من الطھارۃ والصلوٰۃ والزکوٰۃ والصوم والحج ---- وکذالک اجمعوا علی النکاح وتحریم السفاح واقامۃ العدل بین الناس وتحریم المظالم واقامۃ الحدود علی اھل المعاصی والجھاد مع اعداء اللہ والاجتھاد فی اشاعۃ امر اللہ ودینہ فھذا اصل الدین ---- وانما الاختلاف فی ھذہ الامور واشباحھا۔ (جلد اول ص۸۶–۸۷)

ملاحظہ فرمائیے اصل اور متفق علیہ دین میں کیا کچھ شامل نہیں ہے؟ ایمانیات اور عبادات کے ساتھ ہی ساتھ معاشرے کے اندر قیامِ عدل اس میں شامل، مجرموں پر حدود و تعزیرات کا نفاذ اس میں شامل، اعدائے دین سے جہاد اس میں شامل۔ پھر وہ کونسی چیز ہے جو دین و شریعت کے دائرے میں تو ہو مگر عملاً اصل و متفقہ دین کے اس حکم اقامت کے تحت نہ آجاتی ہو؟۔ اگر خانصاحب نے ذرا ٹھیر کر اور پوری طرح خالی الذہن ہو کر طاعۃ اللہ فی اوامرہ ونواھیہ کے ان لفظوں پر بھی غور کر لیا ہوتا

تو انھیں اس طرح کی کوئی الجھن نہ پیش آتی کہ یہ حضرات مفسرین جب یہ فرماتے ہیں کہ ان اقیموا الدین میں الدین سے مراد صرف اصل اور متفق علیہ دین ہے تو ساتھ ہی وہ یہ کس طرح کہہ رہے ہیں کہ الذین اوحینا الیك میں پوری شریعتِ محمدیہؐ داخل ہے جس کا مطلب یہ ہو جاتا ہے کہ امت محمدیہؐ کے لئے پوری شریعتِ محمدیہؐ کی اقامت واجب ہے؟ اسی طرح اگر وہ ضروری غور و فکر سے کام لیتے تو ان حضرات کا یہ ارشاد بھی کہ "یہاں شرائع مراد نہیں ہیں"۔ لم یرد بہ الشرائع ان کے لئے کسی الجھن کا باعث نہ بنتا۔ کیونکہ مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں انھیں صاف نظر آجاتا کہ یہ حضرات شرائع کے مراد ہونے کی نفی علی سبیل الاجتماع کر رہے ہیں نہ کہ علی سبیل الانفراد۔ یعنی اپنے اس ارشاد سے انھوں نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اس حکم کی اقامت میں بیک وقت ساری شریعتیں مراد نہیں ہیں کیونکہ تفصیلات میں ان کی شکلیں (صور و اشباح) مختلف رہی ہیں۔ اسی لئے کسی کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ بیک وقت ان ساری شرائع پر عمل کر ڈالے اس لئے اس آیت میں جو یہ حکم دیا گیا ہے کہ نوحؑ اور محمدؐ اور ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام پر نازل کئے جانے والے دینِ حق کی اقامت کرو۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ان حضرات پر جو کچھ بھی نازل ہوا تھا ان سب کی پیروی اور اقامت کرو، کیونکہ یہ مطالبہ تو ایک ناممکن بات کا مطالبہ ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کبھی کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اس لئے اس حکم کا مطلب صرف یہ ہے کہ امت اصل اور متفقہ امورِ دین کیساتھ ان تفاصیل میں پیروی و اقامت اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی کرے جن کی پیروی اور اقامت اصل اور متفقہ امورِ دین کی پیروی و اقامت کے لئے بہرحال ضروری ہے۔

(۳) میرے قضیے کا ایک جزو گفتگو کی وہ روداد بھی ہے جو خاں صاحب نے میرے نام کی صراحت کئے بغیر ص۲۳ پر درج کی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کے ذیل میں میری خاں صاحب سے کم از کم تین گفتگوئیں ہوئی ہیں۔ دو خاصی مفصّل اور طویل اور ایک بہت مختصر۔ انھوں نے دونوں مفصّل گفتگوؤں کا اپنی کتاب میں کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

صرف تیسری کا کیا ہے، لیکن وہ بھی غلط حواشی کے ساتھ۔ میری اس تیسری گفتگو کو جو دراصل گفتگو تھی بھی نہیں، بلکہ ان کے مضمون کے پہلے یا دوسرے ایڈیشن پر میرا ایک مجمل اظہار رائے تھا۔ انھوں نے کتاب کے صفحہ ۲۲ پر ان لفظوں میں درج کیا ہے "مقاصد سے بڑی حد تک اتفاق، مباحث سے بڑی حد تک اختلاف" اور پھر آگے چلکر فرمایا ہے کہ "بعد کے اظہار خیال میں انھوں نے (میں نے) صرف اپنے اختلاف ہی کی تفصیلات پیش کیں۔ ان کا اتفاق میرے سامنے نہیں آیا" حالانکہ یہ بالکل خلاف واقعہ بات ہے۔ میں نے اس اتفاق کا کھلے لفظوں میں ان سے اظہار کر دیا تھا اور اُس گفتگو کے دوران کر دیا تھا جو خود ان کی اپنی روایت کیمطابق "ڈیڑھ مہینے بعد ۱۲ر دسمبر ۶۱ء" کو ہوتی تھی اور جو مفصل ہونے کے باوجود اس کتاب میں جگہ نہیں پا سکی ہے (نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں یہ بھی واضح کر دوں کہ میرا یہ اتفاق کیا تھا؟ میرا اتفاق اس امر میں تھا کہ رفقائے جماعت کے اندر تعلق باللہ اور فکر آخرت کی کمی ہے اور اسے دُور کرنے کی پوری کوشش ہونی چاہیئے) لیکن خاں صاحب خود تو میری یہ بات فراموش کر بیٹھے اور اپنی اس بھول کا وبال مجھ پر ڈال کر میری چارج شیٹ میں ایک اور الزام کا اضافہ کر دیا۔ پھر اس سے بھی زیادہ قابل غور یہ بات ہے کہ جب خاں صاحب محترم نے جماعت اسلامی کے خلاف اپنا عرضی دعویٰ بلکہ یوں کہیئے کہ اپنا فیصلہ مرتب کرتے وقت کسی مصلحت سے یہ ضروری سمجھا تھا کہ افراد جماعت کی "چار سالہ" گفتگوئیں بھی نقل کر دیں تو پھر انھوں نے کچھ گفتگوؤں کو یکسر حذف کیوں کر دیا؟ اگر قارئین کتاب کے سامنے پورا تاریخی مواد بھی رکھنا ان کے نزدیک ضروری تھا تو یہ کیا بات ہوئی کہ اس تاریخی مواد میں سے انھوں نے کچھ کو لے لیا اور کچھ کو نہیں لیا؟ اس سوال کے جواب میں کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا' میں خود کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ البتہ اپنی پہلی گفتگو کا جو وسط ۶۱ء کے لگ بھگ ہوتی تھی ایک حصہ یہاں نقل کر دیتا ہوں۔ ممکن ہے اس کے مطالعے سے آپ خود کسی نتیجے پر پہنچ سکیں۔ یہ گفتگو آیت شرع لکم من الدین الخ کے مفہوم و مدعا پر ہو رہی تھی۔ ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچی کہ خاں صاحب نے فرمایا جماعت اسلامی کے لوگوں میں افکار و اعمال کی جو خرابیاں ہیں وہ اسی امر کا نتیجہ ہیں کہ ان کے سامنے نصب العین ہی غلط رکھا گیا ہے اور دین کے صحیح تصور کے وہ آشنا ہی نہیں (او کما قال) اس پر میں نے عرض کیا آپ کا یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ افکار و اعمال کی خرابی لازماً تصور دین کی غلطی ہی کا نتیجہ نہیں ہوتی' بلکہ اس کے بہت سے دوسرے اسباب بھی ہوا کرتے ہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص کا تصوّر دین بالکل صحیح ہو مگر ماحول کے فاسقانہ ہونے یا خراب تربیت پانے یا اپنی خلقی کمزوریوں کے باعث اس کا عمل برا ہو۔ حضرات صحابۂ کرامؓ کی تاریخی مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ دورِ نبوت کے ایمان افروز ماحول میں ان حضرات کا عمل جتنا بلند اور معیاری تھا زمانۂ مابعد میں اتنا بلند اور معیاری نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے جواب میں خاں صاحب نے فرمایا کہ آخر سارے صحابہؓ نے بھی دین کو ٹھیک ٹھیک کہاں سمجھا تھا (او کما قال)

گفتگوؤں کی نقل و حکایت کے سلسلے میں ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ حال صرف میری گفتگوؤں کی شائع کردہ روداد کا نہیں ہے، بلکہ کچھ عمومی سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ اس بناء پر کہہ رہا ہوں کہ اس کتاب میں خاں صاحب نے جن سولہ سترہ افرادِ جماعت سے اپنی گفتگوؤں کی روداد قلم بند کی ہے ان میں سے جس کسی سے بھی مجھے تحقیق کا اتفاق ہو سکا اس نے اس روداد کی توثیق نہیں کی جو اس کی گفتگو کے بارے میں خاں صاحب نے دے رکھی ہے۔ کسی کا کہنا ہے کہ اس کا منشاء غلط رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ کسی نے بتایا کہ اس کی طرف منسوب کر کے جو باتیں انھوں نے درج فرمائی ہیں وہ ایک خاص سلسلۂ کلام کا جزو تھیں اور ان کا ایک خاص پس منظر اور سیاقِ بحث تھا خاں صاحب نے ظلم یہ کیا ہے کہ اس سلسلۂ کلام اور اس پس منظر اور سیاق بحث کو یا تو یاد نہیں رکھا یا اسے بالقصد حذف کر کے اس کی گفتگو کو بالکل عجیب شکل دے دی ہے۔ میں حسن ظن سے کام لیتے ہوئے یہی کہوں گا کہ موصوف کو چار سال کی طویل مدت میں کی جانے والی یہ کثیر التعداد گفتگوئیں پوری طرح محفوظ نہیں رہ گئی تھیں۔ مگر اس کے باوجود اپنے ذہن کو اس سوال

سے رد کرنا بہت مشکل ہو رہا ہے کہ جس شخص کو بس اپنی بات کی دُھن ہو اس کی نفسیات کیا ہوتی ہیں؟ کیا اس کی یادداشت بھی اس کے مقصد و مطلوب کے تابع ہو رہتی ہے؟

(۴) خط وکتابت کی وہ روداد جو مجھ سے متعلق ہے وہ تو غالباً اصل کے مطابق ہی ہے (غالباً کا لفظ اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ میں نے خاں صاحب کو خطوط لکھے تھے ان سب کی نقل میں نے نہیں رکھی تھی) مگر جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے امیر جماعت سے ہونے والی خط وکتابت کا ایک حصہ اس کتاب میں موجود نہیں ہے اور یہ حصہ بعض پہلوؤں سے خاص اہمیت بھی رکھتا ہے۔ لیکن اس کی وضاحت آپ امیر جماعت ہی سے حاصل کر سکیں گے۔

(۵) میرے قضیے کا ایک جزء خاں صاحب ہی کے لفظوں میں ان کا یہ الزام بھی ہے کہ "مولانا صدر الدین صاحب نے قاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ الخ والی آیت میں تیسیر القرآن کے اندر وہی بات لکھی ہے جو میں کہتا ہوں، مگر میری تحریر کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے مخالف موقف اختیار کر لیا، کیونکہ جماعت اسلامی کی بات ثابت کرنے کے لئے ایسا کرنا ضروری تھا" (ص۱۲۹) میں نے اس آیت کے سلسلے میں خاں صاحب کی تحریر کا جواب دیتے ہوئے جو کچھ لکھا تھا وہ تو ان کی کتاب کے صفحہ ۹۷ پر درج ہے اس لئے آپ اسے خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ لیکن تیسیر القرآن میں جو کچھ میں نے لکھا تھا اس کا چونکہ اس کتاب میں حوالہ درج نہیں ہے کہ آپ اسے ملاحظہ فرماکر میری دونوں عبارتوں کا مقابلہ کر سکیں اور اس طرح خاں صاحب کے اس الزام کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں ہوں اس لئے میں آپ کی واقفیت کے لئے اسے یہاں پورے کا پورا نقل کئے دیتا ہوں۔ میں نے تیسیر القرآن میں اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "دین کے معنی اطاعت کے ہیں دین اللہ کے لئے ہو جائے، یعنی خدا کی اطاعت و بندگی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہ جائے۔ ایک انسان کو اس کا یہ سب سے پہلا بنیادی حق حاصل ہو جائے کہ وہ بے خوف وخطر اپنے رب کی بندگی کر سکے۔ دو لفظوں میں اسلامی جنگ —— جہاد —— کا منشا صرف اسی قدر ہے۔ باز آجانے سے مراد کفر و شرک سے باز آجانا ہے۔ دوسرے منکرین قرآن میں سے تو ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھنا ہے رکھے اور جس کی چاہے پوجا کرے یا نہ کرے، اس گمراہی سے نکالنے کے لئے صرف اسے نصیحت اور فہمائش کی جا سکتی ہے لڑائی نہیں، لیکن مشرکین عرب کے لئے دو ہی راہیں تھیں، یا تو ایمان لائیں یا پھر جنگ قبول کریں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین عرب وہ لوگ تھے جن پر توضیح حق براہ راست نبیؐ کے ذریعے ہوئی جس میں نقص کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لئے ان کا ایمان لانے پر آمادہ نہ ہونا معنی یہ رکھتا ہے کہ ان کے اندر سے بصیرت اور قبولِ حق کی آخری رمق بھی ناپید ہو چکی ہے اور ان پر آخری حد تک اتمام حجت ہو چکا ہے۔ اب ان کا حال اس سڑے ہوئے عضو کا سا ہے جس کے شفایاب ہونے کا کوئی امکان نہیں بلکہ اُلٹا اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ دوسرے تندرست اعضاء کو بھی اپنے زہر سے متأثر کر دے گا۔ ایسی حالت میں جسم انسانی کی سچی بہی خواہی یہی ہے کہ اس سڑے ہوئے عضو کو کاٹ کر پھینک دیا جائے۔ دوسرے منکرین قرآن کا حال یہ نہیں۔ اس لئے ان کا حکم بھی مشرکین عرب سے مختلف ہونا چاہیئے تھا۔"

آیت زیر گفتگو کے متعلق میری دونوں تحریریں اب آپ کے سامنے ہیں۔ غور کر کے مطلع فرمائیں کہ ان دونوں میں تفصیلات سے قطع نظر فی الواقع کیا تضاد ہے اور میں نے جماعت کی بات ثابت کرنے کے لئے اپنا موقف کیا اور کس طرح بدل لیا ہے؟ میری ناقص فہم تو اس تضاد کے پالینے سے یکسر عاجز ہے۔ میں نے خاں صاحب کے جواب میں اس آیت سے استشہاد کرتے ہوئے جو یہ لکھا تھا کہ "رسول اس پر مامور ہے اور اتباع رسول کا یہ فرض ہے کہ اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ لوگ اسلام کا اقرار نہ کر لیں اور دین سارے کا سارا اللہ ہی کے لئے نہ ہو جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ خالص اسلامی اسٹیٹ قائم نہ ہو جائے ...... الخ" اس کے اندر میں نے رسولؐ اور پیروانِ رسولؐ کے مشن کے (یعنی ان کے اس آخری نشانے کے جس تک انھیں پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا)

باب میں جو بات کہی ہے وہ تیسیر القرآن والی عبارت کے کس فقرے کی ضد ہے اور کس طرح ؟ واضح رہے کہ اس آیت کو میں نے اپنے مضمون میں ایک دوسری آیت ھوالذی ارسل رسولہ الخ پر بحث کے ضمن میں پیش کیا تھا۔ خاں صاحب کا دعویٰ یہ تھا کہ " آیت کی یہ تشریح (جو جماعت اسلامی کرتی ہے) بالکل بے محل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسکا وہ مطلب کبھی نہیں ہو سکتا جو اوپر بیان کیا گیا ہے اور یہ آیت کبھی قرآن کی وہ آیت ہو سکتی جس سے رسول یا رسول کی تبعیت میں امتِ مسلمہ کا نصب العین اخذ کیا جائے " میں نے اس آیت قاتلوھم الخ کو نیز ایک حدیث امرتُ ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ کو ان کے اس دعوے کے جواب میں ضمناً پیش کیا تھا اور یہ عرض کیا تھا کہ اس آیت اور حدیث کی رو سے نبی اس وقت تک لڑتے رہنے پر مامور کیا گیا ہے جب تک کہ لوگ اسلام قبول نہ کر لیں تو یہ بات کیسے کہی جا سکتی ہے کہ نبی کا مشن صرف بات پہنچا دینے تک محدود تھا۔ دین کو غالب اور قائم کرنا نہیں تھا۔ قاتلوا اور حتّیٰ کے الفاظ۔ اسی طرح امرتُ اور حتّیٰ کے الفاظ اس خیال کی کھلی ہوئی تردید کرتے ہیں۔ غرض یہاں خاں صاحب کے اور میرے درمیان جو نقطۂ خیال زیرِ بحث تھا وہ صرف یہ تھا کہ نبی کا مشن اور اس کی غایت کار کیا تھی ؟ وہ پوری بات کیا تھی جس کے لئے وہ مامور کیا گیا تھا ؟ آیا لوگوں کو صرف امر حق سے آگاہ کر دینا ہی یا اس سے آگے بڑھ کر کوئی عملی انقلاب برپا کر دینا بھی ؟ یہ بات یا اس طرح کی کوئی اور بات سرے سے زیرِ بحث تھی ہی نہیں کہ قاتلوھم میں " ھم " ضمیر کا مرجع کیا ہے ؟ اور الناس سے مراد کون لوگ ہیں ؟ صرف مشرکین عرب یا پوری دنیا کے لوگ ؟ کیونکہ یہ مرجع اور مراد جو بھی ہوں مسئلہ زیرِ بحث پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

—— آخر میں پھر گذارش ہے کہ تضاد بیانی کا اور مخالف موقف اختیار کر لینے کا یہ الزام میری سمجھ میں بالکل نہیں آسکا ہے —— اگر آپ سمجھ سکے ہوں تو مجھے بھی سمجھا کر ممنون فرمائیں

(۶) اس قضیے کی ایک شق یہ بھی ہے کہ میں نے خاں صاحب کے مختصر جوابی تبصرے پر ان کے اصرار کے بعد جو ایک تنقید کی تھی وہ ان کے نزدیک اتنی بے وزن تھی کہ انکے بقول انھوں نے " اس کو سننے کے بعد اپنے جی میں کہا کاش صدر الدین صاحب نے اس کا ذکر نہ کیا ہوتا ' کیونکہ اس کا ذکر نہ کرنا انکے حق میں زیادہ اچھا تھا " (ص۱۲۴، ۱۲۵) یعنی میری یہ اکلوتی تنقید بھی سرے سے تنقید کہلانے کی مستحق ہی نہیں تھی، بلکہ صرف میری قابلِ بے بسی یا قابلِ شرم جہالت کا ایک مظاہرہ تھی اور اگر تنقید تھی بھی تو کچھ ایسی ہی جیسے کوئی شخص خانصاحب کی اس کتاب پر یہ تنقید کر کے اسے یکسر لغو قرار دیدے کہ انھوں نے ٹائٹل پیج پر اپنا نام اوپر اور کتاب کا نام نیچے لکھوا دیا ہے ! مجھے یہاں پھر اپنی اس کوتاہ نظری کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں خاں صاحب کے اس ارشاد کی لم بالکل نہیں پا سکا بلکہ اسے پڑھ کر الٹا حسرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ بہر کیف اب آپ کی فرمائش کی تعمیل میں اس مسئلے کی بھی پوری وضاحت درج کئے دیتا ہوں :-

خاں صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا مودودی کی تقریر " شہادتِ حق " کا ایک اقتباس نقل کر کے اس کے سلسلے میں اعتراض کیا تھا کہ " یہ نہ صرف شاعری ہے بلکہ خدا اور اس کے تمام رسولوں پر زبردست الزام بھی ہے —— اگر شہادتِ حق یہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی رسول نے شہادت کا حق ادا نہیں کیا ۔۔۔۔ ان معنوں میں معلوم انبیاء میں سے کسی ایک نے بھی اپنی قوم پر حجت تمام نہیں کی "۔ (یہ اقتباس اور یہ اعتراض کتاب کے ص۷۷/۱ تا ص۷۷/۲ پر درج ہے۔ وہاں تفصیل ملاحظہ فرمالیں) اس اعتراض کا بڑا تفصیلی جواب دیتے ہوئے میں نے عرض کیا تھا کہ " مخاطب پر حجت تمام کر دینے کا جو مفہوم اور منشا ہے وہ قبل ہجرت کی ان دعوتی مساعی کے نتیجے میں تا حد کمال پورا ہو جاتا تھا۔ اتمام حجت کا مفہوم و منشاء یقیناً اور بداہتہً اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مخاطب کے سامنے اسلام کی حقانیت کو اس طرح آنکھوں دیکھی حقیقت بنا دیا جائے کہ اس کے بعد اس کے بدستور منکرِ اسلام بنے رہنے کی کوئی معقول

وجہ تو کیا کوئی معقول عذر بھی باقی نہ رہ جائے۔ انبیاء علیہم السلام اپنی قبل از ہجرت کی زندگی میں حق کو ایسا ہی آئینہ صفت روشن کر چکے ہوتے تھے اور اب بھی جو لوگ اسے نہ مانتے تھے ان کے ایمان نہ لانے کی وجہ یہ نہ ہوتی تھی کہ ابھی امرِ حق ان پر واضح نہ ہو سکا ہوتا تھا، بلکہ ۔۔۔۔۔ ان کا حال اب یہ ہو چکا ہوتا تھا کہ اگر ہزاروں معجزوں کے دلائل قاہرہ ان کے سامنے پیش کر دیئے جائیں تو بھی اپنی جگہ سے حرکت نہ کر سکیں گے (ولو اننا الخ) حتیٰ کہ قیامت کا نظارہ کر چکنے اور دوزخ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جل چکنے کے بعد بھی انھیں یہ دنیوی زندگی دوبارہ دے دی گئی تو ان کا رویہ پھر بھی یہی رہیگا لیکن کیا امتِ مسلمہ کی مخاطب قوموں کے معاملوں کو بھی آپ یہی حیثیت دے سکتے ہیں؟ کیا اگر ہم نے اور آپ نے اعلان واسرار کے ذریعے ان کے سامنے اسلام کی بات پہنچا دی اور اس کے برحق ہونے پر دلائل فراہم کر دیئے تو ان پر اس طرح کی حجت تمام ہو جائے گی؟ شاید یہ ایک ایسی بات ہو گی جس کا قائل اور مدعی بننے کے لئے دنیا کی نہ کوئی خوش فہمی اجازت دے سکتی ہے نہ کوئی ہٹ دھرمی۔ اس پائے کی حجت تو اس وقت بھی قائم ہو جانی ناممکن ہے جب امت وہ اعلیٰ ترین شہادت بھی دنیا کے سامنے پیش کر دے جسے صاحبِ مضمون نے شاعری اور یوٹوپیا قرار دیا ہے"۔ خانصاحب نے اپنے جوابی تبصرے میں میرے اس جواب کا بھی رد فرمایا تھا اور وہ اس طرح کہ میری اس عبارت کا ایک ناقص اقتباس دے کر میری خوب خوب تجہیل فرمائی تھی۔ اس اقتباس کے ناقص ہونے کی شکل یہ تھی کہ ایک طرف تو میری مذکورہ بالا عبارت میں سے صرف زیرِ خط جملوں کو انھوں نے لیا تھا اور اگلے پچھلے سب حصے شاید غیر ضروری سمجھ کر حذف کر دیئے تھے (چنانچہ اب اسے اسی حذف شدہ شکل میں کتاب کے اندر شائع بھی کر دیا گیا ہے) دوسری طرف ان جملوں کو بھی انھوں نے نقل ناقص شکل میں کر دیا تھا، اور "اس طرح کی" کے الفاظ درج نہیں کئے تھے۔ جس کے بعد قدرتی طور پر میرا استدلال ہی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک گفتگو کے دوران جب انھوں نے مطالبہ کیا کہ میں ان کے جوابی تبصرے پر پھر اظہار خیال کروں تو میں نے اسے لاحاصل قرار دیتے ہوئے انکار کر دیا اور اس کی وجوہ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ "آپ نے تو اپنے اس تبصرے میں جماعت اسلامی کے معاند مفتیانِ کرام کا طریقہ بھی اختیار کئے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ میری عبارتوں کو غلط انداز میں نقل کر کے ان کا مدعا کچھ سے کچھ بنا لیا ہے"۔ اس پر انھوں نے فرمایا ایسے مقامات کی نشان دہی کرو۔ لیکن اس کے لئے میں اس وقت آمادہ نہ ہو سکا۔ بعد میں وہ میرے پاس پھر تشریف لائے اور نشاندہی کے لئے دوبارہ فرمایا تو میں نے ایسے دو مقامات کی نشاندہی کر دی۔ ان میں سے ایک مقام یہ بھی تھا جو اس وقت زیرِ گفتگو ہے۔ فرمایا اچھا اس کو دیکھوں گا۔ اس کے بعد میرا یقین تھا کہ خاں صاحب کم از کم اس مسئلے میں اپنے تردیدی تبصرے کی غلطی محسوس کر لیں گے۔ مگر میرا یہ یقین میری خوش فہمی ثابت ہو کر رہ گیا جب کچھ عرصے بعد امیر جماعت کے نام اپنے ایک گرامی نامے میں موصوف نے یہ فرمادیا کہ "۔۔۔۔ اولاً تو اس لفظ (اس طرح کی) کے چھوٹنے سے اصل مدعا پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کے علاوہ اس کے چھوٹنے کی ذمہ داری مجھ سے زیادہ صاحبِ تحریر پر ہے۔۔۔۔ ۔۔۔ یہ تنقید اتنی بے وزن ہے کہ اس کے سننے کے بعد میں نے اپنے جی میں کہا کاش ۔۔۔۔ الخ"" موصوف کے اس ارشاد کا مطلب میری ناقص فہم کے مطابق تو واضح طور پر یہی ہے کہ غیر نبی بھی لوگوں پر حق کی شہادت دے کر اسی طرح کا اور اسی پائے کا اتمام حجت کر سکتا ہے جس طرح کا اور جس پائے کا اتمام حجت نبی اپنی خداداد صلاحیت، اپنی بے داغ سیرت، اپنے دل نشین استدلالات اپنی پُرسوز مخلصانہ نصیحتوں، اپنی حکیمانہ تفہیموں، اپنی مخصوص تائیدِ غیبی اور اپنے معجزوں کے نتیجے میں انجام دیا کرتا ہے اور اگر میرے جیسا کوئی شخص اس کو ناممکن باور کرتا ہے تو وہ ان کی نگاہ میں قابلِ رحم جہالت میں مبتلا ہے۔ اب آپ غور فرمالیں کہ موصوف کے ارشاد کا جو مدعا میں سمجھ رہا ہوں وہ صحیح ہے یا غلط؟ اور اگر صحیح ہے تو کیا میری مذکورہ بالا تنقید فی الواقع اتنی ہی بے وزن تھی جتنی کہ خاں صاحب فرما رہے ہیں؟ اور کیا حقیقت یہی ہے کہ میری عبارت کا ایسا سر بریدہ وپا تراشیدہ اقتباس

پیش کرنا اور پھر اس کے اندر سے بھی "اس طرح کی" کے الفاظ کا چھوڑ دیا جانا اصل مدعا پر کوئی اثر نہیں ڈالتا؟ اور کیا غیر انبیاء کا اتمام حجت انبیاء کے اتمام حجت کا ہم پایہ ہو سکتا ہے؟ اگر ہو سکتا ہے تو میں کسی تکلف کے بغیر اپنی اس جہالت کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں اب تک اسے مسلمات کے خلاف سمجھتا رہا ہوں —

(۷) اس قضیہ کی ایک شق خانصاحب کا وہ جوابی تبصرہ بھی ہے جو انھوں نے میرے مضمون پر کیا تھا اور جس کا بیشتر حصہ کتاب کے صفحہ ۲۴۲ تا ۲۶۱ پر انھوں نے شائع بھی کر دیا ہے۔ آپ کی مطلوبہ وضاحت کا تقاضا ہے کہ اس تبصرے کے سلسلے میں بھی دو ایک باتوں پر روشنی ڈالدوں:-

"سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خاں صاحب نے اپنے اس جوابی تبصرے کو من وعن شائع نہیں کیا ہے نہ صرف یہ کہ بعض مستقل بحثیں حذف کر دی ہیں، بلکہ جو بحثیں شائع فرمائی ہیں وہ بھی جوں کی توں نہیں ہیں اور ان کے اندر سے جا بجا جملے نکال دیئے گئے ہیں —

دوسری بات یہ ہے کہ اس تبصرے میں آپ کو موصوف کے مفصّل تنقیدی جوابات کے ساتھ میرے مضمون کے (جو تقریباً ۲۵ فل اسکیپ صفحات کا تھا) صرف چند سطری اقتباسات ملیں گے۔ ان اقتباسات میں سے بعض اپنے سیاق سباق سے اس طرح کٹے ہوئے ہیں کہ کسی شخص کے لئے جس کے سامنے میرا پورا مضمون نہ ہو، یہ سمجھنا ممکن ہی نہیں کہ میں نے حوالے میں دی ہوئی یہ سطریں کس بحث کے سلسلے میں اور خانصاحب کے کس نکتے کے جواب میں لکھی تھیں؟ اس صورتِ حال کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کوئی شخص ان تنقیدوں کی صحت پر "ایمان بالغیب" تو ضرور لا سکتا ہے جو خاں صاحب نے میری معروضات پر فرمائی ہیں، لیکن ان کا غیر جانبدارانہ جائزہ ہرگز نہیں لے سکتا (مثال کے لئے اتمام حجت والی بحث کا وہی اقتباس ملاحظہ فرما لیجئے جس کا ذکر ابھی اوپر کر چکا ہوں اور جس کا ضروری سیاق وسباق بھی میں نے نقل کر دیا ہے)۔

پھر اقتباسات اور حوالے پیش کرنے کے معاملے میں خاں صاحب کا یہ انداز صرف اسی تبصرے تک محدود نہیں ہے، بلکہ ان مقامات پر بھی انھوں نے یہی رویہ اختیار کیا ہے جہاں اپنی کتاب کے اندر حواشی میں میرا نام لئے بغیر میرے مضمون کے جستہ جستہ ٹکڑے دے کر ان کی تنقید و تردید فرمائے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر صفحہ ۳۵۶ تا ۳۵۹ دیکھئے۔ جہاں میرے مضمون کا ایک اقتباس اور پھر اس پر خاں صاحب کی تنقید درج ہے۔ اس اقتباس اور تنقید کو پڑھکر آپ کو یہی خیال گذرے گا کہ میں نے اپنی اس بحث میں جس سے کہ یہ اقتباس لیا گیا ہے مذکورہ احادیث سے اہل ایمان کے لئے نظام اسلامی کے قیام کا علی الاطلاق وجوب ثابت کیا ہوگا جس کا کہ خاں صاحب نے رد فرمایا ہے۔ مگر صورتِ واقعہ یہ بالکل نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے اور وہ یہ کہ خانصاحب نے اپنے مضمون میں آیت شرع لکم من الدین الخ کا یہ مفہوم و مدعا بیان کرتے ہوئے کہ اس آیت میں صرف بنیادی اور شخصی احکام دین کی اقامت کا حکم ہے۔ یہ دعویٰ کر دیا تھا کہ "قرآن میں دوسرے مقامات پر دین قائم کرنے والوں یا دین پر قائم رہنے والوں کی جو تصویریں دی گئی ہیں ان سے بھی آیت کا یہی مفہوم ثابت ہوتا ہے" (بالفاظ دیگر قرآن میں اقامتِ دین کا لفظ ہر جگہ اسی محدود معنی میں استعمال ہوا ہے) اور اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے آیت لَيْسُوْا سَوَاءً مِنْ اَھْلِ الْکِتَابِ اُمَّۃٌ قَائِمَۃٌ الخ پیش فرمائی تھی۔ میں نے ان کے خاص اسی دعوے کی تردید میں وہ بحث لکھی تھی جس سے کہ زیر گفتگو اقتباس تعلق رکھتا ہے اور یہ بتا کر کہ خود اس آیت میں اُمّۃ قائمۃ کے معنے پورے دین کے پیرو گروہ کے ہیں نہ کہ صرف چند بنیادی اُمورِ دین ہی کے پیرو کے۔ چند ایسی آیاتِ قرآنی اور احادیث رسول پیش کی تھیں جنمیں اقامتِ دین یا قیامِ دین کی دینی اصطلاح استعمال ہوئی ہے اور پھر یہ عرض کیا تھا کہ ان نصوص کتاب وسنت میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جس میں اقامتِ دین کا مفہوم صرف ایمانیات اور عبادات وغیرہ بنیادی اور شخصی احکام دین ہی

تک محدود ہو، بلکہ ہر ایک میں پورے دین کی پیروی کا مفہوم موجود ہے اور اس میں دین کے اجتماعی اور سیاسی احکام کی پیروی کا تصور خاصا ابھرا ہوا ہے۔ اندازہ لگائیے کہ خاں صاحب نے میرے مضمون کا جو اقتباس دیا ہے اور اس پر تنقید فرما کر قارئین کو میرے نقطۂ نظر کے بارے میں جو تصور دینا چاہا ہے وہ کیا ہے اور اصل حقیقت کیا ہے؟ میں تو ان آیات و احادیث کو اس دعوے کے رد میں پیش کر رہا ہوں کہ اقامتِ دین کا لفظ قرآن میں جہاں بھی استعمال ہوا ہے صرف اصل اور بنیادی امور دین کی اقامت کے محدود مفہوم ہی میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ خود اس اقتباس کے اندر بھی "اقامت دین کے مفہوم کی وہ محدودیت الخ" کے الفاظ اس حقیقت کی گواہی دینے کے لئے موجود ہیں مگر خاں صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے ان احادیث سے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ "اہل ایمان کا مشن یہ ہے کہ وہ زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی شعبوں کو بدل کر دنیا میں ایک مکمل اسلامی حکومت قائم کریں" — ٹھیک یہی حال اس اقتباس کا اور اس پر خاں صاحب کی کی ہوئی تنقید کا ہے جو اس کتاب کے صفحہ ۳۶۵ تا ۳۶۷ پر درج ہے مگر آخر میں یہاں کن کن باتوں کی وضاحتیں پیش کروں؟

الغرض یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آرہی ہے کہ خانصاحب نے میرے مضمون کے اقتباسات دینے میں یہ رویہ اختیار کرنا کیسے مناسب سمجھا۔ ناقص یا سیاق و سباق سے کٹے ہوئے اقتباسات کا دینا تو کسی شائع شدہ مضمون کے بارے میں بھی قابل اعتراض بات ہوا کرتی ہے، حالانکہ ایسے مضامین کے سلسلے میں ناظرین کے لئے یہ سہولت موجود رہتی ہے کہ وہ انھیں حاصل کر کے ان کے دیئے ہوئے اقتباسات کا جائزہ لے لیں اور ان کے پورے سیاق و سباق کو دیکھ کر ان کے غلط یا صحیح ہونے کا حال معلوم کر لیں، پھر یہ انداز کسی غیر مطبوعہ مضمون کے بارے میں کس طرح صحیح ہو سکتا ہے جس کو حاصل کر کے ناظرین کے لئے اس طرح کا جائزہ لے لینے کی کوئی سہولت موجود نہیں ہوتی۔ ایسی حالت میں کیا خاں صاحب کے لئے صحیح بات صرف یہی نہیں تھی کہ وہ اپنی کتاب میں میرے مضمون سے کوئی تعرض نہ کرتے اور اپنے طور پر جو چاہتے دادِ تحقیق دیتے یا پھر میرا پورا مضمون جوں کا توں نقل کر کے اس پر تنقید کرتے۔ بلا شبہ میں نے ان سے اپنا مضمون شائع کرنے کی درخواست کی تھی۔ مگر یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ انھوں نے میری اس درخواست کو کوئی اہمیت نہیں دی اور مختلف طریقوں سے اس کے من مانے اقتباسات لے کر اپنی تنقیدوں کے ساتھ شائع فرما دیا ہے۔ گویا میری درخواست کو انھوں نے صرف رد ہی نہیں کیا بلکہ "بری طرح" رد کر دیا۔

(۸) اس قضیے کا ایک جزء خاں صاحب محترم کا وہ اعتراض اور الزام بھی ہو سکتا ہے جو انھوں نے کتاب کے صفحہ ۵۰۸ و ۵۰۹ پر درج فرمایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "وہ اپنے تصور دین کو پچھلے کئی سال سے اپنے مضامین میں پیش کرتے رہتے ہیں۔ ان مضامین کو ہمیشہ پسند کیا گیا۔ مگر اب یہ "تعبیر کی غلطی" کے عنوان سے میں نے جو تحریر مرتب کی ہے اس کو دیکھ کر وہی لوگ سخت متوحش ہو گئے جو اس سے پہلے میری تحریروں کو اپنے دل کی آواز کہا کرتے تھے" الخ

موصوف نے جس عمومی انداز میں یہ بات فرمائی ہے اس سے یہ سمجھا جانا غیر اغلب نہیں کہ سارے افراد جماعت جن میں میں بھی شامل ہوں خاں صاحب کے مضامین کے بارے میں ایسا تصور رکھتے رہے ہیں۔ اس لئے آپ کی وضاحت طلبی کا تقاضا پورا نہ ہو گا اگر اس خیال کی تردید نہ کر دوں، نہ صرف تنہا میں بلکہ دوسرے بہت سے اور رفقاء بھی ان مضامین کو اپنے دل کی آواز سمجھنے کے بجائے انھیں قابلِ اعتراض سمجھتے رہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ خود خاں صاحب بھی اس حقیقت سے بے خبر نہ ہوں گے خصوصاً میرے بارے میں تو انھیں بہت پہلے سے یہ بات پہونچ چکی تھی کہ میں ان کے مضامین میں نظریاتی انحراف پا رہا ہوں جب امر واقعہ یہ تھا تو انھیں یہ دعویٰ اتنے عموم کیساتھ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ پھر جہاں تک ان مضامین کو پسند کرنیوالے رفقاء کا سوال ہے ان کی پسندیدگی کی وجہ بھی وہ نہیں تھی جو خاں صاحب نے اپنے حسب منشا سمجھ رکھی ہے بلکہ کچھ اور تھی۔ یہ در اصل کرشمہ تھا اس حسن ظن اور حسن اعتماد کا جو یہ لوگ خانصاحب کے بارے میں ایک رفیق جماعت ایک رکن شوریٰ اور ایک رکن شعبۂ تصنیف ہونے کے ناطے رکھتے تھے نفسیاتی طور پر انھیں یہ گمان بھی نہ گذرا ہوگا کہ جماعت کا ایک رکن شوریٰ

(باقی صفحہ ۶۶ پر)

محب الدین ہاشمی

مدیر صدق جدید کا تقویٰ

مولانا دریابادی کے ارشاد گرامی کا جائزہ جس شرح وبسط کے ساتھ پچھلے شمارے میں لیا جاچکا ہے اس کے بعد اس موضوع پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں تھی۔ علاوہ ازیں ان کے "المیۂ پاکستان" پر بھی اسی الیشوع میں راقم الحروف "المیۂ اسلام" پیش کر رہا ہے۔ اس کے باوجود بعض اور اہل نظر کا تأثر بھی قارئین کے سامنے آجائے تو کوئی حرج کی بات نہیں۔ (عامر عثمانی)

ہمارے ہندوستان جنت نشان میں حضرت مولانا عبدالماجد دریابادی کی ذات گرامی بڑی باغ وبہار ہے اور ان کا ہفت روزہ "صدق جدید" بہت ہی دلچسپ اخبار ہے۔ راقم سطور کا حال یہ ہے کہ اس اخبار کو اول سے آخر تک پڑھتا ہے اور مزے لے لے کر پڑھتا ہے۔ فاضل مدیر صدق کی تحریر کا کیا کہنا۔ صاحب طرز ادیب ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے، شستہ لکھنوی زبان، طنز کے تیر، تعریض کے نشتر۔ پڑھنا شروع کیجئے تو ختم کئے بغیر چین نہ آئے ــــ اس گھڑی حضرت کے مزاج یا ان کی تحریر کی تمام خصوصیات کا جائزہ لینا مقصود نہیں بلکہ صرف مولانا مودودی کے بارے میں حضرت کی سراپا انصاف روش کا تذکرہ مقصود ہے۔ پاکستان کے صدارتی انتخاب میں مودودی صاحب نے مس فاطمہ جناح کی تائید کیا کی کہ ہندوستان و پاکستان کی وہ تمام توپیں اپنے آتشیں گولے پھینکنے لگیں جن کے بڑے بڑے دہانے ہمیشہ ان کی طرف منہ کھولے موقع کی تاک میں رہتے ہیں۔ اس دفعہ کے معرکے میں اول نمبر حاصل کرنے والوں میں فاضل مدیر صدق کا نام نامی ہندوستان کے اندر سب سے آگے ہے۔ صدق جدید نے مودودی صاحب کے خلاف ایک مہم چلائی یہاں تک کہ المیۂ پاکستان لکھ کر دینی لحاظ سے انکی موت کا فتویٰ بھی صادر فرمایا، لیکن پھر بھی مہم ختم نہیں ہوئی۔ سلسلہ جاری ہے۔ دینی لحاظ سے موت کا یہ فتویٰ کس جرم میں صادر فرمایا گیا ہے بس صرف یہی ایک بات اس مختصر تحریر میں مجھے دکھانی ہے تاکہ فاضل مدیر صدق کا انصاف اور تقویٰ واضح ہوجائے ــــ اس فتوے کو سنتے ہی ذہن مودودی صاحب کے جس جرم کی طرف جائے گا وہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک عورت کے سربراہ مملکت ہونے کی تائید کی اور پاکستان کے مخصوص حالات میں اس کو جائز قرار دیا ذہن ان کے اس جرم کی طرف اس لئے بھی جائے گا کہ پاکستان و ہندوستان کے بہت سے مفتیانِ کرام نے اس جرم کو تحریفِ دین اور ضلال مبین قرار دیا ہے، لیکن مدیر صدق کی بات ہی کچھ اور ہے انھوں نے اس جرم پر اپنا فتویٰ صادر نہیں فرمایا! ہے وہ خود لکھتے ہیں:-

> "عورت کی امارت کے مسئلے تک چنداں مضائقہ نہ تھا۔ اس اجتہادی رائے کو غلط سمجھتا رہا جیسے مولانا کے اور بہت سے اجتہادات کو غلط سمجھتا رہا ہوں۔ اس سے ضرب ان کی دینی شخصیت پر پوری

طرح نہیں پڑ رہی تھی۔"
اس سے اتنی بات تو واضح ہوگئی کہ انکی موت کا فتویٰ اس جرم کی وجہ سے صادر نہیں ہوا، لیکن ایک دوسری بات مبہم رہ گئی، کیونکہ اس عبارت کو پڑھ کر کوئی شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ مدیر صدق عورت کی امارت کو ہر حال میں ناجائز اور غلط سمجھتے ہیں، حالانکہ بات یہ نہیں ہے۔ اسی قضیے کے سلسلے میں وہ ایک سائل کے جواب میں تحریر فرما چکے ہیں کہ شریعت میں اس کی حرمتِ قطعی وارد نہیں ہوئی اور بعض حالات میں عورت کو سربراہ بنانے کی گنجائش ہے تو پھر" اس اجتہادی رائے کو غلط سمجھتا رہا" کا مطلب کیا ہوگا؟ بات مبہم ہے مگر شاید" اس اجتہادی رائے" سے حضرت کی مراد مس فاطمہ جناح کی تائید ہوگی۔ یعنی اگرچہ بعض حالات میں عورت کی امارت کی گنجائش نکل سکتی ہے مگر مس فاطمہ جناح کی صدارت کی گنجائش بالکل نہیں نکلتی۔ یہ راقم سطور کا قیاس ہے۔ صحیح مطلب تو وہی ہوگا جو مدیر صدق کے ذہن میں ہے۔ بہر حال جب اس جرم پر وہ فتویٰ صادر نہیں ہوا تو پھر کس جرم پر صادر ہوا ہے؟ اور کس جرم نے ان کی شخصیت پر پوری ضرب لگائی ہے؟ اوپر جو عبارت نقل ہوئی ہے اس کے بعد وہ تحریر فرماتے ہیں، پڑھیے اور پورے ہوش و گوش سے پڑھیے لکھتے ہیں:۔

"لیکن جب ان کے اس قسم کے فقرے متعدد نقل ہونے لگے تو عقل حیران رہ گئی کہ ان کی کیا تاویل کی جائے کہ" اصل مسئلہ اس وقت جمہوریت کی بحالی کا ہے"۔ اناللہ۔ ان کی زبان و قلم سے اس طرح کے غرق سیاست فقروں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

یہ ہے مودودی صاحب کا وہ جرم جس کی بناء پر مدیر صدق نے ان کی اپنی موت کا فتویٰ صادر فرمایا ہے اور المیۂ پاکستان لکھ کر دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ مولانا مودودی نے وہ جملہ کیا کہا کہ اپنی دینی شخصیت ہی ختم کر دی۔ قبائے امارت کو بے تکلف سیاسی لیڈری کے گون پر نثار کر دیا۔ دینی لحاظ سے رحلت فرما گئے اور مرحوم ہوگئے۔ اب نہ ممتاز عالم دین رہے نہ مفسر قرآن، نہ متکلم رہے نہ اقامت دین کے علم بردار۔ اب وہ صرف ایک سیاسی لیڈر رہ گئے جس طرح اور پارٹیوں کے لیڈر موجود ہیں اور ہر ملک میں نرم و گرم اور رطب و یابس قسم کے لیڈر رہا ہی کرتے ہیں۔

یہ ہے حضرت مولانا عبدالماجد دریا بادی کے انصاف تقویٰ اور بزرگوں کے فیضِ صحبت پر فخر کا نمونہ اور کیسا عجیب و غریب ہے، یہ نمونہ۔

لطف یہ ہے کہ مدیر صدق، مودودی صاحب کے فقرے کو سیاسی فقرہ کہتے ہیں اور فیصلہ ایسا کرتے ہیں جیسے انھوں نے کلمۂ کفر کہدیا ہو جس کی تاویل بھی نہ ہو سکتی ہو اور مزید لطف یہ ہے کہ وہ اپنے شہ پارے میں یہ بھی لکھتے ہیں:۔

" مسئلہ جمہوریت یوں بھی دینی نقطۂ نظر سے بس ایک حقیر سے جزئیہ ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔"

اب قاری حیران ہوتا ہے کہ ابھی تو جمہوریت کا مسئلہ خالص سیاسی مسئلہ تھا بلکہ غرق سیاست تھا اور ابھی وہی مسئلہ دینی جزئیہ بن گیا۔ بہر حال مودودی صاحب کا فقرہ سیاست ہو یا مسئلہ جمہوریت حقیر دینی جزئیہ ہو سوال یہ ہے کہ اسکی بناء پر کسی شخص کو دینی لحاظ سے مردہ قرار دینے کی کوئی حقیر سے حقیر بنیاد بھی موجود ہے؟

مودودی صاحب کے فقرے کا مطلب کیا ہے اس پر تجلّی میں سیر حاصل اور تشفی بخش بحث ہو چکی ہے اس لئے میں اس پر اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھوں گا کہ ان کے فقرے میں" اسوقت" کا لفظ موجود ہے اور اس کی موجودگی میں وہ مطلب لینے کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے جو مدیر صدق نے لیا ہے۔ وہ اس فقرے کے بغیر ہی اپنا فتویٰ صادر کرتے تو بات اتنی بے تکی نہ ہوتی جتنی اب ہے۔

دینی لحاظ سے مولانا مودودی کیا درجہ رکھتے ہیں اس کا حقیقی فیصلہ قیامت میں ہوگا اس لئے اس پر گفتگو بے کار ہے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دینی لحاظ سے ان کے مرحوم ہونے کا فیصلہ اس" زندہ دینی شخصیت" نے کیا ہے جس کی" حق پرستی" مرزا غلام احمد

آنجہانی اور ان کی جماعت کی حمایت کرتی رہتی ہے جبکہ تمام علمائے حق قادیانیوں کے کفر پر متفق ہیں، لیکن یہ حق پرست شخصیت وہ ہے جو انھیں مسلمان قرار دیتی اور ان کی "اسلامی خدمات" کا ڈھنڈورہ پیٹتی رہتی ہے۔ ادھر قریبی زمانے میں مولٰنا اسحاق صاحب سندیلوی کی "مسئلہ ختم نبوت، علم وعقل کی روشنی میں" مطالعہ کر رہا تھا اس کتاب کے حرف آغاز میں ایک جگہ سندیلوی صاحب قادیانیوں کو مسلمان سمجھنے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ایسے لوگوں کو جو اسلام کے کسی ضروری عقیدے کے منکر ہوں (خواہ یہ انکار کسی تاویل ہی پر مبنی کیوں نہ ہو) اسلام میں داخل سمجھنا خود اسلام پر ایک اتہام وبہتان اور ظلم کے مرادف ہے۔" صلا

اس عبارت کی روشنی میں مدیر صدق کے موقف پر غور کیجئے۔ سندیلوی صاحب ایک جگہ پھر لکھتے ہیں:-

"تعجب خیز ہے طرز عمل ان حضرات کا جو صحابۂ کرام رضؓ کے اس طرز عمل سے واقف ہوتے ہوئے بھی قادیانیوں کی حمایت فرماتے رہتے ہیں اور انھیں مسلمان کہتے ہیں حد یہ ہوگئی کہ یہ حضرات خود مرزا صاحب قادیانی کو باوجود ان کے کھلے ہوئے دعوۂ نبوت کے دائرۂ اسلام میں داخل سمجھتے ہیں اور اس کے لئے ان کی طرف سے عجیب وغریب تاویلات کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں یہ طریقہ صحابۂ کرامؓ کے مندرجہ بالا اجماعی مسلک کے خلاف ہونے کے علاوہ آیت کریمہ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا کے بھی صراحۃً مخالف ہے۔" صلا

کیا آپ سمجھے کہ "ان حضرات" سے مراد کون ہیں؟ حضرت مولٰنا عبدالماجد دریابادی یا کم سے کم ان حضرات میں حضرت کو بڑا اونچا مقام حاصل ہے — ایسے حضرت نے جس وقت مودودی صاحب کی دینی شخصیت کو مجروح کرنے کے لئے المیۂ پاکستان لکھا ہوگا تو شیطان اور اس کی ذریات میں کیسا کیسا جشن مسرت نہ ہوا ہوگا۔

خط مولٰنا صدرالدین۔ از صفحہ ۶۳

اور رکن شعبۂ تصنیف جو کچھ کہہ رہا ہے اس میں جماعت کی دعوت اور نصب العین سے کوئی انحراف بھی ہو سکتا ہے۔ اس فطری حسن ظن اور حسن اعتماد کا فطری تقاضا یہی تھا کہ لوگ بالخصوص وہ لوگ جو علم وتفکر کی زیادہ گہری نظریں نہیں رکھتے ان مضامین کو چوکنّے ذہن کے بجائے بھولے پن کیساتھ پڑھیں۔ ان کا تنقیدی جائزہ لینے کا خیال ہی نہ کریں اور جہاں کہیں ان کو کوئی کھٹک محسوس بھی ہو تو فوراً کسی تاویل کے ذریعہ اپنے کو مطمئن کر کے آگے بڑھ جائیں۔ خاں صاحب کو اپنے ساتھیوں کے اسی حسن ظن اور بھولے پن سے فائدہ پہنچا اور اب وہ اپنے اس حسن ظن اور بھولے پن کا بدلہ بجا طور پر یہ پارہے ہیں کہ مجرموں کے کٹھہرے میں لا کھڑے کئے گئے ہیں!

میرا خیال ہے کہ یہ وضاحت آپ کے لئے کافی ہوگی تاہم اب بھی اگر کچھ امور محتاج وضاحت رہ گئے ہوں تو تحریر فرمائیں، انشاء اللہ ان کی وضاحت بھی کر دی جائیگی۔

والسلام، صدرالدین

منقول فاران

از:- محمد نواز ایم اے

تصوّرِ دین

دین کا تصور کوئی چیستاں نہیں جسے بغیر فلسفہ و کلام کی مدد کے سمجھا نہ جاسکے بلکہ اس کا مجموعی نظام ایسے صاف و سادہ طریق سے مرتب ہے کہ ایک عامی بھی بیک نظر اس کی ہیئت کو سمجھ سکتا ہے۔ علم کلام اور عجمی تصوف کی باریکیوں اور پیچیدگیوں میں اگر کسی کا ذہن اُلجھا ہوا نہ ہو تو دین کا مجموعی تصور نہایت سادہ اور آسانی سے سمجھ میں آنے والا ہے۔ اس کے عقائد، عبادات اور اخلاقیات کا پورا نظام اتنا واضح اور روشن ہے اور فطرتِ انسانی کے اس قدر قریب ہے کہ اوسط درجے کے ذہن رکھنے والے آدمی کے لئے اس کا جاننا اور سمجھ لینا کچھ زیادہ دقت طلب نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب مولانا مودودی نے دین کا واضح سادہ سا تصور پیش کیا اور اس کے قبول کرنے کی دعوت دی تو سب سے پہلے جو طبقہ اس سے زیادہ متأثر ہوا وہ اُن نوجوانوں پر مشتمل تھا جو کلام و تصوف اور فقہ کی باریکیوں سے ناآشنا تھے۔ معمر بزرگوں میں سے بھی اُن لوگوں نے اس کی طرف لبیک کہی جن کی طبائع قرآن و سنت کی سادگی سے زیادہ مانوس تھیں اور جن کے نزدیک قرآن و سنت کی اہمیت "بقدر نصاب" نہیں تھی بلکہ جو پہلے سے انھیں اپنی زندگی کا وظیفہ بنائے ہوئے تھے۔ پھر جن لوگوں نے مولانا مودودی سے اختلاف کرکے رفاقت کا تعلق منقطع کیا تو ان کے اختلاف کے وجوہ بھی بعض دوسرے تھے، ان میں سے کسی بزرگ نے بھی الّا ما شاء اللہ، مولانا مودودی کے تصورِ دین یا اُن کی پیش کردہ بنیادی دعوت کو غلط قرار نہیں دیا بلکہ اُن میں سے اکثر نے مولانا مودودی کے تصورِ دین اور ان کی بنیادی دعوت سے اتفاق رکھتے ہوئے اور انھیں صحیح سمجھ کر محض طریق کار سے اختلاف کیا یا انھوں نے مولانا مودودی کے بعض اقدامات کو غلط قرار دے کر اُن سے رشتۂ رفاقت توڑا، لیکن محترم وحیدالدین خاں کی کتاب — "تعبیر کی غلطی" — کے مطالعہ کرنے سے پہلی دفعہ یہ بات سامنے آتی ہے کہ مولانا مودودی نے دین کی تعبیر غلط کی ہے۔ ان کا تصورِ توحید اور تصورِ عبادت بھی غلط ہے اور انبیاء کے مشن — اقامت دین — کی جو انھوں نے تشریح کی ہے وہ بھی اُن کی اپنی اختراع ہے کیونکہ اس کی تائید نہ قرآن سے ہوتی ہے اور نہ سنت سے — یہ اختلاف معمولی اختلاف نہیں بلکہ ایک بنیادی اختلاف ہے جن بزرگوں نے اس کتاب کو خوش آمدید کہا ہے اور اپنے جرائد میں اس پر تعریفی تبصرے رقم کرکے اسے عظیم قرار دیا ہے اور جو خرید کر اسے لوگوں میں تقسیم کر رہے ہیں اُن پر یہ بھی ذمہ داری تھی کہ اس سے پہلے وہ اپنے سابقہ موقف میں تبدیلی کا اعلان فرماتے اور اپنی تحریروں اور تقریروں پر خطِ نسخ پھیرتے جو مولانا مودودی کے موقف کی تائید میں ابھی تک زینتِ قرطاس بنی ہوئی ہیں لیکن افسوس کہ ان بزرگوں نے نہ صرف اس پہلو پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ انھوں نے اس طرف بھی غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی کہ محترم وحیدالدین خاں کی جن باتوں کی وہ تائید فرما رہے ہیں خود ان سے دین کا

معروف اور متفق علیہ تصور کتنا محدود ہو گیا ہے۔ قرآن نے اُسکے اندر جو وسعت رکھی ہے سنت نے اُسے جس طرح پوری زندگی کے ایک نظام کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ صحابہ کرامؓ نے اپنے علم و عمل سے اسے جس طرح تشکل کیا ہے محترم موصوف نے اُسے "اصل" اور "تقاضے" کی دو مختلف اکائیوں میں تقسیم کرکے محض اپنی مخصوص ذہنی افتاد کی بنا پر ...... زندگی کے ایک محدود ـــ انفرادی اور روحانی ـــ گوشے میں مرکوز کرنے کی کوشش کی ہے ـــ فرماتے ہیں:۔

● ـــ "دین کی اصل حقیقت خدا سے خوف و محبت اور ولایت و توکل کا پیدا کرنا ہے۔"

● ـــ "دین کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے کے درمیان تعلق کا عنوان ہے...... وہ خدا سے نفسیاتی تعلق کا ظہور ہے۔"

اس بات کے صحیح ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے اور اس کے دین کی غائت اور حقیقت ہونے سے کیسے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن بات وہ بھی غلط نہیں تھی جسے انجیل نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا:۔

"اپنے خدا سے اپنے سارے دل، اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل سے محبت رکھ۔"

لیکن اس غایت اور حقیقت میں عیسائی اتنے گم ہو گئے کہ خود مسیح علیہ السلام کے اس پیغام کو فراموش کر دیا کہ:۔

"تیری بادشاہی آئے تیری مرضی جیسے آسمانوں پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو۔"

پھر زندگی دو خانوں میں تقسیم کر دی گئی ایک خانے میں خدا کو جگہ دی گئی اور دوسرا قیصر کے حوالے کر دیا گیا پھر جو خانہ خدا کو الاٹ کیا گیا تھا اُس کا جو انجام ہوا اُس پر قرآن ان الفاظ میں تبصرہ کرتا ہے ـــ پھر ہم ان کے بعد اور رسولوں کو یکے بعد دیگرے

ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ط وَرَهْبَانِيَّةَ ِۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ج فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ط (حدید)

بھیجتے رہے اور ان کے بعد عیسٰے ابن مریم کو بھیجا ہم نے انکو انجیل دی اور جن لوگوں نے اُن کا اتباع کیا تھا ہم نے ان کے دلوں میں شفقت اور ترحم پیدا کیا اور انھوں نے رہبانیت کو خود ایجاد کر لیا ہم نے ان پر اس کو واجب نہ کیا تھا لیکن انھوں نے حق تعالیٰ کی رضا کے واسطے اس کو اختیار کیا تھا سو انھوں نے اس کی پوری رعایت نہ کی سو اُن میں جو جو ایمان لائے ان کو ان کا اجر دیا اور زیادہ ان میں سے نافرمان ہیں

❊ ❊ ❊ ❊

قرآن کے اس بیان کا ایک مفہوم تو وہ ہے جو مندرجہ ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے لیکن ابن کثیر نے اس کے ساتھ ایک دوسرا مفہوم لکھ کر اس کے مطلب کو اور واضح کر دیا ہے:۔

"ہم نے ان پر اس "رہبانیت" کو واجب نہیں کیا تھا۔ ہاں ہم نے اُن پر اللہ کی رضا واجب کی تھی یہ اسے نباہ نہ سکے، جس طرح چاہیئے تھا اسپر نہ جمے۔ پس دوہری خرابی آئی، ایک اپنی طرف سے خدا کے دین میں نئی بات گھڑنے سے اور دوسری اُس پر قائم نہ رہنے سے۔"

اسلام میں رہبانیت حرام قرار دی گئی ہے اس لئے یہ سیدھی راہ سے تو دین میں داخل ہو نہیں سکتی مگر یہ مختلف دل خوش کن اصطلاحات کے جلو میں آنے کی کوشش کرتی ہے کبھی عجمی افکار کا رنگ لیکر آتی ہے کبھی روحانیت وغیرہ کا حسین اور دلفریب فلسفہ لیکر پہنچتی ہے ـــ پھر بد قسمتی سے کچھ اور تاریخی اسباب نے زندگی کے اعتقادی، روحانی اور مذہبی شعبے کو سیاسی، معاشی اور تمدنی شعبے سے الگ کر دیا ہے اور ان دونوں کا ارتقاء کئی صدیوں سے الگ الگ ہوتا چلا آیا ہے انفرادی زندگی کی رہنمائی ایک طبقہ کو حاصل رہی ہے اور اجتماعی اور سیاسی زندگی کی قیادت ایک دوسرا طبقہ کرتا آیا ہے[1]۔ اس تاریخی پس منظر سے

[1] تفصیل کیلئے ترجمان القرآن ستمبر ۶۳ء کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں

رہبانیت پسند ذہن کو تقویت ملتی ہے اس لئے جب کبھی زندگی کے کثیر الاطراف شعبوں کو باہم مربوط کرکے ایک کُل کی حیثیت سے سامنے لایا جاتا ہے تو انفرادیت پسند ذہن کو زندگی کی اس حقیقی صورت کو پہچاننے میں اکثر دھوکا ہوتا ہے ان کے نزدیک دین محض "حیاتی" اور "قلبی" تعلق کا عنوان بن کر رہ جاتا ہے اور زندگی کے خارجی تعلقات اور اس کے حقوق و فرائض کا پورا نظام محض "تقاضا" بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور پھر وہ اپنی فکری الجھن کو معقول و مدلل بنانے کے لئے "اصل" اور "تقاضے" کا ایک نیا علم کلام تصنیف کرتا ہے۔

دنیا کی ہر شئے اپنے خارجی اور محسوس وجود کے ساتھ ساتھ اپنی مخصوص "خاصیت" کی حامل بھی ہے۔ پانی کا محسوس وجود "اپنے اندر پیاس بجھانے کی خاصیت بھی رکھتا ہے کسی چیز سے اس کی خاصیت الگ نہیں کی جاسکتی اور نہ کسی چیز کے خارجی وجود کا اُس کی خاصیت کے بغیر تصور کیا جاسکتا ہے۔ یہ خارجی وجود اور اُس کی "خاصیت" ایک دوسرے سے اس درجہ باہم پیوست ہیں کہ انھیں کسی بھی طور دو حصوں میں تقسیم کرنا مشکل ہے۔ جس آگ میں جلانے کی خاصیت نہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ آگ، آگ نہ ہو بلکہ کوئی اور چیز ہو اور پانی میں اگر پیاس بجھانے کی خاصیت نہیں تو وہ "کوئین" یا کسی اور مائع کا آمیزہ تو ہوسکتا ہے، لیکن پانی نہیں ہوسکتا۔

اسی طرح دین کو بحیثیت نظامِ زندگی ماننے اس پر انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عمل کرنے اور اسے قائم کرنے کی لازمی خاصیت یہ ہے کہ خدا سے بندے کا تعلق مضبوط ہو اور انسان خدا کی رضا کے حصول کی منزلیں طے کرسکے دین کو پوری زندگی کا نظام تسلیم کرنے سے اگر آدمی کا خدا سے تعلق ٹھیک طور پر استوار نہیں ہوتا اور اس کی رضا کے حصول کی منزل طے نہیں ہوتی، بلکہ "زمینی نتیجہ" ہی مقصود اصلی رہتا ہے تو یقین جانئے کہ جو دین اپنی خاصیت ظاہر نہیں کرسکتا وہ چاہے خارجی وجود کے اعتبار سے اور جو کچھ بھی ہو مگر وہ دین حق نہیں ہوسکتا۔ دین کا محسوس اور خارجی وجود (یعنی پوری زندگی کا نظام ہونا) --- اور اُس کی خاصیت یعنی اُس کا خدا سے "قلبی حیاتی" اور نفسیاتی تعلق کا عنوان ہونا --- کو "اصل" اور "تقاضے" میں ہرگز تقسیم نہیں کیا جا سکتا لیکن انفرادیت پسند ذہن کے لئے جس پر تاریخ کی سراب آفریں پرچھائیاں پڑی ہوئی ہیں۔ دین کو اس کی سادہ صورت میں، علم کلام کی مدد کے بغیر پہچاننا بڑا پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔

لیکن یہ ذہن کوئی صحت مند ذہن نہیں، اس نے ہمیشہ دینی محاذ کو نقصان پہنچایا ہے اس نے ریب و تشکیک کے نشتروں سے کارکنوں کے عزائم کو مضمحل کرنے اور انھیں بددل کرنے کی کوشش کی ہے اس نے فکری افتراق اور انتشار کے جرثوموں کو غذا دی ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے مکھی کو مارنے کے لئے بڑے بڑے بھاری بھرکم ہتھوڑے آزمائے ہیں مگر وقت کے مفکر اعظم کے ٹکراؤ سے بچنے کے لئے "ایمان اور عمل" "اصل اور تقاضا" اور "جبر و قدر" کی کلامی بحثوں میں پناہ لی ہے اور رخصتوں کا ایک "باب الحیل" کھول کر اقامتِ دین کا کام کرنے والوں کو "مجروحیتِ دین" کے سرٹیفکیٹ عطا کئے ہیں۔

یہ وہی بیمار ذہن ہے جس پر ایک زمانے میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ان الفاظ میں گرفت فرمائی تھی:-

> "اسلام کو پیش کرنے میں دوسری غلطی یہ کی گئی کہ اس کو بحیثیت ایک نظامِ زندگی کے پیش نہیں کیا گیا جو زندگی کے انفرادی اور اجتماعی اور مابعد الطبیعی مسائل کو ایک وحدت میں پروتا ہے اور اور سب کو عقل و فطرت کے مطابق حل کرتا ہے بلکہ سارا زور ہمارے مبلغوں اور مناظروں نے چند ایسے مسائل پر صرف کیا جو عیسائیوں یا ہندوؤں کے ساتھ مذہبی تصادم سے پیدا ہوگئے تھے ....
>
> .... ایک ایسی دنیا میں جو اپنے ایجاد کئے ہوئے طریقوں کو آزما کر تھک چکی ہو اور زندگی کے تمدنی اور اجتماعی مسائل کا کوئی حل نہ پا رہی ہو، اگر

اسلام کو محض چند عقائد اور چند رسوم کی حیثیت سے
نہیں بلکہ ایک مکمّل نظامِ زندگی کی حیثیت سے
پیش کیا جاتا تو آج دنیا کا نقشہ ہی بدل جاتا۔"
(از دعوتِ دین اور اُس کا طریقِ کار)

اب محترم وحید الدین خان کی زیرِ تبصرہ کتاب کے اس حصّہ کا مطالعہ فرمائیے جس میں انھوں نے مولانا مودودی کے تصوّرِ دین پر تنقید کی ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

"دین کا ایک نظام ہونا بذاتِ خود غلط نہیں
ہے مگر جب نظام کے تصوّر کو یہ حیثیت دی
جائے کہ یہی وہ سبب جامع ہے جو اس کے
متفرق اجزاء کو ایک کل میں سموتا ہے تو وہ
یقیناً غلط ہے اور یہی اس فکر کی اصل غلطی ہے
یہ فکر دین کا مطالعہ اس حیثیت سے کرتی ہے
کہ وہ زندگی کا ایک نظام ہے، اس کے نزدیک
وہ مجموعی تخیّل جس کے تحت پورے دین کو سمجھا
جا سکتا ہے، وہ اس کا نظام ہونا ہے، حالانکہ
دین کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا اور بندے
کے درمیان تعلق کا عنوان ہے۔ دین محض قانونی
نظام نہیں جیسے دوسرے نظام ہوا کرتے ہیں
بلکہ خدا سے نفسیاتی تعلق کا ایک ظہور ہے، عمل
کے آنے کے بعد بے شک دین میں وہ ساری
چیزیں شامل ہو جاتی ہیں جن کے مجموعے کو
"نظامِ حیات" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے
مگر دین کا نظام ہونا، حقیقتِ دین کا ایک
مظہر ہے۔ یہ اس کی اضافی حیثیت ہے نہ کہ
اصلی حیثیت۔" (ص ۱۹۱)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مولانا مودودی نے دین کی "نظامِ حیات" کے لفظ سے اگرچہ صحیح تعبیر کی ہے مگر یہ اس کا خارجی مظہر ہے اور اس کی یہ حیثیت "اضافی" اور "ضمنی" ہے کیونکہ دین محض قانونی نظام نہیں جیسے دوسرے نظام ہوا کرتے ہیں۔ قارئینِ کرام! اس آخری جملے کو خاص طور پر نگاہ میں رکھیں کیونکہ یہ محترم مصنف کے خود ساختہ مفروضات میں سے ایک اہم ترین مگر غلط مفروضہ ہے جو اس جملے سے ظاہر ہو رہا ہے، اس پر آئندہ سطور میں گفتگو کی گئی ہے۔

مولانا مودودی کی تعبیرِ دین کی یہ غلطی اس قدر شدید ہے کہ اس سے دین کا حلیہ بگڑ گیا ہے، فرماتے ہیں:۔

"اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی مکان کو توڑ
کر اس کی اینٹ اور گارے سے دوسری وضع
کا مکان بنا ڈالا جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تصویر
اجزاء کے اعتبار سے دینی ہونے کے باوجود اپنی
مجموعی ہیئت میں دین کے مطابق نہیں رہی
بظاہر دین کے حامل ہونے کے باوجود اپنی مخصوص
ترتیب سے پورے دین سے ٹکرا گئی" (ص ۹۵)

یہ تعبیرِ دین سے اس لئے ٹکرا گئی کیونکہ دین کی اصل حیثیت خدا اور بندے کے تعلق کے عنوان کی تھی۔ یہ اصل نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ "تقاضے" نے اصل کی جگہ لے لی اور دین کی یہ تصویر اپنی جامعیت کے باوجود اس کی حقیقی تصویر نہیں۔

قطع نظر اس کے کہ مولانا مودودی نے کیا بات کہی ہے اور صاحب موصوف نے اسے کیا معنی دیتے ہیں ان کے اندازِ استدلال کو سمجھنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث پر غور کیجئے جس میں "دعا" کو "عبادت" کی مخ یا اصل قرار دیا گیا ہے، جیسے فرمایا ـــــ الدعاء مخ العبادۃ ـــــ اب چونکہ عبادات کی اصل دعا ہے اور جملہ عبادات نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ اس اصل کے خارجی مظہر ہیں۔ لہٰذا یہ تقاضے ٹھیرے اور اصل کے مقابلے میں ان کی حیثیت ضمنی اور اضافی ٹھیری، دین کے فہم کا یہ طرزِ استدلال بالآخر عبادات کے ان "خارجی مظاہر" کو ضمنی اور اضافی کہہ کر ان کی اہمیت کو بہرحال کم کر دیتا ہے۔ اس اندازِ استدلال کی رو سے اقیموا الصلوٰۃ اور جملہ عبادات کی تلقین "تقاضوں" کو اصل کی جگہ

دینے کے مترادف ہوگی اور اس سے دین کی مجموعی ہیئت بگڑ جائے گی اور درخت بجائے جڑ کے شاخوں پر کھڑے رہ جائے گا

مولانا مودودی نے بھی دین کا جو تصور دیا ہے تو اسمیں انھوں نے کنایۃً بھی یہ بات کہیں نہیں لکھی کہ " تم دین کو محض قانونی نظام مانو " اور اسی حیثیت سے اس کی اطاعت کرو۔ بلکہ ان کے نزدیک دین خدا اور بندہ کے تعلق کی پوری وضاحت بھی کرتا ہے اور یہ بھی بتاتا ہے کہ انسان خدا کی زمین پر خدا کا بندہ بن کر کس طرح زندگی بسر کرے اپنی اعتقادی، مذہبی اور روحانی زندگی پر مہر بندگی ثبت کرے اور کیونکر معاملاتی معاشرتی، تمدنی اور سیاسی زندگی خدا کی اطاعت اور فرماں برداری میں بسر کرے۔ ان کے نزدیک دین کی یہ سب حیثیتیں ایک ایسے "کل" کا حکم رکھتی ہیں جن کا ایک طرف ہماری نفسیات اور روح سے رشتہ ہے تو دوسری طرف ہمارے اعضاء اور جوارح سے بھی ویسا ہی گہرا تعلق ہے اور یہ انھی دونوں حیثیتوں کی "اصل" ہے۔ اس کا کوئی پہلو کسی دوسرے پہلو کا تقاضہ نہیں ۔ بلکہ اس کے ہر پہلو کا دوسرے پہلو پر کلّی انحصار ہے اور مولانا مودودی کے نزدیک یہ ان دونوں حیثیتوں سے ایک مکمل اور کامل دین ــــ الدین ــــ ہے ان کے نزدیک یہ محض قانونی نظام نہیں بلکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی، اعتقادی اور عملی، روحانی اور تمدنی اور سیاسی غرضیکہ ہر گوشۂ زندگی کا جامع نظام حیات ہے اور یہ ان ساری حیثیتوں سے مطلوب ہے اور اس کا مقصود رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

ملتِ اسلامیہ کے قابل اعتماد و مستند علمی ذخیرے میں دین کو اسی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ صاحب علم صوفیاءِ کرام کی علمی کتابیں اُٹھا کر دیکھ لیجئے جہاں انھوں نے قلبی عبادات پر زور دیا ہے وہاں " قانونی عبادات " کو بھی برابر کی اہمیت دی ہے اور "قلبی عبادات" کو بغیر "قانونی عبادات" کے بے معنی قرار دیا ہے۔ اسی طرح فقہاء ائمہ کے فقیہانہ کارناموں پر سرسری نظر ڈال کر دیکھ لیجئے، اگر آپ کو ان کے ذخیرۂ علم میں خشوع و خضوع، تقویٰ، اخلاص، صبر اور توکل کی اصطلاحیں نظر نہ آئیں تو انھیں " تعبیر دین " کی غلطی کا ملزم نہ گردانیئے، کیونکہ اگر انھوں نے "جوارح" اور "اعضاء" کی عبادات کا نظام مرتب کیا ہے اور زندگی کے خارجی احکام بتائے تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ انھوں نے قلبی اور حسیاتی عبادات کی اہمیت کو کم کر دیا ہے۔ اگر کہیں کسی بزرگ نے انفرادی زندگی کی تربیت پر زور دیا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس بزرگ نے " اجتماعیات " کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا ہے اور ان کی نگاہ میں اس کا کوئی وزن ہی نہیں اور اگر کوئی ارتفاقات پر کام کرتا ہوا نظر آئے تو جھٹ سے یہ فتویٰ نہ دے ڈالئے کہ وہ " اقترابات " کی اہمیت کو کم کر رہا ہے اور اصل اور تقاضے کے فرق کو نظر انداز کر کے تقاضے کو اصل کا مقام دے رہا ہے

یہ بات بہر حال سب میں متفق رہی ہے کہ دین ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جہاں وہ خدا اور بندے کے نفسیاتی اور روحانی تعلق کا عنوان ہے وہاں وہ بندوں سے تعلقات کا مظہر بھی ہے اور یہ اپنی اندرونی اور خارجی دونوں کیفیات میں ایک " کل " ہے اور یہی " اصل " ہے !

اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اگر دین کا ان دونوں پہلوؤں سے مطالعہ کیا جائے تو وحید الدین خاں کو کوئی اعتراض نہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے صفحہ ۱۹۹ پر حاشیہ میں تحریر کرتے ہیں:۔

" دین اصلاً خدا کا حکم ہے اور اسی حیثیت سے ہمیں اس کے احکام پر عمل کرنا ہے اللہ تعالیٰ نے ہم کو مکلف قرار دیا ہے مگر اس کے ساتھ دین کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ ہماری نفسیات سے اس کا گہرا تعلق ہے وہ صرف خارج سے ملا ہوا ایک قانونی حکم نہیں ہے بلکہ وہ خود انسان کی اندرونی طلب کا جواب ہے وہ انسانی فطرت کا ظہور ہے اور ہمارا دین کا مطالعہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب ہم اس دوسرے پہلو کو بھی اپنے سامنے رکھیں "۔ (صفحہ ۹۹)

اس اقتباس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ محترم موصوف دین کو اگر ایک کل اور ایک وحدت ..... نہ بھی تسلیم کریں تاہم وہ دین کے دو پہلو بہر حال تسلیم کرتے ہیں اور

اگر ان دونوں پہلوؤں سے دین کا مطالعہ کیا جائے تو یہ مطالعہ بقول ان کے صحیح ہوگا۔ اگر ایک پہلو کو ترک کر دیا جائے اور دوسرے پہلو کو اختیار کر لیا جائے تو ان کے نزدیک یہ بات واقعتہً محل نظر ہے ـــ دین کو قانونی ـــ محض قانونی نظام سمجھنا اور دوسرے پہلو کو یکسر نظر انداز کر دینا فی الواقع بہت بڑی جسارت ہے۔ اگر یہ جسارت مولانا مودودی نے کی ہے تو واقعتہً ہرگز قابل معافی نہیں کیونکہ محترم مصنف کے نزدیک تو یہ جسارت محض اتنی ہے کہ اس نے "تقاضے" کو "اصل" کا مقام دے دیا ہے اور ترتیب اُلٹ دی ہے لیکن راسم کے نزدیک یہ جسارت اگر واقعتہً کی گئی تو یہ اصل کو کلیتہً غائب کر کے "نقل" کو سامنے لانے کے مترادف ہے اور یہ قادیانیت اور پرویزیت وغیرہ سے ہرگز مختلف نہیں اسلئے اس کا ذرا تفصیل سے جائزہ لینا چاہیئے کہ آیا یہ جسارت کی بھی گئی ہے یا خود محترم موصوف کے زرخیز ذہن کی ایک حیرت انگیز اختراع ہے جس کی اس آسمان کے نیچے ہرگز کوئی حقیقت نہیں ـــ اور کہیں ایسی بات تو نہیں کہ فاضل بزرگ نے اپنی کسی ذہنی الجھن کی بناء پر یہ غلط مفروضہ بطور خود فرض کر لیا ہو کہ مولانا مودودی محض قانونی نظام کے داعی ہیں اور دین کے تعبدی اور حیاتی پہلو کی اہمیت کو کم کر رہے ہیں اور پھر ان کمزوریوں اور خرابیوں کو دیکھ کر جو مولانا کے رفقاء میں پائی جاتی ہیں اور جن میں سے بعض کا فاضل مصنف نے اسی کتاب میں "نتائج" کے باب میں ذکر کیا ہے، مولانا کیخلاف ایک مقدمہ کھڑا کر دیا کہ مولانا کا تصور دین ناقص ہے اس سے دین مجروح ہوا ہے، اس کا ثبوت ان کے رفقاء کی یہ اور یہ خامیاں ہیں اور اس پر ان کی جماعت کا فلاں اور فلاں اضطراب گواہ ہے۔

مولانا مودودی پر یہ ایک بڑا سنگین الزام ہے۔ اب ہم قارئین کرام کی خدمت میں مولانا مودودی کی تحریریں میں سے چند اقتباسات پیش کرتے ہیں ان سے اندازہ ہو سکے گا کہ دین کی اصل ـــ تعبدی پہلو ـــ کے علمبردار فاضل بزرگ نے مولانا مودودی کے ساتھ کس حد تک انصاف کیا ہے۔ ان اقتباسات سے یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ کیا واقعی مولانا دین کو محض ایسا نظام حیات سمجھتے ہیں جس کا انسان کے اندرون سے کوئی تعلق نہیں اور اگر ہے تو محض زیبِ داستاں کے طور پر؟

مولانا مودودی "اسلامی نظریہ سیاسی" کے تحت فرماتے ہیں:۔

"سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام محض منتشر خیالات اور منتشر طریقہائے عمل کا مجموعہ نہیں، جس میں اِدھر اُدھر سے مختلف چیزیں لاکر جمع کر دی گئی ہوں بلکہ ایک باضابطہ نظامِ حیات ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے اس کے بڑے بڑے ارکان سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے، انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قواعد اور ضابطے مقرر کئے ہیں، ان سب کی روح اور جوہر اس کے اصول اوّلیہ ہی سے ماخوذ ہے، ان اصول اوّلیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں اور جڑوں سے تنہ اور تنے سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی آپ سمجھنا چاہیں آپ کے لئے ناگزیر ہے کہ آپ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پا سکتے۔" (ترجمان القرآن جلد ۱۵ - عدد ۱)

مولانا مودودی ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:۔

"جس چیز کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں اس کا جامع نام قرآن کی اصطلاح میں "دین حق" ہے یعنی وہ نظامِ زندگی (دین) جو حق (پیغمبروں کی لائی ہوئی

ہدایت کے مطابق بندگی اور اطاعت، پر مبنی ہو مگر اس کے لئے کبھی کبھی ہم نے "حکومت الٰہیہ" کی اصطلاح بھی استعمال کی ہے جس کا مفہوم دوسروں کے نزدیک چاہے جو کچھ بھی ہو، ہمارے نزدیک صرف یہ ہے کہ "اللہ کو حاکم حقیقی مان کر پوری انفرادی و اجتماعی زندگی اس کی محکومیت میں بسر کرنا" اس لحاظ سے یہ لفظ بالکل اسلام کے ہم معنی ہے اسی بناء پر ہم ان تینوں اصطلاحوں، دین حق، حکومتِ الٰہیہ اور اسلام کو مترادف الفاظ کی طرح بولتے رہے ہیں اور اس مقصد کے حصول کی جدوجہد کا نام ہم نے اقامتِ دین، شہادتِ حق، اور تحریک اسلامی رکھا ہے۔ جن میں پہلے دو لفظ قرآن سے ماخوذ ہیں اور دوسرا لفظ عام فہم ہونے کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہے۔ ان الفاظ پر اگر لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی تو اس لئے کہ انھوں نے ہماری اصطلاح سے اپنا مفہوم مراد لے لیا، ہمارا مفہوم مراد لیتے تو اُمید نہ تھی کہ اس پر وہ ناراض ہوتے۔"

(جماعت اسلامی مقصد تاریخ اور لائحہ عمل صٰ)

اس طرح دستور جماعت میں عقیدہ و نصب العین کی وضاحت جن الفاظ میں کی گئی ہے وہ حسب ذیل ہیں یہاں یہ بات واضح رہے کہ یہ وہ الفاظ ہیں جن کو زندگی کا وظیفہ بنانے کے لئے تمام سابق ارکان کو خدا اور خلق کے سامنے حلف اُٹھانا پڑتا تھا:۔

"جماعت اسلامی پاکستان کا بنیادی عقیدہ لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ہوگا۔ یعنی یہ کہ اللہ ہی ایک اللہ ہے اس کے سوا کوئی اللہ نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔"

"اس عقیدے کے پہلے جز یعنی اللہ کے واحد ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان اور جو کچھ زمین و آسمان میں ہے سب کا خالق، پروردگار، مالک تکوینی و تشریعی حاکم صرف اللہ ہے اور ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔"

اس حقیقت کو جان اور مان لینے کے بعد جو کچھ لازم آتا ہے اس کے تحت وہ سب کچھ لکھا گیا ہے جس کا تعلق انسان کے قلب و روح کے ساتھ بھی ہے اور اعضاء اور جوارح کے ساتھ بھی، پھر ان سب باتوں میں یہ فقرہ الگ کر کے واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ:۔

"اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو تمام سعی جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھیرائیے۔"

نصب العین کی دفعہ کے تحت جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی عبارت یہ ہے:۔

"جماعت اسلامی پاکستان کا نصب العین اور اس کی تمام سعی و جہد کا مقصود عملاً اقامت دین (حکومتِ الٰہیہ یا اسلامی زندگی کا قیام) اور حقیقۃً رضائے الٰہی اور فلاح اُخروی کا حصول ہوگا۔"

نصب العین کے فقرے کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے

"الدین" "حکومتِ الٰہیہ" اور "اسلامی نظامِ زندگی" تینوں اس جماعت کی اصطلاح میں ہم معنی الفاظ ہیں۔ قرآن مجید نے اپنے جس مفہوم کو بیان کرنے کے لئے اقامت دین کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اسی مفہوم کو یہ جماعت حکومت الٰہیہ یا اسلامی نظام زندگی کے قیام سے ادا کرتی ہے ان تینوں کا مقصد اس کے نزدیک ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انسانی زندگی کے جس دائرے میں انسان کو اختیار حاصل ہے اس پر وہ برضا و رغبت اسی طرح اللہ کی تشریعی حکومت تسلیم کرے جس طرح دائرۂ جبر میں کائنات کا ذرہ ذرہ چار و ناچار اس کی تکوینی حکومت تسلیم کر رہا ہے۔ اللہ کی اس تشریعی حکومت کے آگے سر جھکانے سے جو طریق زندگی رونما ہوتا ہے وہی "الدین" ہے وہی حکومتِ الٰہیہ ہے

اور وہی اسلامی نظامِ زندگی ہے۔"

ان اقتباسات کے ساتھ مندرجہ ذیل تحریر کا مطالعہ بھی کر لیجئے:۔

"ہمارا ایک نظامِ زندگی پر ایمان رکھنا اور دوسرے نظامِ زندگی پر راضی رہنا بالکل ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مخلصانہ ایمان کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ جس طریقِ زندگی پر ایمان رکھتے ہیں اسی کو ہم اپنا قانونِ حیات دیکھنا چاہیں اور ہماری رُوح اپنی آخری گہرائیوں تک ہر اس رکاوٹ پیش آجانے پر بے چین و مضطرب ہوجائے جو اس طریقِ زندگی کے مطابق جینے میں سدِّ راہ بن رہی ہو، ایمان تو ایسی چھوٹی سے چھوٹی رکاوٹ بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہو سکتا۔ کجا کہ۔ پورے کا پورا دین کسی دوسرے نظامِ زندگی کا تابع مہمل بن کر رہ گیا ہو اس دین کے کچھ اجزا پر عملدرآمد ہوتا بھی ہو تو صرف اس وجہ سے کہ غالب نظامِ زندگی نے اس کو بے ضرر سمجھ کر رعایۃً باقی رکھا ہو اور ان رعایات کے ماسوا ساری زندگی کے معاملات دین کی بنیادوں سے ہٹ کر غالب نظامِ زندگی کی بنیادوں پر چل رہے ہوں اور پھر بھی ایمان اپنی جگہ نہ صرف خوش اور مطمئن ہو بلکہ جو کچھ بھی سوچے اسی غلبۂ کفر کو اصول موضوعہ کے طور پر تسلیم کرکے سوچے، اس قسم کا ایمان چاہے فقہی اعتبار سے معتبر ہو، لیکن دینی لحاظ سے تو اس میں اور نفاق میں کوئی فرق نہیں۔"

مولانا مودودی نے اپنی دعوت کی جن الفاظ میں وضاحت فرمائی ہے وہ یہ ہیں:۔

"لوگ یہ سمجھتے ہیں اور ایسا سمجھایا بھی جاتا ہے کہ حکومتِ الٰہیہ سے مراد محض سیاسی نظام ہے اور ہماری غرض اس کے سوا کچھ نہیں کہ موجودہ نظامِ زندگی کی جگہ وہ مخصوص سیاسی نظام قائم ہو۔ حالانکہ اگر کوئی شخص ہمارے لٹریچر کو کھلے دل کے ساتھ پڑھے تو اس پر آسانی سے یہ بات کھل سکتی ہے کہ ہمارے پیشِ نظر ایک سیاسی نظام کا قیام نہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ پوری انسانی زندگی۔ انفرادی و اجتماعی۔ میں وہ ہمہ گیر انقلاب رونما ہو جو اسلام رونما کرنا چاہتا ہے، جس کے لئے اللہ کے انبیاء کو مبعوث کیا گیا تھا اور جس کی دعوت دینے اور جد و جہد کرنے کے لئے ہمیشہ انبیاء علیہ السلام کی امامت میں امتِ مسلمہ کے نام سے ایک گروہ بنتا رہتا ہے۔

اگر ہم اپنی دعوت کو مختصر طور پر صاف اور سیدھے الفاظ میں بیان کرنا چاہیں تو یہ تین نکات پر مشتمل ہوگی۔

- یہ کہ ہم بندگانِ خدا کو بالعموم اور جو پہلے سے مسلمان ہیں بالخصوص اللہ کی بندگی کی دعوت دیتے ہیں۔
- یہ کہ جو شخص بھی اسلام قبول کرنے یا اس کے ماننے کا دعویٰ کرے یا اظہار کرے اس کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی سے منافقت اور تناقض کو خارج کرے اور جب وہ مسلمان ہے یا بنا ہے تو مخلص مسلمان بنے اور اسلام کے رنگ میں رنگ کر یک رنگ ہو جائے۔
- یہ کہ زندگی کا نظام جو آج باطل پرستوں اور فساق و فجار کی رہنمائی اور قیادت و فرمانبرداری میں چل رہا ہے اور معاملاتِ دنیا کی زمامِ کار جو خدا کے باغیوں کے ہاتھ میں آئی ہے ہم یہ دعوت دیتے ہیں کہ اسے بدلا جائے اور رہنمائی اور امامت نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے مومنین اور صالحین کے ہاتھوں منتقل ہو۔" (دعوتِ اسلامی اور اسکے مطالبات)

یہ مولانا مودودی کے وسیع لٹریچر میں سے چند اقتباسات ہیں جن سے یہ بات بالوضاحت عیاں ہو جاتی ہے کہ مولانا محترم کے تصورِ دین اور ان کی پیش کردہ دعوت کا فاضل مصنف کے غلط مفروضات اور ان کی نفسیاتی پیچیدگیوں سے ہرگز

کوئی تعلق نہیں۔

مولانا مودودی کی تحریروں سے دین کی جو نمایاں خصوصیات واضح ہو کر سامنے آئی ہیں وہ یہ ہیں:۔

"اسلام خدا سے انسان کا محض نظری و فکری تعلق ہی نہیں، بلکہ گہرا روحانی اور جذباتی اور عملی تعلق عبدیت چاہتا ہے۔"

- "اسلام پوری زندگی کا دین ہے وہ نہ کچھ شعبوں تک محدود ہے اور نہ کسی شعبے کو اپنے دائرے سے باہر چھوڑتا ہے۔"
- وہ محض انفرادی مذہبیت اور نکوکاری کا داعی نہیں بلکہ اس کے ساتھ وہ اپنے طرز کا مکمل معاشرہ وتمدن بھی تعمیر کرنا چاہتا ہے اس لئے جماعتی نظام کو لازم کرتا ہے۔"
- "وہ کسی نظام کے ساتھ سمجھوتہ کر کے اس کے زیر اقتدار رہنے پر قانع نہیں ہو سکتا بلکہ وہ غلبہ و برتری چاہتا ہے۔
- اس کی دعوت میں باطل کے کشمکش کا تقاضا بھی شامل ہے اور اسی کشمکش کا مرتبۂ کمال جہاد ہے۔"

(ترجمان القرآن ستمبر ۶۳ء اشارات از نعیم صدیقی)

یہ ہے وہ تصور دین جو مولانا مودودی نے پیش کیا ہے لیکن افسوس کہ وحید الدین خاں صاحب نے کس قدر حیرت انگیز مغالطہ دیا ہے:۔

"خدا اور بندے کا تعلق جو ایک نہایت اعلےٰ اور لطیف تعلق ہے اس تعبیر کے خانے میں آکر ایک قسم کا سیاسی تعلق بنکر رہ گیا۔"

اوپر کے اقتباسات پر ایک سرسری سی نظر ڈال لیجئے اور پھر فاضل بزرگ کی یہ رائے پڑھیئے اور اندازہ کیجئے کہ یہ رائے کس درجہ منصفانہ ہے کیا مولانا مودودی نے واقعی "سیاسی تعلق" کی طرف دعوت دی ہے اور اگر اسلام کو ایک مکمل ضابطہ حیات کے لفظ سے تعبیر کیا جائے تو کیا واقعی اس تعبیر کے بطن سے "سیاسی اور قانونی تعلق" کا برخوردار ہی تولد پذیر ہوتا ہے؟

یہ بھی زمانے کی عجیب ستم ظریفی ہے کہ آج سے چند سال قبل بعض بزرگوں نے مولانا مودودی پر یہ الزام لگایا تھا کہ ان کے نزدیک ساری اہمیت "حقیقی اسلام" اور "اصلی مسلمان" کی ہے ــــ "نسلی مسلمان" یا "قانونی اسلام" ماننے والوں کو درخور اعتناء نہیں سمجھتے۔ اب اسکے بالکل برعکس یہ الزام لگایا جارہا ہے کہ مولانا کے نزدیک ساری اہمیت قانونی نظام اور خدا کے ساتھ سیاسی تعلق کو حاصل ہے!

محترم وحید الدین خاں سے زیادہ اس حقیقت سے اور کون آگاہ ہوگا کہ مولانا کی ذیل کی تحریریں بھی ان کے لٹریچر میں بکثرت موجود ہیں۔ وہ خود بھی ان کا مطالعہ کرتے رہے ہوں گے اور دوسروں کو بھی پڑھنے کی دعوت دیتے رہے ہونگے ممکن ہے فاضل مصنف کے نزدیک ان تحریروں کی حیثیت محض "زیب داستاں" کی ہو، مگر جن لوگوں کو انھوں نے یہ تحریریں پڑھنے کے لئے دی ہوں گی نہ معلوم ان کے سامنے اب وہ اس کی کیا توجیہہ پیش کریں گے۔ قارئین کرام بھی ان میں چند اقتباسات کا مطالعہ فرمالیں اور اندازہ کریں کہ صاحب موصوف نے اپنی کتاب کے ناظرین کو کتنا خوفناک مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے۔

مولانا محترم روداد حصہ دوم میں فرماتے ہیں:۔

"پہلے جو آیت آپ کے سامنے پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ انسان بندگی کو اور اپنے جینے اور مرنے کو صرف اللہ کے لئے خالص کرے اور اللہ کے سوا کسی اور کو اس میں شریک نہ کرے یعنی نہ تو اس کی بندگی اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے ہو اور نہ اس کا جینا اور مرنا اسکی جو تشریح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ہیں نے آپ کو سنائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی محبت اور دشمنی اور اپنی دنیوی زندگی کے معاملا میں اس کا لین دین خالصتہً خدا کے لئے ہونا عین تقاضائے ایمان ہے۔ اس کے بغیر ایمان ہی کی تکمیل

نہیں ہوتی، کجا کہ مراتب عالیہ کا دروازہ کھل سکے جتنی کمی اس معاملے میں ہوگی اتنا ہی نقص آدمی کے ایمان میں ہوگا۔"

"اس تحریک کی جان دراصل تعلق باللہ ہے اگر اللہ سے آپ کا تعلق کمزور ہو تو آپ حکومت الٰہیہ قائم کرنے اور کامیابی کے ساتھ چلانے کے اہل نہیں ہو سکتے ـــــ لہذا فرض عبادات کے ماسوا نفل عبادات کا بھی التزام کیجئے۔"

وہ کم سے کم ضروری صفات کیا ہیں جو دعوتِ دین کا کام کرنے والوں میں ہونی چاہئیں ؟

مولانا محترم ان کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں

"شخصی اوصاف میں پہلا اور بنیادی وصف یہ ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے نفس سے لڑ کر پہلے اسے مسلمان اور خدا کا مطیع فرمان بنائے یہ وہی بات ہے جسے حدیث میں یوں بیان فرمایا گیا ہے۔ المجاھد من جاھد نفسہ فی طاعۃ اللہ ـــ حقیقی مجاہد وہ ہے جو اللہ کی اطاعت میں اپنے نفس سے کشمکش کرے یعنی قبل اس کے کہ آپ باہر کی دنیا میں خدا کے باغیوں کے مقابلے کے لئے نکلیں، اسی باغی کو مطیع بنائیے جو خود آپ کے اندر موجود ہے اور خدا کے قانون اور اسکی رضا کے خلاف چلنے کے لئے ہر وقت تقاضا کرتا رہتا ہے اگر یہ باغی آپ کے اندر پل رہا ہے اور آپ پر اتنا قابو یافتہ ہے کہ آپ سے رضائے الٰہی کے خلاف اپنے مطالبے منوا سکتا ہے تو یہ بالکل ایک بے معنی بات ہے کہ آپ بیرونی باغیوں کے خلاف اعلان جنگ کریں، یہ تو وہی بات ہوئی کہ گھر میں شراب کی بوتل پڑی ہے اور باہر شرابیوں سے لڑائی ہو رہی ہے یہ تضاد ہماری تحریک کے لئے تباہ کن ہے۔ پہلے خدا کے آگے سر جھکائیے پھر دوسروں سے اطاعت کا مطالبہ کیجئے ـــ"

"جہاد کے بعد دوسرا درجہ ہجرت کا ہے ـــــ

ہجرت کا اصل مدعا گھر بار چھوڑنا نہیں بلکہ خدا کی نافرمانی سے بھاگ کر خدا کی رضا جوئی کی طرف بڑھنا ہے۔ اصل مہاجر ترک وطن اگر کرتا ہے تو اس لئے کہ اس کے وطن میں قانون الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع نہیں لیکن اگر کسی شخص نے گھر بار چھوڑا اور اللہ کی فرمانبرداری بھی اختیار نہ کی اس نے حماقت کی۔ (روداد حصہ دوم ص۱۶۱)

"اولین چیز جس کی ہدایت ہمیشہ انبیاء اور خلفائے راشدین اور صلحائے امت ہر موقعہ پر اپنے ساتھیوں کو دیتے رہے ہیں وہ اللہ سے ڈرنے اور اسکی محبت دل میں بٹھانے اور اس کے ساتھ تعلق بڑھانے کی ہدایت ہے۔ میں نے بھی اسی اتباع میں ہمیشہ اپنے رفقا کو سب سے پہلے یہی نصیحت کی ہے اور آئندہ بھی جب کبھی موقعہ ملے گا اسی کی نصیحت کرتا رہوں گا۔"

مولانا مودودی ایک تقریر کے ان تمہیدی فقروں کے بعد فرماتے ہیں :-

"یہ وہ چیز ہے جس کو ہر دوسری چیز پر مقدم ہونا چاہئیے۔ عقیدے میں اللہ پر ایمان مقدم ہے عبادات میں اللہ سے دل کا لگاؤ مقدم ہے اخلاق میں اللہ کی خشیت مقدم ہے، معاملات میں اللہ کی رضا مقدم ہے اور فی الجملہ ہماری زندگی ہی کی درستی کا انحصار اسی پر ہے کہ ہماری دوڑ دھوپ اور سعی و جہد میں رضائے الٰہی کی مقصودیت ہر دوسری غرض پر مقدم ہو پھر خصوصیت کے ساتھ یہ کام جس کے لئے ہم ایک جماعت کی صورت میں اٹھے ہیں۔ یہ تو سراسر تعلق باللہ ہی کے بل پر چل سکتا ہے یہ اتنا ہی مضبوط ہوگا جتنا اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق مضبوط گا اور یہ اتنا ہی کمزور ہوگا جتنا خدا نخواستہ اللہ کے ساتھ ہمارا تعلق کمزور ہوگا۔" (ہدایات)

مولانا مودودی کی تحریروں سے اگر اسی نوعیت کے اقتباسات

جمع کئے جائیں تو ایک کتاب تالیف ہو سکتی ہے۔ ان اقتباسات کو پڑھ کر ناظرین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا مودودی کے ہاں تعلق باللہ ایک سیاسی تعلق بن کر رہ گیا ہے یا یہ سارے کام کی جڑ اور اساس کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن محترم وحید الدین خاں کو یہ تعلق سیاسی ہی نظر آئے گا کیونکہ ان کے نزدیک مولانا مودودی کا اصل مقصود "زمینی نتیجہ" کو حاصل کرنا ہے۔ فرماتے ہیں:-

"دین کی یہ نئی تصویر اپنی جامعیت کے باوجود اس کی حقیقی تصویر نہیں دین کی اس تصویر میں ایک زمینی نتیجے کو پانا دین کا مقصد اصلی قرار پاتا ہے، جبکہ شخصی ذمہ دار کی حیثیت سے ایک ذاتی نتیجے کو پانا دین کا اصلی مقصود ہے۔" (ص ۲۷۷)

حالانکہ مولانا مودودی کی کسی بھی تحریر سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں کی جا سکتی جو صاحب تحریر بزرگ فرما رہے ہیں۔ خود صاحب موصوف ۱۹۴۹ء سے مولٰنا مودودی کا لٹریچر پڑھ رہے ہیں، گیارہ سال یکسو ہو کر اس دعوت کو پھیلاتے رہے ہیں ان کے اردگرد سیکڑوں اور ہزاروں رفقاء کی ایک جماعت بھی موجود رہی ہے جن کی [illegible] اور موجودہ زندگیوں میں ایک واضح اور نمایاں تفاوت بھی موصوف نے دیکھا ہو گا انھیں فاضل موصوف نے حلال وحرام کی پابندی کرتا ہوا پایا اور احکام شرعیہ کی بجا آوری میں سرگرم دیکھا ہو گا۔ ان کی معاملاتی زندگی بھی بہرحال بغاوت وسرکشی کی زندگی نہیں ہو گی، بلکہ اطاعت فرمانبرداری اور توبہ وانابت کی زندگی ہو گی، لیکن ان سب باتوں کے باوجود فاضل موصوف مولٰنا محترم کی تحریروں اور ان کے رفقاء کی زندگیوں کی ان قابل رشک صفات کا محور "زمینی نتیجہ" کو قرار دے رہے ہیں۔ یہ واقعتًہ حیرت انگیز سرٹیفکٹ ہے جو موصوف نے اپنے پرانے ساتھیوں کو عنایت فرمایا ہے! اور یہ اتنا کچھ کر گذرنے کے بعد غالبًا وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں:-

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!

کہنے والا اپنی بات کہنے میں آزاد ہے جو چاہے کہہ سکتا ہے جس نے من انصاری الی اللہ کہہ کر بظاہر زمینی نتیجے کے حصول کی دعوت دی تھی اور وہ چاہے تو نحن انصار اللہ کہنے والوں پر بھی یہ عصبیتی پھبتی چست کر سکتا ہے کیونکہ انھوں نے بھی بہرحال فاصبحوا ظاہرین کی شکل میں ایک "زمینی نتیجہ" ہی حاصل کیا تھا۔

فاضل بزرگ نے یہ نتیجہ مولانا محترم کی بے شمار تحریروں کو نظر انداز کر کے صرف "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" جیسی خالصتًہ علمی کتاب سے مستنبط فرمایا ہے، درآنحالیکہ یہ نتیجہ خود اسی کتاب سے بھی ہرگز نہیں نکالا جا سکتا اگر صاحب تحریر بزرگ "اسلامی تہذیب اور اس کے اُصول ومبادیات" کے صفحہ ۶۷ سے صفحہ ۱۱۰ تک کا مطالعہ فرما لیتے تو ان پر واضح ہو جاتا کہ مولانا مودودی کس چیز کو صرف فرد ہی کا نہیں بلکہ ساری اسلامی تہذیب کا محور حقیقی قرار دیتے ہیں — مولٰنا محترم اسی کتاب کے صفحہ ۶۷ پر "اسلامی تہذیب" کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:-

"اسلام نے انسان کو خدا کا خلیفہ اور روئے زمین [illegible] کا نائب قرار [illegible] ہے تو اس تصور حیات سے [illegible] نصب العین [illegible] ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے اس [illegible] جائے گی۔ ایک نائب کا بہ حیثیت نائب ہونے کے اس کے سوا اور کیا نصب العین ہونا چاہیئے کہ وہ جس کا نائب ہے اسکی رضا اور خوشنودی حاصل کرے اور اس کی نظر میں ایک اچھا وفادار متدین اور فرض شناس ملازم قرار پائے؟ اگر وہ کوئی سچا اور نیک آدمی ہے تو کیا وہ اپنے آقا کی خدمت بجالانے میں اسکی رضا جوئی کے سوا اور کسی چیز کو اپنا مقصود بنا سکتا ہے؟ کیا وہ اپنا فرض اس لئے بجالائیگا اس کے معاوضے میں اس کو کسی نفع کی طمع اور کسی ترقی یا انعام یا اضافہ مناصب یا جاہ و منزلت کی زیادتی کا لالچ ہے؟ یہ دوسری

بات ہے کہ آقا خوش ہو کہ اسے سب کچھ عطا کر دے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آقا اس کو حسنِ خدمت کے صلہ میں ان چیزوں کو بخش دینے کی اُمید دلائے اور اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ خود اس کو یہ علم ہو کہ اگر میں نے ٹھیک طور پر فرائض انجام دے کر اپنے آقا کو خوش کر دیا تو وہ مجھے یہ انعام دے گا لیکن اگر اس نے انعام کو اپنا مقصود بنا لیا اور اپنے فرائض منفعت کی خاطر انجام دیتے تو کیا کوئی دانشمند ایسے ملازم کو ایک فرض شناس ملازم کہہ سکتا ہے؟ اس مثال پر خدا اور اس کے نائب کے معاملے کو بھی قیاس کر لیجئے۔ اگر انسان روئے زمین پر خدا کا نائب ہے تو اس کی زندگی کا نصب العین خدا کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی کے حصول کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ وہ نصب العین ہے جو تصورِ حیات سے عقل و فطرت پیدا کرتی ہے اور کسی ادنیٰ فرق کے بغیر یہی نصب العین ہے جو اسلام نے انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔"

"اسلام نے انسان کو دنیا میں خدا کا نائب قرار دیا ہے اور اس کی زندگی کا مقصد متعین کیا ہے کہ جس آقا کا وہ نائب ہے اس کی خوشنودی حاصل کرے، یہ مقصد چونکہ عین اس کی زندگی کا مقصد ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس کی زندگی کے تمام اعمال کا رُخ اسی مقصد کی طرف پھر جائے اس کے نفس اور اس کے جسم کی تمام قوتیں اسی مقصد کی راہ میں صرف ہوں اس کے خیالات و تصورات اور حرکات و سکنات پر اسی مقصد کی حکومت ہو، اس کا جینا اور مرنا اس کا سونا اور جاگنا، اس کا کھانا اور پینا اس کے معاملات اور تعلقات اس کی دوستی اور دشمنی، اس کی معیشت اور معاشرت، غرض اس کی ہر چیز اسی ایک مقصد کے لئے ہو اور یہ مقصد اس کے اندر اس طرح ساری اور جاری ہو جائے گویا وہی اس کی روح ہے جس کی بدولت وہ زندہ اور متحرک ہے اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی زندگی کا یہ مقصد رکھتا ہو اور اسی مقصد کے لئے زندہ ہو وہ اس شخص کی طرح زندگی بسر نہیں کر سکتا، جس کے پیش نظر کوئی مقصد نہ ہو.... یہ مقصد تو اپنی عین فطرت کے اعتبار سے انسان کو ایک عامل اور کارکن ہستی میں تبدیل کر دیتا ہے ــــ ــــ ایسا عامل اور کارکن جو زندہ ہے صرف اس لئے کہ اپنی زندگی کے مقصد کو حاصل کرے۔"

ان واضح تصریحات کے باوجود صاحبِ تحریر بزرگ مولانا مودودی پر الزام لگا رہے ہیں کہ ان کے نزدیک "زمینی نتیجہ حاصل کرنا ہی" اصل "ہے۔ درحقیقت فاضل مصنف اسی مغالطے کا شکار ہیں جو پچھلی چند صدیوں کی تاریخ نے پیدا کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ زندگی اور اس کا دین "اصل" اور "تقاضے" میں تقسیم ہے۔ حقیقت و مجاز اور شریعت و طریقت کی دو الگ الگ قائم بالذات اکائیاں ہیں جن کی روشنی میں زندگی کے اجتماعی، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی معاملات میں دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنا ایک خالصتہً "سیاسی" معاملہ بن کر رہ گیا ہے اس کا قلب و روح کے ساتھ اور تزکیۂ و تقویٰ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اگر کوئی تعلق ہے بھی تو وہ محض تقاضے کا ضمنی تعلق ہے۔ اگر مولانا مودودی کے یہاں بھی صلوٰۃ معکوس، چلہ نشینی اور سلاسل طریقت کے شجرے وظیفہ کے طور پر پڑھنے کا رواج ہوتا تو پھر شاید ان کے تصورِ دین میں کوئی خرابی نظر نہ آتی۔

لیکن یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ مولانا محترم زندگی اور اس کے دین کی اس تقسیم کو قطعی ناروا سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام محض عقیدہ نہیں نہ وہ محض چند اعمال اور رسموں کا مجموعہ ہے بلکہ وہ انسان کے لئے ایک مفصّل پروگرام ہے، اس میں عقائد، عبادات اور عملی زندگی کے

اصول و قواعد الگ الگ چیزیں نہیں بلکہ سب مل کر ایک ناقابلِ تقسیم مجموعہ بناتے ہیں جس کے اجزاء کا باہمی ربط بالکل ویسا ہی ہے جیسا ایک زندہ جسم کے اعضاء میں ہوتا ہے اس پورے نظام میں قلب (یعنی عقیدہ) بہت اہمیت رکھتا ہے مولانا "اصل" اور "تقاضے" کی اسی تقسیم کو درست نہیں سمجھے۔

"اصل" اور "تقاضے" کی اس تقسیم کو نہ قرآن سے ثابت کیا جاسکتا ہے اور نہ سنت سے اس میں ایک عابدہ اور زاہدہ خاتون کو اگر اس سے اس کے ہمسائے نالاں ہیں تو سخت وعید سنادی جاتی ہے، لیکن اس کے برعکس ایک دوسری خاتون کو جو اگرچہ فرائض کی پابند تو ہے مگر ویسی عابدہ نہیں، لیکن اپنے پڑوسیوں سے حسنِ اخلاق سے پیش آتی ہے تو اسے جنت کی بشارت سنادی جاتی ہے[۱]

شریعت نے اس عابد اور شب زندہ دار حاکم کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے جس سے مخلوق خدا بیزار ہو اور اس حاکم کو بشارتیں سنائی ہیں جو اگرچہ اس درجہ کا عبادت گذار تو نہیں، لیکن اس سے خلق خدا خوش ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسی عورت دوزخ میں جھلستی ہوئی دکھائی دی۔ جس نے بلّی کو باندھ کر بھوکا پیاسا مارا تھا۔ آپؐ نے ایک "امرأة مومسة" (فاحشہ عورت) کو جنت میں دیکھا جس نے پیاسے کتّے کو پانی پلایا تھا[۲]۔ قرآن اس گروہ کو افسوس ناک انجام کی خبر دیتا ہے جس نے ان لوگوں کی اصلاح کی کوشش کو لاحاصل سمجھ کر اپنی انفرادی نیکی پر قناعت کرلی تھی جنھوں نے "یوم سبت" کے اجتماعی نظامِ عبادت کو درہم برہم کردیا تھا، اور اس گروہ کی تعریف کرتا ہے جس نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اجتماعی فریضے کو سرانجام دینے کی جدوجہد کی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دین کا خارجی پہلو ہی اصل ہے اور اس کے حیاتی اور روحانی پہلو کی کوئی اہمیت نہیں۔ قرآن وسنت سے جہاں دین کے خارجی پہلو کی اہمیت ثابت ہوتی ہے، وہاں وہ اس کے باطن کو بھی اہم تر بتاتے ہیں۔ مثلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذیل کے ارشاد گرامی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان کی عبادات کا خارجی پہلو بغیر "قلبی" اور حیاتی پہلو کے بالکل اس طرح ہے جیسے کوئی پھول بغیر خوشبو کے:۔

"اس امت میں کچھ لوگ پیدا ہوں گے، اس درجہ عبادت گذار ہوں گے کہ ان کی نمازوں کے سامنے تمہیں اپنی نمازیں ہیچ نظر آئیں گی۔ قرآن کی تلاوت بھی کریں گے مگر وہ ان کے گلے سے نیچے نہیں اُترے گا دین سے اس طرح نکل جائیں گے جس طرح تیر شکار سے۔ تیرانداز اپنے تیر کی لکڑی کو دیکھتا ہے اور پَروں کو دیکھتا ہے پھر اس کے پچھلے حصّے کو دیکھتا ہے مگر اس کو شبہ ہی رہتا ہے کہ اس میں کہیں خون کا نشان بھی لگا ہے یا نہیں"

(بخاری و مسلم بحوالہ ترجمان السنّہ ۱۱۲)

قرآن وسنت کے واضح دلائل کی روشنی میں اصل اور تقاضے کی اس تقسیم کو ہرگز ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ دین کے اس طرح خانے بنانا اور پھر ان کو قائم بالذات سمجھنا صریحاً غلط ہے۔ دین پوری زندگی پر محیط ہے۔ زندگی کی مختلف الاطراف وسعتوں کو سمیٹ کر ایک وحدت میں پروتا ہے اور اس کی منتشر الاجزاء اکائیوں کو ایک نظم میں منسلک کرتا ہے۔

اسی وجہ سے مولانا مودودی نے "دین حق" کا ترجمہ اسلامی زندگی، حکومتِ الٰہیہ، اسلام کا نظام حیات وغیرہ جیسے الفاظ سے کیا ہے پھر دین حق کی یہ تعبیر ایسی بھی نہیں جس کے قرآن کے الفاظ متحمل نہ ہوں اور جسے قرآن وسنت کی نصوص سے ثابت نہ کیا جاسکتا ہو۔۔۔ ذیل میں صرف دو آیات درج کی جاتی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے ناظرین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانائے محترم پر فاضل مصنف کی خفگی بلاوجہ ہے:۔

(۱) وقاتلوا الذین لایؤمنون باللّٰہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرّمون ما حرّم اللّٰہ ورسولہ ولا یدینون	اہلِ کتاب میں سے جو لوگ اللہ کو نہیں مانتے (یعنی اس کو واحد اور مقتدا اعلیٰ تسلیم نہیں کرتے) اور نہ یوم آخرت (یعنی یوم الحساب

[۱] تفصیل کیلئے ترجمان السنۃ حصہ دوم ص۱۷۵ ملاحظہ کریں۔

[۲] حجۃ اللہ البالغہ مترجم ص۲۶ ج۲ ۹۳ سیرت النبیؐ جلد ششم ص۵۶۔

دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتیٰ یعطوا الجزیۃ عن یدٍ وّھم صاغرون ط۔ | اور یوم الجزاء) کو مانتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام مانتے ہیں جنھیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ ادا کریں اور چھوٹے بن کر رہیں۔

مولانا مودودی نے "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" میں صرف "دین حق" کے اصطلاحی مفہوم کو نمایاں کیا ہے اس کتاب میں مولانا نے اس آیت کا مکمّل تفسیری مفہوم بیان نہیں کیا۔ اس لئے تفہیم القرآن سے رجوع کرنا چاہیئے۔ کتاب مذکور میں مولانا محترم نے "دین حق" کا جو اصطلاحی مفہوم تحریر فرمایا ہے وہ یہ ہے:۔

"اس آیت میں "دین حق" اصطلاحی لفظ ہے جس کے مفہوم کی تشریح واضح طور پر جل شانہٗ نے پہلے تین فقروں میں خود ہی کردی ہے ہم نے ترجمہ میں نمبر لگا کر واضح کر دیا ہے لفظ دین کے چاروں مفہوم ان فقروں میں بیان کئے گئے ہیں پھر ان کے مجموعے کو دین حق سے تعبیر کیا گیا ہے"۔ (صفحہ ۱۵۶)

اس پر فاضل بزرگ احتساب فرماتے ہیں:۔

"اس استدلال سے جو معنی نکالے گئے ہیں میرے علم کی حد تک وہ نہ کسی مفسر نے بیان کئے ہیں اور نہ آیت کے الفاظ اس کے متحمل ہیں"۔ (صفحہ ۲۸۳)

ان الفاظ کے بعد محترم موصوف نے مختلف مفسرین کی آراء پر مختصر تبصرہ کرنے کے بعد اس آیت کی خود "تاویل" فرمائی ہے، اس سلسلے میں امام رازیؒ، البحر المحیط اور ابن جریر طبری کے تین نامکمّل حوالے دے کر جو مطلب تحریر فرمایا ہے وہ حسب ذیل ہے:۔

"اس تشریح کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہوا کہ آخری رسولؐ پر ایمان لانے اور خدائی مذہب کی تعلیمات چھوڑنے کے بعد ان کے لئے نجات کی صورت یہ تھی کہ وہ دین حق کی سیاسی اطاعت قبول کرلیں مگر اس کے لئے بھی وہ تیار نہیں ہیں جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے اس کے لئے تو انھیں مجبور نہیں کیا جا سکتا مگر آخری چیز کے لئے تو انھیں بہر حال مجبور کیا جائے گا اور اس وقت تک ان سے جنگ کی جائے گی جب تک کہ وہ اسلامی ریاست کی ماتحتی پر مجبور نہ ہو جائیں"۔ (صفحہ ۲۸۶)

فاضل ناقد کی اس تاویل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکم قتال کا سبب صرف "لا یدینون دین الحق" کا فقرہ ہے، جہاں تک آیت کی پہلی تین باتوں کا تعلق ہے نہ تو وہ "حکم قتال" کا باعث ہیں اور نہ ان کا لا یدینون دین الحق سے کوئی معنوی ربط ہے۔

مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محترم وحید الدین خاں صاحب نے یہ "تاویل" کس دلیل کی بناء پر اختیار کی ہے۔ کیا قرآن کا ظاہر اس مفہوم کا متحمل ہے۔ کیا کوئی نص اس کی تائید میں ہے کیا ان اسلاف میں سے کسی نے یہ "تاویل" کی ہے جن کی محبت کے بڑے بلند بانگ دعوے صاحب موصوف نے کئے ہیں یا محض مولانا مودودی کے جوش تردید میں انکی ذہانت نے قرآن کے ان الفاظ کو ایک نئے مفہوم کا جامہ عطا کیا ہے۔

اس کا جواب قارئین مندرجہ ذیل حوالوں سے خود اخذ کر سکتے ہیں۔ سب سے پہلے مصنف نے قرطبیؒ کا حوالہ نقل کر کے لکھا ہے:۔

"ایک گروہ "یدینون دین الحق" سے "استسلام" یعنی اسلام قبول کرنا مراد لیتا ہے" (صفحہ ۲۸۴)

اس حوالے سے چونکہ مولانا مودودی کی تائید کا پہلو نکلتا تھا لہٰذا اسے قبول نہیں کرتے بلکہ اس پر تنقید فرماتے ہیں، کیونکہ (اسلاف) کا "ایک گروہ" "دین الحق" سے "سیاسی ماتحتی" کا مفہوم مراد نہیں لیتا بلکہ ایک ایسی اصطلاح مراد لیتا ہے جو ایک طرف "حکم قتال" کا سبب بھی ہے اور دوسری طرف اس میں آیت مذکور کی اوّل الذکر تینوں باتیں بھی شامل ہیں۔

دوسرا حوالہ بھی خود مصنف نے ابن جریر طبری سے نقل کیا ہے:-

" ولا یدینون دین الحق) یطیعون اللہ طاعت الحق..... ولا یدینون دین الحق کا مطلب یہ ہے کہ ٹھیک ٹھیک اللہ کی اطاعت نہیں کرتے" (ص۲۸۶)

اس حوالے کو موصوف نے اپنی تاویل کی تائید میں نقل کیا ہے لیکن یطیعون اللہ طاعۃ الحق سے "سیاسی ماتحتی" کا جس طرح مفہوم نکالا گیا ہے وہ کم از کم راقم کے فہم سے بعید ہے۔ محترم موصوف کی اس تاویل سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلاف کی تحریروں کے ساتھ خود ان کے عقیدتمند کیا سلوک کر رہے ہیں۔

تیسرا حوالہ بھی مصنف نے دیا ہے مگر قوسین میں ساتھ ہی امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کا نام درج فرما کر اپنی اس نادر تاویل سے قارئین کو مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اول تو جو نامکمل اور ناقص حوالہ موصوف نے نقل کیا ہے، اس سے بھی ہرگز موصوف کی تاویل کی تائید نہیں ہوتی اور پھر وہ لا یدینون دین الحق کی بھی تفسیر نہیں بلکہ امام رازیؒ نے اس فقرے میں "حکم قتال" کے اس فرق کو نمایاں کیا ہے جو اہل کتاب اور مشرکین کے درمیان ہے ـــ صاحب تحریر بزرگ نے جس بات کی تائید میں امام موصوف کا جو حوالہ درج کیا ہے وہ حسب ذیل ہے

" یہاں یدینون دین الحق کا فقرہ دین حق کی سیاسی اطاعت قبول کرنے کے معنی پر آیا ہے لا یؤمنون باللہ..... ما حرم اللہ ورسولہٗ تک ان کے ایمان نہ لانے کا ذکر ہے اور اس کے بعد ولا یدینون دین الحق میں سیاسی اطاعت قبول نہ کرنے کا..... اہل کتاب کے لئے صحیح تو یہ تھا کہ وہ نبی آخر الزماں پر ایمان لاتے جس کی انھیں عرصے سے بشارت دی جاتی رہی ہے مگر جب انھوں نے ایسا نہیں کیا تو دوسری متبادل صورت یہ تھی کہ وہ نبی کی سیاسی اطاعت پر راضی ہو جائیں (الواجب فی المشرکین القتال او الاسلام والواجب فی اھل الکتاب القتال او الاسلام او الجزیہ ـ (رازی جلد ۴ – ۷۱۲) مگر اس دوسری صورت پر بھی آمادہ نہیں ہوئے اور جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے وہ لازماً مطلوب ہے، اس لئے حکم دیا گیا ہے کہ ان سے جنگ کرو تا انہیں اس پر مجبور کر دو" (ص۲۸۵)

قارئین کرام مندرجہ بالا اقتباس کا بغور مطالعہ فرمائیں اور خود ہی فیصلہ کریں کہ امام رازیؒ کا جو نامکمل فقرہ جناب موصوف نے نقل کیا ہے کیا اس سے اس تاویل کی تائید ہوتی ہے۔ پھر امام رازی رحمۃ اللہ نے اپنی تفسیر میں جو کچھ اس آیت کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے اسے بھی دیکھ لیں:-

اعلم انہ تعالیٰ ذکر اھل الکتاب اذا کانوا موصوفین بصفات اربعۃ وجبت مقاتلتھم الی ان یسلموا او الی ان یعطوا الجزیۃ (فالصفۃ الاولیٰ) لا یؤمنون باللہ..... (والصفۃ الثانیۃ) منھم صفاتھم انھم لا یؤمنون بالیوم الآخرۃ..... (والصفۃ الثالثۃ) من صفاتھم ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ فیہ وجھان الاول لا یحرمون ما حرم فی القرآن والسنۃ والثانی قال ابو روق لا یعلمون بما فی التوراۃ والانجیل بل حرفوھما واتوا باحکام کثیرۃ من قبل انفسھم..... (والصفۃ الرابعۃ) لا یدینون دین الحق قولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب یقال فلان یدین بکذا اذا تخذہ دیناً فھو معتقدہ قولہ ولا یدینون دین الحق الی لا یعتقدون فی صحۃ دین الاسلام الذی ھو دین الحق..... ولما ذکر تعالیٰ ھذہ صفات الاربعۃ قال من اھل الکتاب والمقصود تمیزھم من المشرکین فی الحکم الواجب فی المشرکین القتال او الاسلام والواجب فی اھل الکتاب

القتال او الاسلام او الجزیۃ.....

امام رازیؒ کی اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اہلِ کتاب میں جب یہ چار صفتیں پیدا ہو جائیں تو ان سے قتال واجب ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ یا تو اسلام قبول کرلیں یا ماتحت رہ کر جزیہ دیں اور وہ چار صفتیں یہ ہیں:-

(۱) وہ اللہ پر ایمان نہیں لاتے (۲) وہ یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (۳) وہ تحریم ما حرم اللہ ورسولہٗ کے قائل نہیں یعنی جن باتوں کو قرآن وسنت میں حرام قرار دیا گیا ہے ان کو نہیں مانتے اور نہ ہی بقول ابوروق' تورات اور انجیل پر عمل کرتے ہیں بلکہ ان کے بیشتر احکام کو بدل ڈالا ہے۔ (۴) وہ دین حق کو قبول نہیں کرتے ــــ اگر کوئی شخص کسی عقیدے کو اپنالے تو وہ اس کا معتقد کہلاتا ہے اس کے لئے عربی میں "فلان یدین بکذا" استعمال ہوتا ہے۔ پس لا یدینون دین الحق کے معنی یہ ہیں کہ وہ دین اسلام جو دین حق ہے کی صداقت پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان صفات کے ذکر کے بعد اہل کتاب کا ذکر فرما کر مشرکین اور اہل کتاب کے درمیان حکم قتال کے باب میں امتیاز پیدا کر دیا ہے مشرکین سے قتال اس وقت تک واجب ہے یہاں تک کہ وہ اسلام قبول کرلیں اور اہلِ کتاب سے قتال اس وقت تک ہوتا رہے گا یہاں تک کہ وہ یا تو اسلام قبول کرلیں یا جزیہ دے کر ماتحت رہنا قبول کرلیں۔

امام رازیؒ کی اس تفسیر سے محض "سیاسی ماتحتی" کا مفہوم اخذ کرنا بہت بڑی علمی جسارت ہے اور یہ قریب قریب وہی انداز تاویل ہے جو قادیانی حضرات آیۂ خاتم النبیین سے اجراءِ نبوت ثابت کرنے کے لئے اختیار کرتے ہیں۔ سلف کی محبت کے دعویداروں کو تو اس انداز کی تاویل سے اجتناب کرنا چاہیئے تھا ــــ!

امام رازیؒ کی تفسیر کے مطابق اگر "یدینون دین الحق" سے دین اسلام پر اعتقاد مراد لیا جائے تو ایک طرف منجملہ ان چار صفات کے ایک صفت بھی ہوگی جن کی بناء پر اہلِ کتاب کے ساتھ قتال کا حکم دیا گیا ہے اور دوسری طرف وہ سابقہ تین صفات اس چوتھی صفتِ جامع ــــ دین اسلام ــــ میں بھی شامل ہیں۔ اسی لحاظ سے یہ تشریح مولانا مودودی کی مکمل تائید کرتی ہے۔

● ــــ مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی امام رازیؒ کا تتبع کیا ہے۔ انھوں نے لا یدینون دین الحق کے بارے میں تحریر فرمایا ہے کہ "اور نہ سچے دین اسلام کو قبول کرتے ہیں"۔

● ــــ تفسیر ابن کثیر سے بھی "سیاسی ماتحتی" کا مفہوم ثابت نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی امام رازیؒ کی تفسیر ہی کو تقویت ملتی ہے۔

● ــــ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے آیت زیر بحث کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:-

"جب مشرکین کا قصہ پاک ہوگیا تو حکم ہوا کہ اہل کتاب کی قوت وشوکت کو توڑو۔ اس لئے اجازت دی گئی کہ اگر یہ لوگ ماتحت بن کر جزیہ دینا منظور کرلیں تو کچھ مضائقہ نہیں' قبول کرلو۔ پھر حکومت اسلامیہ ان کی جان ومال کی محافظ ہوگی ورنہ ان کا علاج بھی وہی ہے جو مشرکین کا تھا' کیونکہ یہ بھی اللہ اور یوم آخرت پر جیسا چاہیئے تھا ایمان نہیں رکھتے نہ خدا اور رسول کے احکام کی کچھ پرواہ کرتے ہیں۔ رسول کریمؐ تو کجا اپنے تسلیم کردہ نبی مسیح علیہ السلام کی سچی پیروی نہیں کرتے محض اہواء اور آراء کا اتباع کرتے ہیں جو سچا دین آیا ــــ یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کے زمانے میں اور جو اب نبی آخر الزماں لے کر آئے کسی کے قائل نہیں"۔

مفسرین کی ان تشریحات کی روشنی میں فاضل موصوف کی نادر "تاویل" کی حقیقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے.....

مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ "دین حق" سے مراد "دین اسلام" ہے اور "یدینون دین الحق" کے معنی ہیں "دین حق" کو قبول کرلینا" اس کی صحت پر اعتقاد" کا ہونا جیسا کہ قرطبی' امام رازی' مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہم کی تفسیروں سے ظاہر ہوتا ہے ــــ ظاہر بات ہے کہ دین اسلام میں ایمان باللہ' ایمان بالآخرہ اور تحریم' حرم اللہ ورسولہٗ جیسی سب باتیں شامل ہیں اور اہل کتاب کا جرم یہ ہے کہ وہ ایمان باللہ' ایمان بالآخرۃ

اور تحریم ما حرّم اللہ ورسولہ جیسی متفق علیہ باتوں کو بھی نہیں مانتے اور اس دین حق کو بھی نہیں مانتے جن میں سابقہ ساری باتیں بھی شامل ہیں اور جواب ربّ کائنات کی طرف سے ایک کامل اور اکمل پوری انسانی زندگی کا بس واحد نظام یہی ہے ـــ یہ چاروں کی چاروں باتیں حکم قتال کے سبب میں داخل ہیں نہ کہ محض آخری صفت جس کے معنی بھی مصنف کے نزدیک محض "سیاسی ماتحتی" قبول کرنے کے ہیں۔

دوسری آیت جس پر خاں صاحب محترم نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ ریسرچ کی ہے وہ سورہ شوریٰ کی یہ آیت ہے :-

شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہٖ نوحاً وّ الذی اوحینا الیک وما وصّینا بہٖ ابراھیم وموسٰی وعیسٰی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ (شوریٰ - ۱۳)

تمھارے لئے وہ آئین مقرر کیا جس کی اقامت کا حکم دیا تھا نوح کو اور جس کے لئے ہم نے وحی بھیجی ہے تیری طرف اور جس کی اقامت کا ہم نے حکم دیا ابراہیم اور موسیٰ و عیسیٰ کو بایں مضمون کہ قائم کرو دین کو (قائم کنید دین را) اور اس میں متفرق نہ ہو ـــ (ترجمہ از فارسی - از شاہ ولی اللہؒ)

فاضل محتسب تحریر فرماتے ہیں کہ :-

" اس آیت سے استدلال کیا جاتا ہے کہ اس میں "الدین" سے مراد وہ سارے انفرادی و اجتماعی قومی و بین الاقوامی احکام ہیں جو اسلامی شریعت میں ملتے ہیں اور اقامت کا مطلب ہے ان کو قائم کرنا ـــ اس طرح یہ آیت پورے شرعی نظام کی ایسی تفسیر ہے - جو میرے علم کی حد تک کسی قابل ذکر مفسر نے اب تک نہیں کی ـــ تمام علماء تفسیر اس آیت میں الدین سے مراد اصل دین یا دین کی بنیادی تعلیمات لیتے ہیں نہ کل دین - ان کے نزدیک یہاں اقامت سے مراد سارے شرعی نظام کو لوگوں کے اوپر قائم کرنا نہیں بلکہ دین کے اس بنیادی حصّہ کو پوری طرح اختیار کرنا ہے جو ہر شخص سے ہر حال میں لازمی طور پر مطلوب ہے اور جس کو اپنی پوری زندگی میں شامل کر لینے کے بعد کوئی شخص خدا کی نظر میں مسلمان بنتا ہے" (ص ۳۱۳)

یہ بات تو الگ ہے کہ " اقامتِ دین" سے مراد کیا ہے؟ آیا اس کا مطلب صرف دین پر قائم رہنا ہے اور دین کے "بنیادی حصّہ" کو اختیار کرنا ہے یا اس سے دین کو انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی شعبوں میں قائم کرنا مراد ہے یہ بحث ہمارے موضوع سے سردست خارج ہے - ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قابل ذکر مفسرین نے " الدین" کی کیا تشریح کی ہے - صاحب تحریر بزرگ کے نزدیک الدین سے مراد " اصل دین" ہے - بہتر ہوتا اگر صاحب موصوف "اصل دین" کی ایک باقاعدہ فہرست مرتب کر کے بات کو واضح فرما دیتے تاکہ معلوم ہو جاتا کہ ان کے نزدیک اصل دین کا مفہوم کیا ہے اور کن باتوں کو وہ اصل دین قرار دیتے ہیں اور کونسی باتیں اس دائرے سے باہر ہیں - بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک اصل دین سے مراد وہی چند باتیں ہیں جو ہر مسلمان " ایمان مفصّل" میں پڑھتا ہے - پھر یہ آیت چونکہ مکّی ہے اور جب یہ اتری تھی تو روزہ، حج اور زکوٰۃ وغیرہ کی فرضیت کے احکام بھی ابھی تک نہیں دیئے گئے تھے، لہٰذا بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ جو احکام بعد میں نازل ہوئے وہ مکّی آیت کے مفہوم میں داخل نہیں ہو سکتے اس لئے وہ سارے احکام بھی جو ہجرت کے بعد نازل ہوئے صاحب موصوف کی تفسیر کی رو سے اصل دین " دین کی بنیادی تعلیمات" کی فہرست میں غالباً شامل نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ موصوف کے نزدیک اقامتِ دین کے اس حکم میں وہ شریعت داخل نہیں جو خاص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی اور جو اصل دین کے ساتھ مل کر دین کو کامل اور مکمل ـــ الدین بناتی ہے ـــ لہٰذا وہ بے شمار احکام اور اجزاء دین بھی جو

مدنی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے تھے وہ الدین کی فہرست میں شامل نہیں ہوتے چاہئیں۔ لیکن چوں کہ موصوف نے ایسی کوئی جامع فہرست مرتب نہیں فرمائی اس لئے ان کے نقطۂ نظر کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

اب ہم قابلِ ذکر بزرگوں میں سے صرف حضرت شاہ ولی اللہ کی وہ تشریح نقل کرتے ہیں جو موصوف نے آیت زیر بحث کے ذیل میں "الدین" کی وضاحت میں لکھی ہیں:۔

"اصل دین ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، جس میں تمام انبیاء علیہ السلام متفق رہے ہیں۔ اختلاف صرف شرائع اور مناہج میں رہا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سارے انبیاءؑ اس بات پر متفق رہے ہیں کہ عبادت اللہ واحد کی کرنی چاہیئے اور مدد بھی صرف اسی سے مانگنی چاہیئے اور اسے ہر نقص سے پاک یقین کرنا چاہیئے اور اس کی صفات میں الحاد کو حرام سمجھنا چاہیئے۔ بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ اس کی پوری پوری تعظیم کریں اور اس میں ذرہ برابر کوتاہی سے کام نہ لیں اس کے حضور چہروں اور دلوں کو جھکادیں اس کے شعائر کے ذریعہ اس کی نزدیکی چاہیں یہ یقین رکھیں کہ وہ واقعات کو وجود میں لانے سے پہلے ہی انھیں مقدر کرچکا ہوتا اس کے فرشتے اس کے تابع فرمان ہیں، کبھی اس کی نافرمانی نہیں کرتے وہ اپنی کتاب جس پر چاہتا ہے نازل کرتا ہے اور اس کی اطاعت بندوں پر واجب قرار دیتا ہے۔ قیامت کا آنا مرنے کے بعد اُٹھایا جانا اور جنت و دوزخ سب برحق ہیں۔ اسی طرح یہ حضرات (انبیاء) "بر" اور خیر و صلاح کی تمام اقسام طہارت، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج نیز دعا، ذکر اور تلاوت کتاب جیسی نفل عبادتوں کے ذریعہ اللہ کی قربت کے حصول پر متفق ہیں، پھر اسی طرح نکاح کی مشروعیت، زنا کی حرمت پس یہ وہ امور ہیں جو "اصل دین" ہیں۔ چونکہ یہ سب امور ان سب لوگوں میں مسلم تھے جو قرآن کے مخاطب تھے، اس لئے اس نے ان کی لمیت کے بارے میں بہت کم گفتگو کی ہے۔ اختلاف (حضرات انبیاء علیہم السلام کے دینوں میں جو کچھ تھا وہ) ان اصولی اُمور کی صرف صورتوں اور قالبوں میں تھا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں قبلہ بیت المقدس تھا اور شریعت محمدیہ میں کعبہ ان کے یہاں زانی کی سزا صرف رجم تھی ہمارے یہاں محصن کے لئے رجم ہے اور دوسروں کے لئے سو کوڑوں کی مار۔ ان کے یہاں صرف قصاص کا حکم تھا ہمارے یہاں قصاص اور خون بہا دونوں مشروع ہیں۔ اسی طرح عبادات کے اوقات اور ان کے آداب اور ان کے ارکان مختلف شریعتوں میں مختلف رہے ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ مترجم)

شاہ صاحب کے ان ارشادات کا مفہوم بالکل واضح ہے یعنی یہ کہ آپ کے نزدیک آیتِ مذکورہ بالا میں جس "الدین" کی اقامت کا حکم ہے وہ اپنی منطقی عملی تفصیل میں دین و شریعت کے پورے مجموعہ پر حاوی ہے اور اس کے اصل دین یا تمام انبیاء کا متفقہ دین ہونے کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اس کی حدیں صرف ایمانیات یا ایمانی صفات تک یا ان سے کچھ آگے بڑھکر اخلاق حسنہ اور معروف عبادات تک ہی محدود ہیں، بلکہ اصل دین ہونے کے باوجود اس کی حدود میں اقامۃ العدل بین الناس (معاشرے میں عدل و انصاف کا قیام) تحریم مظالم (مظالم کی حرمت و ممنوعیت) الجہاد مع اعداء اللہ (دشمنان خدا سے جہاد) جیسے احکام و ہدایات بھی شامل ہیں جس کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے تو اقامتِ دین کے اس حکم خداوندی کی تعمیل منطقی طور پر پورے دین کی اقامت کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتی (رسالہ زندگی رامپور۔ شعبان ۸۳ھ)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے "الدین" کی جو مفصل شرح فرمائی ہے اسے دیکھنے کے بعد قارئین کرام وحید الدین خاں صاحب کے نقل کردہ گیارہ مفسرین کے ان احوالوں کا مطالعہ کریں جنھیں فاضل موصوف نے بڑی محنت سے جمع کرکے اپنی کتاب میں درج فرمایا ہے۔ اس سے اس بات کا بخوبی

اندازہ ہو سکے گا کہ خود مصنف کو مفسرین کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں کس قدر التباس ہوا ہے۔

مفسرین نے جس بات کو اجمالاً تحریر کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ رحؒ نے اس کی شرح تحریر فرما کر بات کو واضح کر دیا ہے۔ مثلاً صاحب موصوف خازن کا یہ حوالہ درج کیا ہے:۔

"یہاں اقامت دین سے مراد، توحید، اس کی کتابوں اور رسولوں اور یوم آخرت پر ایمان لانا اور احکام اور ممنوعات میں اس کی اطاعت کرنا" ص۳۱۸

صاحب "خازن" نے اگر "الدین" کی فہرست میں "ملائکہ پر اور" والقدر خیرہ وشرہ پر ایمان کا ذکر نہیں کیا تو اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں کہ وہ ان باتوں کو "اصل دین" سے خارج قرار دیتے ہیں اور پھر خازن نے جن باتوں کو "احکام اور ممنوعات" کہا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے ان کی ایک مختصر فہرست دے دی ہے جس میں تحریم مظالم بھی ہے اور الجہاد مع اعداء اللہ بھی، اقامۃ العدل بین الناس بھی ہے اور اقامۃ الحدود علی اہل المعاصی جیسے احکام و ہدایات بھی شامل ہیں۔

مولانا مودودی نے بھی "الدین" کی اصطلاح کو اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے جس مفہوم کی شرح حضرت شاہ ولی اللہ رحمت اللہ علیہ نے فرمائی ہے اور قرآن میں متعدد مقامات پر الدین انھی معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون۔

اس آیت کے ذیل میں امام رازیؒ نے دین حق کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:۔

"کون دینہ مشتملاً علی امور لیظھر کل احد کونھا موصوفۃ بالصواب والصلاح مطابقۃ الحکمۃ والمنفعۃ فی الدنیا والآخرۃ وھو المراد من قولہ ودین الحق"۔

یہ وہ نظام زندگی ہے جسے خدا نے اسلام کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جیسے فرمایا ان الدین عند اللہ الاسلام۔

ابن جریر طبری نے اس کی ان الفاظ میں تفسیر فرمائی ہے:۔

"فتاویل قولہ ان الدین عند اللہ الاسلام ان الطاعۃ التی ھی الطاعۃ لہٗ واقرار الالسن، والقلوب لہٗ بالعبودیۃ والذلۃ وانقیادھا لہ بالطاعۃ فیما امر ونھی وتذللھا لہ بذالک من غیر استکبار علیہ ولا انحراف دون اشراک غیرہٖ من خلقہ معہ فی العبودیۃ والالوھیۃ"

دین کا یہی تصور ہے جس کی اقامت کا حکم سورہ شوریٰ کی آیت مذکورہ بالا میں دیا گیا ہے اور مولانا مودودی نے اس متفق علیہ تصور میں نہ کمی کی ہے اور نہ بیشی۔ ان کے نزدیک "الدین" پوری زندگی کو محیط ہے اور زندگی کا کوئی شعبہ اس سے باہر نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ مصنف موصوف نے مولانا مودودی کے تصور دین پر تنقید کرتے ہوئے حیرت انگیز حد تک فکری الجھاؤ کا مظاہرہ کیا ہے ان کی تنقید کا انداز کچھ اس قسم کا ہے کہ پہلے وہ مولانا مودودی سے ایک بات منسوب کرتے ہیں پھر اسے اپنے ذہنی مفہوم کا جامہ پہناتے ہیں اور پھر اسی خود ساختہ مفہوم کو سامنے رکھ کر تنقید کا بھرپور وار کرتے ہیں لیکن جب مزاج کی برہمی مائل بہ اعتدال ہوتی ہے، تو پھر مولانا مودودی کی کہی ہوئی بات کو اپنے مخصوص انداز میں دہرا دیتے ہیں اور اسی بات پر صاد بھی فرما دیتے ہیں، چنانچہ تصور دین پر پہلے یہ اعتراض کیا گیا کہ مولانا کا اسے نظام حیات کے لفظ سے تعبیر کرنا اور اسی کو اصل سمجھنا غلط ہے، پھر نظام حیات کے لفظ کو خود ساختہ مفہوم دے کر کہا گیا کہ نظام حیات دراصل ایک قانونی ڈھانچہ ہوتا ہے اسکے پیش نظر محض "زمینی نتیجہ" ہوتا ہے۔ درآنحالیکہ یہ دونوں باتیں غلط تھیں پھر ان پر زوردار تنقید کی جاتی ہے اور کئی صفحے لکھنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ دین نظام حیات بھی ہے اس میں وہ سارے احکام شامل ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے دور رسالت میں بتائے اور دین کا لفظ

ان سارے احکام اسلامی کا عنوان ہے۔

چنانچہ فرماتے ہیں :۔

"اوپر کے اقتباس میں اگر یہ بات کہی گئی ہوتی تو ہمیں اس سے اختلاف نہیں تھا کہ دین اپنی فہرست احکام کے لحاظ سے ان ساری چیزوں کا نام ہے جو زندگی کے مختلف انفرادی، اجتماعی معاملات کے لئے رسولؐ نے اپنے پورے دورِ رسالت میں بتائے اور اسی لئے دین کا لفظ سارے احکام اسلامی کا عنوان ہے ۔۔۔ یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے جس سے اختلاف کا کوئی سوال نہیں۔" ص۲۸۹

یہاں یہ بات واضح رہے کہ اسی کتاب کے صفحہ ۲۷۳ سے صفحہ ۲۸۹ تک ساری گفتگو مولانا مودودی کے اسی تصور دین پر ہوتی آرہی ہے اور کم و بیش ایک سو صفحے لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ "دین کا لفظ سارے احکام اسلامی کا عنوان ہے اور یہ ایک تسلیم شدہ بات ہے۔"

اگر یہ تسلیم شدہ بات تھی تو پھر یہ کہنے کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی تھی کہ مولانا مودودی کا تصور دین "قانونی اور سیاسی" قسم کے نظام کا تصور ہے جس کی ہیئت دین کی "مجموعی ہیئت" سے ٹکرا گئی، یہ ایک نیا مکان ہے جو پرانے مکان کو توڑ کر اس کے ملبے سے تیار کیا گیا ہے اور اگر یہ تسلیم شدہ بات تھی تو کم از کم اس تسلیم شدہ بات کی حد تک تو اہل دین کو ریب و تشکیک کے انجکشن دینے کی کوشش نہ کی جاتی ۔۔

یہ تو تھی محترم وحید الدین خاں کے استدلال کی خشتِ اوّل، جس کی بنیاد پر تنقید کی پوری عمارت تعمیر کرتے ہیں پھر اسی کی بنیاد پر توحید باری تعالیٰ کی مختلف صفتوں کو اصل اور تقاضے میں تقسیم کرتے ہیں، اسی کی بناء پر انبیاء علیہم السلام کے مشن کی ادیان باطلہ کے لئے ایک بے خطر تعبیر تجویز فرماتے ہیں اور پھر مولانا مودودی پر "دین کے مجروح" کرنے کے الزام کی بنیاد بھی اسی تصور کو قرار دیتے ہیں، لیکن پورے سو صفحات تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ تو تسلیم شدہ بات ہے تو پھر وہ کونسی بات ہے جس پر فاضل بزرگ اتنے خفا ہیں، اس کا خلاصہ خود انھی کے الفاظ میں یہ ہے :۔

"دین یا دینی مشن کے اس تصور پر ہم کو اعتراض ہے دوسرے لفظوں میں اسٹیٹ یا نظام قائم کرنے کے پہلو کو اصل دعوت نبوت کے طور پر پیش کرنا اور یہ کہنا کہ انبیاء اوّل روز سے اسی دعوے کے ساتھ اپنا کام شروع کرتے تھے صحیح نہیں۔ ہماری تنقید کا خلاصہ یہی ہے کہ جو چیزیں بعد از ایمان مختلف پہلوؤں سے دین میں شامل ہوتی ہیں، ان کو اس کتاب میں اصل دعوت نبوت کی حیثیت سے پیش کر دیا گیا ہے اسلئے ہمارا کہنا ہے کہ یہ کسی آئت سے ثابت نہیں۔" (ص۲۹۰)

قطع نظر اس کے کہ مولانا مودودی نے "دعوت نبوت" کن باتوں کو کن الفاظ میں قرار دیا ہے۔ اب مندرجہ بالا گفتگو سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہے کہ فاضل مصنف کے نزدیک تصور دین بھی صحیح ہے اور اس کا ساری زندگی کے احکام کا عنوان ہونا بھی درست ہے اور اس کے نظام زندگی ہونے پر بھی اب کوئی اعتراض کا پہلو نہیں لیکن اس نظام حیات کے قائم کرنے کی دعوت کو انبیاء کی بعثت کا مقصد قرار دینا غلط ہے اور ایمان کے علاوہ دین کے عملی اور خارجی حصّہ کو کار نبوت کے طور پر پیش کرنا بھی صحیح نہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بے شک دین ساری زندگی پر حاوی۔ مگر مولنا مودودی کا جرم یہ ہے کہ وہ دین کی دعوت صرف ایمانیت تک محدود نہیں رکھتے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ دین کو زندگی کے ہر میدان میں قائم کرنے کی کیوں دعوت دیتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضے کی ادائیگی کے لئے منظم جد و جہد کو کیوں لازم قرار دیتے ہیں اور کیوں وقت کے سب سے بڑے طاغوت ۔۔۔ منکر اعظم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کے حق برتری کو چیلنج کر رہے ہیں کیونکہ امر بالمعروف کا فریضہ تو شرطِ استطاعت کے ساتھ مشروط ہے اور مسلمانوں میں اس کی ادائیگی کی استطاعت تو ہے نہیں لیکن یہ علی الاطلاق سب کے لئے اوّلین فریضہ قرار دیئے جا رہے ہیں۔ قرآن میں یہ کہاں لکھا ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی اگر استطاعت نہیں تو ضرور

"صاحب نصاب" بننے کی کوشش کرو۔ یہ کس بزرگ نے فرمایا ہے کہ اگر دین حق مغلوب ہو جائے تو تم میں "اظہار دین" اور امت کی تنظیم کرنے کی استطاعت نہ ہو تو تم استطاعت حاصل کرنے کی جدوجہد کرو۔ گھر جلتا ہے تو جل جانے دو ہم میں استطاعت ہو گی تو ہم آگ بجھائیں گے۔ استطاعت کی جدوجہد کا حکم کس آئت، کس حدیث اور اسلاف میں سے کس بزرگ نے دیا ہے یہ مولانا مودودی کا خود اختراع کردہ فلسفہ ہے اور یہ دین کی غلط تعبیر ہے اور یہ ابھی کہ مبارک ہو اس فلسفہ نے دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس دین کی اقامت کا انبیاء علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا۔ کیا وہ صرف ایمانیات تک محدود تھا یا اس میں وہ سارے خارجی احکام شامل تھے جن کی ایک فہرست شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی مذکورۂ بالا تحریر میں درج ہے۔ اگر دین، ایمان اور عمل کے مجموعے کا نام ہے تو پھر صاحب تحریر بزرگ کو دعوتِ نبوت کو صرف ایمانیات تک محدود کرنے کا حق آخر کس دلیل کی بناء پر حاصل ہے اور اگر دین کا وہی تصور صحیح ہے جو اوپر بیان کر آئے ہیں تو پھر اس کی اقامت بھی صحیح ہو گی اور اگر وہ تصور غلط ہے تو پھر اس تصور کو بعثت کا مشن بنانا بھی غلط ہو گا۔

مگر محترم وحید الدین خاں کے نزدیک دین کی پوری زندگی کا عنوان ہونا تو غلط نہیں لیکن اس کی اقامت کو نصب العین بنانا پھر اس کے لئے جدوجہد کرنا غلط ہے۔ محترم موصوف اپنے استدلال کے اس تضاد کو غالباً محسوس نہیں کریں گے، کیونکہ وہ ذہن اور نفسیات کی ایک ایسے مخمصے میں پھنس گئے ہیں جس سے نکلنا بہت دشوار ہے!

منقول از ماہنامہ "زندگی" رامپور

رسائل و مسائل

جماعت اسلامی ہند کی تعریف و تحسین

مکتوب

جناب ایڈیٹر صاحب السلام علیکم۔

مجھ سے آپ واقف نہیں ہیں لیکن میں زندگی پڑھتا رہتا ہوں اور اس طرح آپ سے غائبانہ واقف ہوں دنیا میں اسلام کو سربلند کرنے کے لئے جو تحریکیں چل رہی ہیں مجھے ان سب سے دلچسپی ہے میں "دعوت" دہلی اور دوسرے اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ میں نے جماعت اسلامی ہند اور جماعت اسلامی پاکستان کے دستور بھی پڑھے ہیں اس سال یہاں کی جماعت نے پالیسی اور پروگرام کا جو پمفلٹ شائع کیا ہے میں نے اسے بھی پڑھا ہے۔ میں لٹریچر بھی پڑھتا رہتا ہوں مجھے آپ لوگوں کی ایک حرکت سے حیرت ہوتی ہے اسلئے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ صدق جدید میں کئی دفعہ جماعت اسلامی پاکستان کے مقابلے میں یہاں کی جماعت کی ایسی تعریف پڑھ چکا ہوں جس سے وہاں کی جماعت کی مذمت ہوتی ہے لیکن نہ دعوت میں نہ زندگی میں اس کے خلاف میں نے کوئی تحریر پڑھی یہ کیا بات ہے۔ میری واقفیت تو یہ ہے کہ دونوں جماعتوں کا نصب العین ایک ہے نظریات بھی ایک ہیں پھر ایک کی تعریف اور ایک کی مذمت کیوں۔ ۱۱ر دسمبر ۶۴ء کے صدق جدید میں پھر دونوں کا ذکر آیا ہے اور ایسے موقع اور ایسے انداز سے آیا ہے کہ غور کیا مگر مناسبت سمجھ میں نہ آئی۔ جین صاحب کی ایک تقریر کا اقتباس دیتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اور پھر فرمایا (یعنی جین صاحب نے) راشٹریہ سیوک سنگھ، جن سنگھ، جماعت اسلامی اور مسلم لیگ جیسی فرقہ پرست جماعتوں کو دوسرے ملکوں میں برداشت نہیں کیا جا سکتا"

یہ اقتباس دینے کے بعد مولانا دریابادی صاحب تحریر فرماتے ہیں "اس حسن انصاف کو کیا کہئے۔ جس نے دو پہلی جماعتوں کو دو پچھلی جماعتوں کے ساتھ ایک صف میں لاکھڑا کیا۔ اور اتنی موٹی سی بات اب جین صاحب کو کون بتائے کہ نام کے اشتراک سے دھوکا نہ کھائیے اور ہندوستان کی جماعت اسلامی کو پاکستان کی جماعت اسلامی پر قیاس کسی طرح نہ فرمائیے۔ مسلم لیگ تو خیر پھر ایک سیاسی جماعت ہے لیکن ہند کی جماعت اسلامی اصلاً ایک دینی جماعت ہے اور بڑی تن دہی سے رفاہی اور تعمیری کاموں میں مصروف ہے"

صدق جدید ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۴ء

کیا جین صاحب نے یا مرارجی نے یہاں کی جماعت اسلامی کو فرقہ پرست وہاں کی جماعت کے قیاس پر کہا ہے؟ پھر مولانا دریابادی کا یہ کہنا کہ یہاں کی جماعت کو وہاں کی جماعت پر قیاس نہ کیا جائے کیا معنی رکھتا ہے اور اگر وہ لوگ قیاس کریں تو غلط کیوں ہے جبکہ دونوں کا نصب العین اور مقصد ایک ہے دو جماعتوں میں مشابہت نصب العین اور مقصد سے نہ ہوگی تو پھر کس چیز سے ہوگی؟ اگر جین صاحب کہیں کہ میرا قیاس صحیح ہے تو کیا

جواب ہوگا، کیا وہاں کی جماعت عملی سیاست میں حصہ لینے کی وجہ سے فرقہ پرست ہے؟ کیا اب فرقہ پرستی کی یہ تعریف ہوگی کہ جو جماعت عملی سیاست میں حصہ لے وہ فرقہ پرست اور جو نہ لے وہ غیر فرقہ پرست۔

یہاں کی جماعت کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ وہ تعمیری اور رفاہی کام کر رہی ہے جس سیاق میں یہ کہا گیا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں کی جماعت تخریبی کام کر رہی ہے کیا واقعی آپ لوگ وہاں کی جماعت کی تخریب و مذمت کی قیمت پر اپنی تعریف پڑھکر خوش ہوتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ دریابادی صاحب دونوں جماعتوں میں اختلاف اور غلط فہمی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر اس خط کا جواب دینا ہو تو زندگی میں دیں، مجھے ذاتی جواب کی ضرورت نہیں ہے۔

جواب

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ دنیا کی ہر ایسی جماعت سے دلچسپی رکھتے ہیں جو اسلام کو سر بلند کرنے کی جد و جہد کر رہی ہے خدا کرے یہ دلچسپی ترقی کرے اور آپ عملاً بھی اس جد و جہد میں حصہ لینے لگیں۔

آپ کا یہ مطالعہ صحیح ہے کہ جماعت اسلامی ہند و پاکستان تنظیمی حیثیت سے اب دو الگ اور مستقل جماعتیں ہیں لیکن دونوں کا نصب العین اور مقصد بالکل ایک ہے اور دونوں ایک ہی مقصد کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ اور وہ ہے دین حق کی اقامت ——— بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اقامتِ دین تو پوری امت مسلمہ کا نصب العین اور مقصدِ حیات ہے یہ اور بات ہے کہ اس امت کی بہت بڑی تعداد اس کا شعور نہیں رکھتی۔ جب حقیقت یہ ہے تو دنیا میں جتنی جماعتیں بھی خلوص کے ساتھ اس نصب العین کے حصول کے لئے کام کر رہی ہیں ان کے درمیان رشتہ، خیر خواہی، ہمدردی اور تعاون ہی کا ہو سکتا ہے۔

صدق جدید میں صراحۃً جماعت اسلامی ہند کی تعریف کے پردے میں جماعت اسلامی پاکستان کی جو مذمت ہوتی رہتی ہے اس پر ہماری خاموشی کی وجہ وہ نہیں ہے جو آپ نے سمجھی، آپ نے ہم لوگوں کو اتنا کم ظرف اور احمق کیوں سمجھ لیا کہ ہم جماعت اسلامی پاکستان کی تخریب و تنقیص کی قیمت پر جماعت اسلامی ہند کی تعریف پسند کر سکتے ہیں ہماری خاموشی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہم مولانا عبدالماجد دریابادی کے مزاج سے واقف ہیں اور ان کے جواب میں کچھ کہنا لاحاصل سمجھتے ہیں۔

باقی رہی یہ بات کہ اس طرح وہ دونوں جماعتوں میں غلط فہمی اور اختلاف پیدا کرنے کی خدمت انجام دے رہے ہیں تو میں آپ کے اس خیال کی نہ تصدیق کر سکتا ہوں نہ تکذیب کبھی کبھی یہ خیال ہمارے ذہن میں بھی پیدا ہوتا ہے لیکن ہم یہ سوچ کر اسکو جھٹک دیتے ہیں کہ مولانا کی ذات گرامی اتنی پست بات سے بہت بلند ہوگی۔

خاص جزئیے کا مطالبہ

خط

زندگی کا شمارہ نظر سے گزرا۔ رسائل و مسائل میں آپ نے عورت کی صدارت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اسکو بغور پڑھا دو باتیں لکھ رہا ہوں، زندگی میں توضیح کیجئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۵۲ء کے برہان میں لکھا گیا ہے کہ عورت کی سربراہی کو جائز کہنے والے اب کہہ رہے ہیں کہ خاص حالات میں عورت صدر ہو سکتی ہے ورنہ اس کی سربراہی جائز نہیں ہے اور آپ نے لکھا ہے کہ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں جماعت اسلامی پاکستان کی مجلس شوریٰ نے مخصوص حالات میں حمایت کا اعلان کیا تھا تو آپ کے پاس برہان کے "اب کہہ رہے ہیں" کا جواب کیا ہے؟

دوسری بات یہ کہ آپ نے بچے کی حکومت پر قیاس کر کے عورت کی حکومت کا جواز نکالا ہے لیکن قیاس کرنا مجتہد کا کام ہے اور آپ مجتہد نہیں ہیں اس لئے خاص عورت کے بارے میں فقہ کا کوئی جزئیہ پیش کیجئے۔ امید ہے کہ آپ برا نہ مانیں گے۔

جواب

ماہنامہ برہان کے "اب کہہ رہے ہیں" کا جواب میں کیا دے سکتا ہوں۔ یہ بات تو آپ کو انہیں سے پوچھنی چاہیے۔ برہان میں فاضل مدیر کا سفرنامہ شائع ہو رہا ہے اتفاق کی بات یہ ہے کہ دسمبر کے اسی شمارے میں انھوں نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے اور ہر دساور کا نمک چکھے ہوئے ہیں، جن صاحب کی یہ خصوصیت اور یہ صفت ہو ان کے لئے اکتوبر کو دسمبر بنا دینا کیا مشکل ہے۔ اتنی چھوٹی بات تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔

آپ نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ میں مجتہد نہیں ہوں لیکن یہ بات کہ جو مجتہد نہ ہو وہ کوئی شرعی قیاس بھی نہ کر سکے صحیح نہیں ہے۔ اجتہاد اور قیاس دونوں ایک چیز نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ میں نے جو قیاس کیا ہے وہ اتنا جلی اور واضح ہے کہ نور الانوار پڑھنے والا طالب علم بھی کر سکتا ہے۔ جس علت کی بنا پر فقہاء نے نابالغ اور غیر مکلف بچے کی حکومت کو جائز قرار دیا ہے اس علت کی بنا پر بالغ اور مکلف عورت کی سربراہی بدرجہ اولیٰ جائز ہونی چاہیے۔

آپ نے خاص عورت کے بارے میں مجھ سے فقہی جزئیے کا مطالبہ کیا ہے اگرچہ آپ نے اس قیاس میں کسی غلطی کی نشاندہی نہیں کی ہے لیکن اس کے باوجود میں فقہی جزئیہ پیش کر رہا ہوں تاکہ معلوم ہو جائے کہ عورت کی حکومت کو مخصوص حالات میں جائز کہنے والوں پر تحریف دین کا جو اتہام لگایا جا رہا ہے اس کی زد کہاں پڑ رہی ہے۔

شریعت اسلامیہ نے عورت کو جو درجہ عطا کیا ہے فقہ حنفی اس کی بہت اچھی تعبیر و تشریح کرتی ہے۔ ائمۂ احناف نے عورت کے قاضی اور حاکم ہونے کے مسئلے سے بھی صرف نظر نہیں کیا ہے۔ وہ اپنی کتابوں میں لکھتے ہیں کہ عورت کا قاضی (جج) ہونا جائز ہے۔ وہ حدود و قصاص کے علاوہ دوسرے امور و معاملات میں قاضی ہو سکتی ہے۔

علامہ کاسانی نے اہلیت قضا کی سات شرطیں بیان کی ہیں (۱) عقل، یعنی پاگل نہ ہونا (۲) بلوغ، یعنی بالغ ہونا (۳) اسلام یعنی مسلمان ہونا (۴) حریت، یعنی آزاد ہونا (۵) بصر یعنی اندھا نہ ہونا (۶) نطق، یعنی گونگا نہ ہونا (۷) حد قذف سے محفوظ ہونا۔

ان شرائط ہی سے معلوم ہو گیا کہ مرد ہونا منصب قضا کے شرائط میں نہیں ہے لیکن علامہ کاسانی کی صراحت بھی پڑھ لیجئے، وہ لکھتے ہیں:-

فلا یجوز تقلید المجنون والصبی والکافر والعبد والاعمی والاخرس والمحدود فی القذف لان القضاء من باب الولایة بل هو اعظم الولایات وهؤلاء لیست لهم اهلیة ادنی الولایات وهی الشهادة فلان لا یکون لهم اهلیة اعلاها اولی واما الذکورة فلیست من شرط جواز التقلید فی الجملة لان المرأة من اهل الشهادات فی الجملة الا انها لا تقضی فی الحدود والقصاص لانه لا شهادة لها فی ذلک واهلیة القضاء تـ...ور مع اهلیة الشهادة۔

(بدائع الصنائع جلد ۷ ص ۳)

لہٰذا پاگل، بچے، غلام، اندھے، گونگے کو قاضی بنانا جائز نہیں ہے اور اس شخص کو قاضی بنانا جائز نہیں جس پر قذف کے جرم میں حد لگ چکی ہو اسلئے کہ قضا حکومت کے باب سے ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا شعبہ ہے اور یہ وہ لوگ ہیں جن میں حکومت و تولیت کے سب سے کم درجہ یعنی گواہی دینے کی اہلیت بھی نہیں ہے تو ان میں حکومت کے سب سے اعلیٰ درجہ یعنی قضا کی اہلیت بدرجہ اولیٰ نہ ہو گی۔ باقی رہی ذکورۃ یعنی مرد ہونا تو فی الجملہ یہ کسی کو قاضی بنانے کے جواز کی شرط نہیں ہے اس لئے کہ عورت فی الجملہ گواہیاں دینے والوں کے گروہ میں داخل ہے الّا یہ کہ عورت حدود و قصاص کے معاملات کا فیصلہ نہیں کرے گی اسلئے کہ حدود و قصاص میں اسکی گواہی معتبر نہیں ہے اور قاضی بننے کی اہلیت کا دارومدار گواہ بننے کی اہلیت پر ہے

اس عبارت سے دو باتیں واضح ہوئیں ایک یہ کہ منصب قضا حکومت کا سب سے بڑا منصب ہے دوسری یہ کہ مرد ہونا تقلید قضا (یعنی قاضی بنانے) کے جواز کی شرط نہیں ہے اسلئے عورت کو قاضی بنانا جائز ہے۔ متن ہدایہ کی عبارت یہ ہے:-

(باقی بر صفحہ ۱۲۵)

تجلّی کی ڈاک

قادیانی منطق

سوال ۱: از احمد محمد ہتھورانی ہتیل (جنوبی افریقہ)

قادیانی لوگ اپنی کتابوں میں بار بار اس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں جس کے راوی حضرت ابن عباسؓ ہیں ......

وہ حدیث :۔ "میں انبیاء میں اوّلین اور آخرین کا سردار ہوں"

جب کہ آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا تو آپؐ آخرین کے سردار کس طرح ہوئے ؟ اس حدیث کا مطلب کچھ اور ہوتا ہوگا مگر قادیانی اسے اپنے مطلب کے لئے استعمال کرتے اور بھولے مسلمانوں کو فریب دیتے ہیں۔

جواب: قادیانی ہوں یا رافضی ــــ اہل بدعت ہوں یا منکرینِ حدیث ان سب کا رویہ دین کے بارے میں یہ ہے کہ آیاتِ محکمات اور نصوصِ صریحہ کو تو یہ نظرانداز کر جاتے ہیں لیکن مجمل اور متشابہ آیات و نصوص سے ایسے مطالب اخذ کرنے کے درپے رہتے ہیں جو محکم و صریح آیات کی ضد ہوں۔ ان حضرات کا پورا علم کلام ملاحظہ فرما لیجئے ان کے یہاں اللہ اور رسول کے واضح ترین قطعی اور دو ٹوک ارشادات کے مقابلہ میں ان نکتہ سنجیوں کی اہمیت زیادہ نظر آئے گی جو یہ اپنے تخیلات و توہمات کے سہارے کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ کلام کے منطوق و مدلول پر یہ دور از کار اشاروں اور کنایوں کو ترجیح دیتے ہیں اور ترجیح کی بنیاد دینی تعلیمات پر نہیں ہوتی بلکہ ان باطل عقائد و نظریات پر ہوتی ہے جو فہم و بصیرت کی کمی اور طرزِ فکر کے زیغ سے ان کے ذہن و قلب میں جاگزیں ہو گئے ہیں۔ قرآن کتنی ہی صراحت کے ساتھ کہے جائے کہ خدا کے سوا کوئی عالم الغیب اور حاضر و ناظر نہیں لیکن ان کا غلو پسند ذہن چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مافوق البشر دیکھنا چاہتا ہے اس لئے قرآن کی یہ صریح آیتیں انکے دل کو نہیں لگتیں بلکہ دوسری غیر متعلقہ اور غیر صریح آیات اور احادیث کے ذریعہ یہ حضور کو عالم الغیب اور حاضر و ناظر ثابت کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہتے ہیں۔ قرآن کتنی ہی بار کہے کہ تمام انبیاء بشر ہی ہوتے ہیں اور کسی بھی نبی کو بشر کے علاوہ کچھ سمجھنا کوتاہ نظر کافروں اور مشرکوں کا شیوہ رہا ہے لیکن ان کا وہم پرست اور تاریک ذہن اسے قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ یہ آیات بیّنات میں کھینچ تان کرتے ہیں، لا یعنی تاویلات کا جال پھیلاتے ہیں اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی آیات و احادیث لاتے ہیں جن کے کسی لفظ سے حضورؐ کو مافوق البشر قرار دینے کی دور دراز سی گنجائش نکل آئے۔

اب اسی حدیث کو لیجئے جس کا حوالہ آپ نے قادیانیوں کے سلسلہ میں دیا ہے۔ اس کے متعدد مفاہیم ہو سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت آدم سے حضور خاتم الانبیاءؐ تک ہزاروں نبی گزرے ہیں بلکہ بعض روایات کے مطابق ان کی تعداد لاکھ سے اوپر ہے، کیا مشکل ہے کہ ان میں سے کچھ کو اوّلین اور کچھ کو آخرین کہہ لیجئے اور حدیث کی مراد یہ لیجئے کہ حضورؐ ان سب کے سردار ہیں۔

دوسرا مفہوم یہ کہ حضورؐ سے پہلے کے تمام انسانوں کو اوّلین کہیئے اور بعد والوں کو آخرین۔ پہلے مومنین اگرچہ اپنے اپنے پیغمبروں پر ایمان لائے اور وہی پیغمبر براہِ راست ان کے سردار ہیں لیکن ہمارے حضورؐ اپنی ہمہ گیر اور ارفع حیثیت کی بناء پر بالواسطہ ان سب کے بھی سردار ہیں۔ دوسرے تمام انبیاء کی حیثیت صرف یہ رہی ہے کہ

ان میں سے ایک کے پیروؤں پر دوسرے پیغمبروں کی سرداری مقصود نہیں لیکن حضورؐ ہی کی واحد ذات ہے جو مجموعی طور پر ان سب کی سردار ہے۔ اس طرح آپ انبیاء میں تنہا اس امتیاز کے مالک ہیں کہ اپنی ہی امت کے نہیں ماقبل کی تمام امم اور انبیاء کے سردار ہیں۔

تیسرا یہ کہ اولین سے مراد صحابہ اور تابعین لئے جائیں۔ آخر کیا قرآن ہی نے جماعت صحابہ میں سے بعض کو خدمتِ حق اور جاں نثاری میں ان کی سبقت اور پہل کی وجہ سے سابقون الاولون نہیں کہا اور ان کے مقابلہ میں دوسرے اصحاب کو "آخرون" کا نام نہیں دیا؟ — جب ایک ہی زمانہ کے بعض لوگوں کو اولین اور بعض کو آخرین کہنا کلام الٰہی سے ثابت ہے تو اس میں کیا استحالہ اور نقص ہے کہ اولین سے مراد حدیث میں قرونِ اولیٰ کے لوگ ہوں اور آخرین سے مراد بعد کے وہ افرادِ امت ہوں جن کی آمد کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا فائدہ اس مضمون کا یہ ہوگا کہ دوسرے تمام انبیاء تو محدود مدت میں محدود قوموں کے لئے مبعوث ہوئے اور ان کی سرداری کا تعلق ان کے محدود زمانوں اور محدود انسانوں ہی سے ہے لیکن تنہا حضور ہی ہیں جن کی سرداری لامحدود مدت اور لامحدود انسانوں کے لئے مقرر کی گئی ہے حتیٰ کہ قیامت تک آپ ہی کی سیادت و امامت کا پرچم لہراتا رہے گا۔

حدیث سے یہ تینوں ہی مفہوم اخذ کئے جا سکتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک قرآن و حدیث کی معروف محکم تصریحات کے عین مطابق ہے۔ لیکن قادیانیوں کو چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلسلۂ نبوت کا خاتمہ کسی قیمت پر گوارا نہیں اور مرزا غلام احمد کو نبی ثابت کرنا ان کا سب سے بڑا مشن ہے اس لئے ان تینوں صاف و سادہ مفاہیم کو چھوڑ کر انھوں نے وہ چوتھا مفہوم اخذ کیا جو قرآن و حدیث کی محکم تصریحات اور امت کے عقیدۂ ختم نبوت کی ضد ہے۔

حالانکہ دنیا بھر کا جانا مانا اصول یہ ہے کہ کسی بھی شریعت یا دستور و قانون میں جو اصول و احکام صریح و محکم الفاظ میں بیان کر دیئے جاتے ہیں وہ اٹل ہوتے ہیں اور کسی بھی لفظ یا عبارت کی ایسی توجیہ تاویل قبول نہیں کی جا سکتی جو ان کے خلاف ہو۔

قرآن و حدیث میں متعدد مقامات پر گوناگوں اسالیب کے ساتھ یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری رسول ہیں اور حشر تک کسی نئے نبی کا اب کوئی امکان نہیں لہٰذا کسی آیت یا حدیث سے اگر ایسا امکان نکلتا بھی ہو کہ کوئی اور نبی حضورؐ کے بعد مبعوث ہو سکتا ہے تو اس امکان کو قبول نہیں کیا جائے گا کیونکہ یہ محکمات و قطعیات کے خلاف جاتا ہے۔

انسان چشم بصیرت استعمال کرے تو اسے اپنی روزمرہ ہی کی گفتگو میں بے شمار مثالیں اس کی مل جائیں گی کہ بعض فقرے وہ ایسے کہتا ہے جو اپنی مجرد حیثیت میں مسلّمات کے خلاف ہوتے ہیں۔ لیکن مقصود اس کا مسلّمات کا انکار نہیں ہوتا۔

مثلاً آپ بارہا کہتے ہیں کہ کسی کی جان لینا شدید جرم ہے اب اگر مجرد اسی فقرے کو قادیانی علم کلام کی سان پر چڑھا لیا جائے تو مفہوم یہ نکلے گا کہ آپ کے نزدیک وہ جج بھی شدید جرم کا مرتکب ہے جس نے کسی قاتل، یا باغی کو پھانسی چڑھا دیا، وہ مظلوم بھی مجرم ہی ہے جس پر کسی ڈاکو نے حملہ کیا اور مقابلہ کے دوران اس نے ڈاکو کو ہلاک کر دیا۔ وہ مجاہد بھی مجرمین کی فہرست سے باہر نہیں جس نے میدانِ جہاد میں اپنے حریف کو تہہ تیغ کیا۔

گویا چونکہ آپ نے اپنے فقرے کے ساتھ جان لینے کی ان صورتوں کا استثناء نہیں کیا ہے جن میں جان لینا قطعاً جرم نہیں ہوتا لہٰذا مذکورہ علم کلام کی رو سے آپ مسلّمات کے منکر ہیں۔

بتائیے کیا یہ درست ہے کیا اس انداز میں اخذِ مطالب کرنا ہوش مندوں کا کام ہے ظاہر ہے کہ نہیں اور بالکل نہیں۔ آپ استثنائی شکلوں کو الفاظ میں بیان کریں یا نہ کریں آپ کے فقرے کا مطلب ہر شخص وہی لے گا جو مسلّمات کے خلاف نہ ہو۔

قرآن سے دو مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

سورۂ زمر میں کہا گیا ہے

إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا ۔ یقیناً اللہ تمام ہی گناہوں کی مغفرت کرنے والا ہے۔

آگے پیچھے دیکھ لیجئے۔ یہاں کسی بھی گناہ کا استثناء اللہ تعالیٰ نے

نہیں کیا۔ اب کیا مجرد اس آیت کی بنا پر کسی کا یہ دعویٰ قابلِ التفات ہوسکتا ہے کہ کفر و شرک کا گناہ بھی لائق مغفرت گناہوں میں شامل ہے ؟

ظاہر ہے کہ آج تک تو کسی ہوشمند مفسّر نے اس دعوی کی حمایت کی نہیں نہ انشاء اللہ آگے کوئی کرے گا۔ کیوں ؟ ۔ آیت میں تو کفر و شرک کا استثناء نہیں ہے ۔ نہ کسی قسم کا ابہام ہے ۔ الفاظ اور اسلوب بھی مجمل نہیں ۔ متشابہ نہیں صریح و محکم ہیں ۔ پھر کیوں کفر و شرک کا گناہ دائرۂ مغفرت سے باہر قرار پائے ۔

جواب آپ یہ دیں گے کہ قرآن میں دوسرے مقامات پر دوٹوک الفاظ میں کہا گیا ہے کہ کفر و شرک کا گناہ معاف نہیں کیا جائے گا لہٰذا کسی بھی آیت اور حدیث سے اس دوٹوک فیصلے کے خلاف مفہوم نہیں لیا جا سکتا خواہ اسمیں استثناء مذکور ہو یا نہ ہو ۔

دوسری مثال :۔

سورۂ نساء کے تیرھویں رکوع میں فرمایا

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا	اور جس نے قتل کیا کسی مومن کو جان
فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا	بوجھ کر اس کی جزا دوزخ ہے جس میں
فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ	وہ پڑا رہے گا اور اللہ کا غضب
وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا	اور لعنت ہے اس پر اور اللہ نے
عَظِيْمًا ۔	اسکے لئے زبردست عذاب مقرر کر رکھا ہے ۔

+ + +

قرآن کھول کر دیکھ لیجئے ۔ اس آیت کے آس پاس کہیں ان استثنائی صورتوں کا ذکر نہیں ملے گا جب کسی مومن کو ارادۃً قتل کرنا نہ صرف جائز بلکہ بعض حالات میں واجب ہو جاتا ہے تو کیا اس آیت کا واقعی یہی مطلب ہے کہ چاہے ایک مومن واجب القتل جرائم کا مرتکب ہو جائے وہ دوسرے مسلمان پر ظالمانہ حملے کرے، چاہے وہ کافروں کے ساتھ مل کر مسلمانوں پر چڑھ آئے، چاہے وہ لٹیرا ہو ۔ کسی بھی صورت میں ایک مسلمان کے لئے ایسے مارڈالنا جائز نہیں اور مارڈالا تو داخل جہنم ! کیا اس آیت میں استثناء مذکور نہ ہونے کی دلیل سے آپ جنگ جمل اور جنگ صفین کے ان تمام شرکاء کو ملعون اور دوزخی قرار دے سکتے ہیں جو سب کے سب مومن ہی تھے اور انھوں نے ایک دوسرے کو عمداً قتل کیا ۔ گھات لگا کر اور پینترے بدل کر موت کے گھاٹ اتارا ۔

ظاہر ہے کہ نہیں اور قطعاً نہیں ۔ آپ جانتے ہیں کہ مومن کی جان لینے کا جواز یا وجوب جن حالتوں میں طے پا چکا ہے اسکی حیثیت تو مسلّمات کی ہے، اگر کسی آیت یا حدیث میں ان حالتوں کا ذکر کئے بغیر کوئی حکم بیان کیا گیا ہو گا تب بھی ایسا کوئی مفہوم اخذ نہیں کیا جائے گا جو مسلّمات کو مسترد کر دے ۔

پھر بھلا اس طرز فکر کی لغویت میں کیا شک رہ جاتا ہے کہ کسی بھی آیت یا حدیث سے کوئی شخص وہ مفہوم اخذ کرے جو پہلے سے طے شدہ قطعی عقائد و اصول کے منافی ہو ۔ یہ طرز فکر تو ان صورتوں میں بھی باطل ہے جب کہ الفاظ اس اخذ کردہ مفہوم کا واضح طور پر ساتھ دے رہے ہوں اور کسی اور مفہوم کا اخذ کرنا دقتِ نظر کا طالب ہو ۔ لیکن جن صورتوں میں الفاظ بھی اس کا ساتھ نہ دے رہے ہوں اور دوسرے متعدد مفاہیم ابھرے ہوئے نظر آ رہے ہوں ان صورتوں میں تو یہ حرکت سراسر دھاندلی اور شرارت ہے

قادیانیوں کا سارا علم کلام اسی نوع کی فنکاریوں سے لبریز ہے ۔ جو شخص ہماری مذکورہ معروضات کو خانۂ دل میں جگہ دے لیگا وہ انشاء اللہ صرف اسی ایک حدیث کے سلسلہ میں نہیں بلکہ دوسرے تمام دلائل کے سلسلہ میں قادیانیت کے طرز فکر کی خامی اور ظاہر فریبی کا ادراک و احساس کرے گا ۔

بلکہ قادیانیت ہی نہیں ۔ کسی بھی گروہ اور مکتب فکر کے اسلوب فکر میں آپ سب سے پہلے اسی پہلو کی جانچ کیجئے کہ محکم اور قطعی آیات و احادیث کے بارے میں اس کی روش کیا ہے ۔ اگر وہ انھیں اصل مان کر باقی نصوص کو ان کے تابع رکھتا ہے تب تو وہ صراط مستقیم پر چل رہا ہے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے تو سمجھ لیجئے کہ اس کا راستہ باطل کا راستہ ہے ۔ انصاف پسند انسانوں کا یہ کام نہیں کہ دستور کی کسی ذیلی شق کے ذریعہ اس کے مبانی اور محکم اصول و کلیات کا حلیہ بگاڑنے کی سعیِ نامسعود کریں ۔ بلکہ وہ

ہر ذیلی شق کی توجیہ و تعبیر ایسی ہی کرتے ہیں جس کا تصادم اصول و مبانی سے نہ ہو۔ خصوصاً قانون شریعت کا معاملہ تو سب سے اہم ہے۔ یہاں کسی بنیادی عقیدے اور محکم ہدایت کے خلاف نکتہ سنجی کا مطلب آخرت کا وہ محاسبہ ہوگا جس کی شدت بڑے بڑے رستموں کا پتا پانی کر دے گی۔

(نعوذ باللہ من ذلک)

عورتوں کی تبلیغ

سوال ۲:۔ از ریاض النبی عباسی۔ مدراس۔

یہاں مدراس شہر میں تبلیغی جماعت کا ایک زنانہ تبلیغی وفد آیا ہے جو محلہ محلہ گھروں میں زنانہ اجتماع کرتا ہے۔ کلمہ نماز وغیرہ کی ترغیب کے ساتھ چلّہ اور سفر کے لئے بھی اصرار کرتا ہے اور جو عورتیں آمادہ ہوتی ہیں ان کو اپنی ہمراہ لیکر مردوں کی رہنمائی میں یہ قافلہ چلتا ہے، رہنمائی کرنے والے اکثر غیر محرم مرد ہوتے ہیں جو ان کو لے کر ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہیں اور تبلیغ کرتے ہیں، براہِ کرم یہ فرمایئے کہ اس طرح عورتوں کا اپنے گھروں سے غیر محرم کے ساتھ نکل کر جانا اور تبلیغ کرنا کیا شرعاً درست ہے؟ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان میں بعض مولوی صاحبان بھی ہوتے ہیں اس لئے دینی تبلیغ کے لئے عورتوں کا جانا اگر ناجائز ہوتا تو یہ حضرات ان کا ساتھ نہ دیتے آپ کی وضاحت کی ضرورت ہے۔

جواب ۲:۔

عورتوں کے لئے شدید ضرورت کے بغیر بلا محرم سفر کرنا اسلام کے نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے۔ اگر واقعتہً ایسا ہو رہا ہے کہ عورتیں کسی محرم کو ساتھ لئے بغیر تبلیغی جماعت کے چلّوں اور سفروں میں شرکت کر رہی ہیں تو یہ ایک فتنہ ہے جو اگرچہ نیک نیتی اور خلوص پر مبنی سمجھا جا سکتا ہے لیکن اس کی تہہ میں سادہ لوحی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس کا یہ فائدہ تو یقیناً متصور ہے کہ پیغام عورتوں کے گھروں کی چار دیواریوں میں دینی باتیں پہنچا سکیں گی اور اس کے نتیجے میں کسی نہ کسی درجے کی اصلاح کا ظہور ہوگا مگر جن خطرات کے پیش نظر حج جیسی عبادت تک کے لئے عورت کے لئے محرم کی شرط رکھا گیا ہے وہ اس متوقع اصلاح کے مقابلے میں زیادہ قابلِ لحاظ ہیں۔ لہٰذا ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ اگر سوال میں مذکور صورت حال واقعی پیدا ہو رہی ہو تو تبلیغی جماعت کے اربابِ حل و عقد اس پر دانشمندانہ توجہ کریں اور اپنے طریقِ کار کے نوک پلک اس خوش اسلوبی سے درست کریں کہ جو کام نیک مقاصد کے لئے کیا جا رہا ہے وہ فتنے کی شکل اختیار نہ کرے۔

اخبار دعوت اور فرقۂ قادیانیہ

سوال ۳:۔ (ایضاً)

اخبار دعوت دہلی میں متعدد بار اس قسم کے اتفاق و اتحاد کی دعوت دی گئی ہے کہ مسلمانوں کے جملہ فرقے اپنے اپنے مسلک پر باقی رہتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔ جہاں مسلمانوں کے فرقوں کو گنایا گیا ہے وہاں قادیانیوں کا نام بڑے احترام سے احمدی کہہ کر لیا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جماعتِ اسلامی کے اس آرگن کے نزدیک قادیانی بھی مسلمان ہیں حالانکہ شیعوں تک کے بارے میں تو مسلمان ہونے کی گنجائش نکالی ہے لیکن قادیانیوں کے کفر میں کسی عالم نے آج تک شک نہیں کیا سوائے مولانا عبد الماجد دریابادی اور اخبار دعوت کے۔ جماعت اسلامی کے مؤسس اول مولانا مودودی صاحب نے قادیانیوں کے بارے میں مستقل رسالے تصنیف فرمائے اور اس سلسلہ میں جو صعوبتیں مولانا نے برداشت کیں وہ کسی باخبر سے پوشیدہ نہیں پھر آخر دعوت کے نزدیک قادیانی اسلامی معاشرہ کے جز اور اسلامی فرقے کیسے ہو گئے؟

جواب ۳:۔

اخبار دعوت ہم بھی دیکھتے ہیں لیکن جستہ جستہ۔ ہمیں تو یاد نہیں کہ قادیانیوں کا شمار مسلمان فرقوں میں کب کیا گیا ہے۔ تاہم آپ کی وضاحت کے مطابق اگر واقعتہً کیا گیا ہے تو اسے سادہ لوحی کہیں گے۔ سادہ لوحی سے مراد ذہن کی وہ کیفیت ہے جب آدمی فرطِ اخلاص میں حقائق

کو نظرانداز کر دے۔

قادیانیت کے بارے میں ہم اپنا خیال اور موقف ایک سے زائد بار ظاہر کر چکے ہیں۔ ہماری نگاہ میں وہ اسلام بالکل دوسرا اسلام ہے جس کا دعویٰ قادیانی حضرات کرتے ہیں۔ اور اسلام اگر دو نہیں ہیں تو اس دوسرے اسلام کو اور جو چاہیے کہئے اسلام بہرحال نہ کہہ سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قادیانیوں کی نظر میں ہر غیر قادیانی خارج از اسلام ہے اور اگرچہ اپنے اس عقیدے پر وہ وقتاً فوقتاً تاویلات اور غلط بیانیوں کے پردے ڈالتے رہتے ہیں لیکن ارباب بصیرت اس فنکاری میں آنے والے نہیں۔

بہرحال اخبار دعوت ہو یا مولانا دریا بادی۔ جو بھی اس خوش فہمی کا شکار ہوگا کہ آفت وابتلا اور زوال و انتشار کی گھڑیوں میں قادیانیوں کو ملتِ اسلامیہ ہی میں شمار کرنا مفید ہوگا اسے سادہ لوح کہیں گے۔ یہ بے شک بجا ہے کہ جب کفر صریح کے مقابلہ میں ضرورت زیادہ سے زیادہ اتحاد کی ہو اور ظلم و تعصب کے سیل تن پر بند باندھنے کے لئے پوری ملت کا اشتراک و تعاون امر لازم قرار پا جائے تو یہ مناسب نہیں ہے کہ جن فرقوں کو ان کے دعوۂ اسلام کے باوجود ہم داخل ملت نہیں سمجھتے، ان کے عقائد باطلہ کی تردید اور ان کے خارج از ملت ہونے پر استدلال کا ہنگامہ بھی برابر جاری ہے۔ سکوت اور صرف نظر بھی ایک حکمت ہے کیا حرج ہے اگر ظلم کا مقابلہ کرنے کے لئے سارے ہی فرقے ٹیم کی شکل اختیار کریں اور نظریاتی اختلافات پھر کسی مناسب وقت کے لئے اٹھا رکھے جائیں۔

البتہ اشتراک و اتحاد کی خاطر اس حد تک جانا ہم درست نہیں سمجھتے کہ جو فیصلہ ہم نے نہایت غور و فکر کے بعد کیا تھا اسکی تردید بھی ہمارے ہی قلم و زبان سے ہو جائے۔

اخبارات میں قرآنی آیتیں

سوال ۱۲:۔ (ایضاً)

اخبارات میں اکثر کلام پاک کی آیات و احادیث اور ان کا ترجمہ شائع ہوتا رہتا ہے، خصوصاً دعوت اخبار میں لوگوں کے پاس جب ذخیرہ ہو جاتا ہے تو اسے بنیوں کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں یہ اس میں سودا باندھ کر دیا کرتے ہیں، یہ کاغذ اکثر دیکھا گیا ہے کہ کوڑے کرکٹ میں پڑا ہے اور کلام پاک کی آیتوں کی بے حرمتی ہو رہی ہے حالانکہ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ لکھے ہوئے قلم کا تراشہ بھی ایسی جگہ نہ ڈالو جہاں لوگوں کے پیر پڑتے ہوں۔ پھر یہ تو قرآن پاک کی آیتیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ فعل کیسا ہے؟ اخبارات کی یہ روش کہاں تک درست ہے۔

جواب:۔

سوال یہ نہیں ہونا چاہئے کہ اخبارات کی یہ روش کیسی ہے۔ سوال یہ ہونا چاہئے کہ ان لوگوں کی روش کیسی ہے جو آیات لکھے ہوئے اوراق ردی میں فروخت کرتے ہیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ آیات یا احادیث لکھے ہوئے ورق ردی میں نہیں بیچنے چاہئیں۔ انھیں یا تو محفوظ رکھو یا دفن کر دو یا جلا دو۔ تراجم اگرچہ نفس آیات کے مرتبے میں نہیں لیکن درجہ ان کا بھی عام تحریروں سے بہت بلند ہے۔ لہٰذا ان کا بھی احترام ضروری ہے۔

اجتماعی قرآن خوانی

سوال ۱۳:۔ از احمد محمد منصورانی۔ بھیل (جنوبی افریقہ)

گجرات کے مولانا حقانی صاحب نے اپنی کتاب "شریعت کہ جہالت" کے صفحہ ۱۴۲ پر یہ عبارت لکھی ہے:۔

> "قرآن مجید ۳۰ پارے جماعت نے ساتھ پارہ پارہ کر کے پڑھنا مکروہ تحریمی ہے کیونکہ ایسا کرنے میں باہم آوازوں کا بلند کرنا اور ایک دوسرے کی قراءت نہ سننا لازم آتا ہے"۔ حوالہ عینی الہدایہ۔

ایصال ثواب کے لئے اجتماعی طور پر ختم قرآن مجید کا یہ رواج ہندوپاک کے تقریباً جملہ مدارس میں پایا جاتا ہے۔ دیوبندی مسلک کے علماء بھی ایسا اجتماع کرتے ہیں اور خود بھی اس میں پڑھنے کے لئے شرکت کرتے ہیں۔ تو اس کے جواز کی کیا صورت

ہو گی جب کہ ایسا اجتماع مکروہ تحریمی ہے ؟

راندھیر کے حضرت مولانا مفتی احمد اشرف صاحب نے بھی اپنے فتاویٰ میں فرمایا ہے کہ یہ رواج غیر شرعی ہے۔ اور سند کے طور پر ان کتابوں کے حوالے دیئے ہیں :-

(۱) فتاویٰ عالمگیری جلد ۶ صفحہ ۲۱۳ (۲) نصاب الاحتساب۔ باب ۴۹ صفحہ ۱۲۱ (۳) امداد الفتاویٰ جلد ۱ صفحہ ۵۲۰ باب الجنائز (۴) فتاویٰ رشیدیہ صفحہ ۱۳۹ (۵) شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی نے اربعین میں نمبر ۳۴ سوال کے جواب میں لکھا ہے " قرآن کے ختم کے لئے لوگوں کو جمع کرنا مکروہ ہے اور مکروہ سے مراد مکروہ تحریمی ہے "

یہاں جنوبی افریقہ کے مسلمانوں میں بھی یہ رواج موجود ہے۔ اب اس رواج کو جاری رکھنا چاہیئے یا بند کر دینا چاہیئے کیا اس کے جواز کی کوئی صورت نکل سکتی ہے ؟

جواب :-

جہاں تک ہماری یاد کا تعلق ہے خیر القرون میں ہمیں اجتماعی قرآن خوانی اور ایصال ثواب کا یہ طریقہ کہیں نہیں ملا جو ہمارے زمانے میں رواج دیا گیا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ خود ہمارے دیوبند میں بھی یہ نہ صرف موجود ہے بلکہ علماء بھی اس میں شریک اور اس کے حامی ہیں حالانکہ مولانا اشرف علی اور مولانا رشید احمد گنگوہی رحمتہ اللہ علیہما کے فرمودات سے اس رواج کی نکیر و مذمت تو نکلتی ہے تائید و تحسین نہیں ہوتی۔

اب جب کہ ایک مفتی صاحب نے وہ وزنی حوالے بھی سامنے رکھ دیئے ہیں جنھیں آپ نے نقل کیا تو ہماری حیثیت اور قابلیت سے باہر ہے کہ جواز و استحسان کی شکلیں نکالنے کی کوشش کریں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے موجودہ علماء نے یہ جاننے کے باوجود کہ یہ طریقہ بدعت ہے اس کی حمایت اس لئے شروع کی ہے کہ بغیر اجتماع کے لوگوں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے گھروں میں بیٹھ کر ایصال ثواب کی زحمت اٹھا سکیں گے۔ میت کے لئے ایصال ثواب چونکہ ایک ضرورت ہے اس لئے اس ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر مکروہ کو مختار بنایا گیا ہے۔ اب جس شخص کو استدلال کی یہ تکنک جاندار نظر آئے وہ اسے قبول کرے اور جسے اس کی معقولیت میں شبہ ہو وہ قبول نہ کرے۔ ہم ان لوگوں میں ہیں جو اس کی صحت سے متفق نہیں واللہ تعالیٰ اعلم۔

خطبۂ عید کے بعد دعا کا مسئلہ

سوال ۱۰:- مشتاق احمد بہرائچ۔

بہرائچ میں ایک مسئلہ نزاعی بن گیا ہے اور پڑھے لکھے طبقہ کے لوگوں میں تذبذب پیدا ہو گیا ہے۔ یہاں یہ طریقہ عرصہ دراز سے رائج ہے کہ نماز عیدین کے خطبہ کے بعد امام صاحب مصلے سے اتر کر دوبارہ مصلے پر بیٹھ کر دعا مانگتے ہیں، ابھی عید کے موقع پر ایک حکیم صاحب نے عید گاہ میں نماز عید الفطر کے مسائل بیان کرتے ہوئے امام صاحب و عوام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ نماز عیدین و خطبہ کے بعد دعا مانگنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ، تابعین و تبع تابعین سے ثابت نہیں ہے لہٰذا بالغرض اتباع دعا نہ مانگنا بہتر ہے " اس بات پر چند شر پسندوں نے ہنگامہ کر دیا۔ خوب گالی گلوچ کی اور حکیم صاحب کو مارنے کے لئے تیار ہو گئے آخر کار دعا مانگی گئی اور بڑی مشکل سے یہ ہنگامہ فرو ہوا، اور ابھی تک یہ مسئلہ پورے شہر میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔

یہاں ایک مدرسہ نور العلوم ہے اس کے اساتذہ و ذمہ دار بھی اپنی انفرادی گفتگو نیز تقریروں میں بھی برابر یہ کہہ رہے ہیں کہ حکیم صاحب نے غلط کہا " دعا مانگنا چاہیئے، علماء دیوبند کا فتویٰ ہے اور ان کی کتابوں میں لکھا ہے " یہ مدرسہ اپنے کو دیوبندی مسلک کا کہتا ہے۔ اس مدرسہ کا ایک اشتہار عید الفطر کے مسائل کے سلسلہ میں نکلا ہے (جو روانہ ہے) اس میں لکھا ہے کہ بعد خطبہ کے دعا مانگ کر واپس ہونا چاہیئے۔ کیا واقعتاً علماء دیوبند کا فتویٰ ہے کہ دعا مانگنا چاہیئے ؟ آپ سے استدعا ہے کہ اس مسئلہ پر تفصیل سے روشنی ڈالیں اور جمہور علماء کے طرز عمل کی وضاحت فرمائیں تاکہ جو لوگ متذبذب ہیں وہ مطمئن ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عظیم عطا فرمائے۔

جواب :-

جب کہ تزکیۂ باطن اور صفائی قلب عنقا ہوا اور عبادتوں کی بس ظاہری شکل اور بطور عادت ان کی بجا آوری کو سب کچھ سمجھ لیا جائے تو حالت ایسی ہی ہو جاتی ہے کہ بات بات پر لڑنا بھڑنا اور افتراق کی خلیج کو خواہ مخواہ وسیع کرنا بہادری اور فخر کی بات خیال کیا جانے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ جو مسئلے معمولی سی فراست اور سلامت روی کے ساتھ با آسانی طے کئے جا سکتے ہیں وہ بھی طے نہیں کئے جاتے بلکہ جھگڑوں اور بحثوں کا مبنیٰ بنا لئے جاتے ہیں۔

اب اسی مسئلہ کو لیجئے۔ جن حکیم صاحب کے خلاف بازاری نوع کی شورش برپا کی گئی ان کے فرمودات کے متعلق اگر معروف علماء سے معلومات حاصل کر لی جاتیں تو کوئی بھی لڑائی جھگڑا کھڑا نہ ہوتا۔ علماء حق اس مسئلہ پر بارہا اپنی رائے ظاہر کر چکے ہیں اور ان کے فتاویٰ چھپے چھپائے موجود ہیں۔ کیا دشواری تھی کہ کسی مستند عالم کی کتاب ہی اٹھا کر مسئلہ دیکھ لیا جاتا مگر کہاں۔ دل و دماغ تو پندار جہالت اور تعصبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ اسلامی اخلاق و انصاف کے اصولوں کا کوئی لحاظ خال خال ہی پایا جاتا ہے ورنہ جاہل سے جاہل کا حال یہ ہو گیا ہے کہ اس کے عقیدۂ و خیال کے خلاف ذرا بھی کوئی بات سامنے آئی اور وہ اس طرح بھڑک اٹھا جیسے وہ دنیا بھر کا عالم ہو اور اس سے مختلف عقیدہ رکھنے والا ہر شخص احمق و گمراہ ہو۔

افسوس بہت زیادہ مدرسہ نور العلوم کے اساتذہ کی روش پر ہوا۔ اگر وہ اپنی ذمہ دارانہ پوزیشن اور آخرت کی جوابدہی کا لحاظ رکھتے تو یہ تحقیق کر لینا ان کے لئے دشوار نہ تھا کہ مذکورہ حکیم صاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ وہی ہے جو مسلک دیوبند کے بعض اکابر نے کہا ہے اور جو بات وہ خود کہہ رہے ہیں وہ نہ صرف جہالت بلکہ کذب و افتراء پر مبنی ہے۔ یہ بالکل جھوٹ ہے کہ علماء دیوبند خطبہ عیدین کے بعد دعا مانگنے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ ان کا فتویٰ کیا ہے یہ بات ہر شخص فتاویٰ امدادیہ، فتاویٰ رشیدیہ، فتاویٰ عبدالحی اور علم الفقہ جیسی کتابوں سے بہ آسانی معلوم کر سکتا ہے۔

مثلاً فتاویٰ رشیدیہ کی کتاب البدعات میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ایک سائل کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

> "خطبہ سے اول و آخر دعا کرنا کہیں ثابت نہیں لہٰذا نہ کرنا چاہئے البتہ بعد سلام نماز عید کے دعا کریں پھر منبر پر کھڑا ہو کر دعا ثابت نہیں۔"

گویا خطبہ کے اول و آخر میں دعا کو تو مسلک دیوبند کے یہ معروف بزرگ اور مفتی بھی منع فرما رہے ہیں۔ رہا نماز کے متصل بعد دعا مانگنا تو اس کے بارے میں بھی علمائے دیوبند یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اس کا ثبوت حضورؐ یا صحابہؓ یا تابعینؒ سے نہیں ملتا۔ ملاحظہ ہو امداد الفتاویٰ کی کتاب العیدین۔ نیز مسلک دیوبند کے مشہور عالم مولانا عبدالشکور فاروقی علم الفقہ میں رقمطراز ہیں :-

> "بعد نماز عیدین کے یا بعد خطبے کے دعا مانگنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب اور تابعین اور تبع تابعین رضی اللہ عنہم سے منقول نہیں اور اگر ان حضرات نے کبھی دعا مانگی ہوتی تو ضرور نقل کی جاتی۔ لہٰذا بغرض اتباع دعا نہ مانگنا دعا مانگنے سے بہتر ہے"۔
>
> (علم الفقہ حصہ دوئم ص۱۵۶)

آخری فقرے پر خط ہم نے یہ نمایاں کرنے کے لئے کھینچا ہے کہ کیا ٹھیک وہی الفاظ نہیں ہیں جن پر بیچارے حکیم صاحب کو نشانۂ مخالفت بنایا گیا ہے۔

پھر یہ بھی ملاحظہ ہو کہ صاحب علم الفقہ نے اپنی اس عبارت پر حاشیہ بھی دیا ہے۔

> "مولانا شیخ عبدالحی رحمۃ اللہ اور مولوی محمد نعیم صاحب مرحوم نے بھی اپنے فتوے میں ایسا ہی لکھا ہے"۔

اور سن لیجئے کہ علم الفقہ کی مذکورہ عبارت مولانا اشرف علی رحہ نے بھی "بہشتی گوہر" میں نقل کی ہے جس کا ذکر وہ خود فتاویٰ امدادیہ میں کرتے ہیں۔

ذرا بتائیے ان تفصیلات پر نظر ڈالی جاتی تو ہنگامے اور جھگڑے کی کیا گنجائش رہتی۔

صورت مسئلہ یہ ہے کہ خطبہ عیدین کے بعد تو تمام

مسنونِ علمائے دیوبند دعا کو منع کرتے ہیں اور خود بھی اسی ممانعت پر عامل ہیں۔ البتہ حدیث میں چونکہ اصولی انداز میں یہ مضمون آیا ہے کہ نماز کے متصل بعد کا وقت دعا کی قبولیت کا وقت ہے اس لئے بعض علمائے دیوبند نے نماز عید کے متصل بعد کو استحباب کے درجے میں پسند کیا ہے۔ لیکن یہ وہ بھی مانتے ہیں کہ اس کا ثبوت حدیث و آثار سے نہیں ملتا۔ اسی لئے وہ ان لوگوں کو قابل ملامت اور گمراہ نہیں سمجھتے جو اس بارے میں ان کی رائے سے اتفاق نہ کریں اور پیروئ سنت کے نقطۂ نظر سے دعا سے پرہیز کریں۔

خدا ہی جانے مدرسہ نور العلوم (بہرائچ) کے مرسلہ پمفلٹ میں یہ بات کہاں سے لکھ دی گئی کہ

"بعد خطبہ کے دعا مانگ کر واپس ہونا چاہئے"

یہ نہ صرف مسلک دیوبند کے خلاف ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے طریق کی مخالفت کے ہم معنی ہے کیا آپ نہیں دیکھتے کہ نماز کس قدر افضل عبادت ہے لیکن کچھ اوقات میں نماز پڑھنے سے روکا گیا ہے۔ روزہ کیسا پاکیزہ عمل ہے لیکن بعض دنوں میں اسے حرام کیا گیا ہے۔ اسی طرح دعا یقیناً عبادت کا مغز ہے لیکن خطبہ کے بعد اگر ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے عالی مقام اصحاب اور تابعین کرام نے دعا نہیں مانگی ہے تو اطاعت شعار مومنوں کے لئے یہ نتیجہ اخذ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ دعا مانگنے میں اس وقت ضرور کوئی ایسی قباحت ہوگی جیسی اوقات کروہہ اور ایام ممنوعہ میں نماز اور روزہ ادا کرنے میں۔

دُبُرِ صلوٰۃ (نماز کے متصل بعد) کو چونکہ ہمارے آقا نے عمومی اور کلی انداز میں اجابتِ دعا کا وقت بتایا اسلئے یہ بات کسی درجے میں قرین قیاس ہو سکتی ہے کہ نماز عید کے بعد بھی کچھ لوگ دعا کو معمول بنا لیں لیکن خطبے کے آغاز یا اختتام پر دعا نہ نقلاً ثابت ہے نہ عقلاً۔ اسی لئے علمائے سلف کا عمومی طرز عمل یہی ملتا ہے کہ خطبہ کے بعد دعا نہیں کرتے تھے۔ فقہاء احناف تو متفق طور پر اسی طرز عمل کو درست سمجھتے ہیں۔ پھر آخر نور العلوم کے اساتذہ نے یہ سبق کہاں سے نکالا کہ خطبہ کے بعد دعا مانگ کر واپس ہونا چاہئے علمی حلقوں کی ایسی ہی بدعنوانیاں اور غیر ذمہ داریاں فتنہ و شر کا مبنیٰ بنتی ہیں۔

وحید الدین خاں صاحب کی تعبیر کی غلطی

قارئین گواہ ہیں کہ نقد و نظر کے معاملے میں ہم نہ بخیل ہیں نہ متساہل۔ جب بھی کسی تحریر کی فتنہ انگیزی اور حق دشمنی کا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہوئی ہے ہم نے سیر حاصل تنقید اور بر وقت گرفت میں دیر نہیں لگائی ہے۔ ہمیں یاد ہے جب وحید الدین خاں صاحب کی "تعبیر کی غلطی" کا مطالعہ ہم نے کیا تو اس پر نقد و نظر کا جوش ہمارے اندر پیدا ہوا تھا جوش ہمارے اندر اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی تحریر کے کمزور اور مغالطہ انگیز پہلوؤں کا ادراک و احساس ہم پوری طرح کر لیتے ہیں۔ یہ کتاب طرز فکر کی جن خامیوں اور علم و تفقہ کی جن کمزوریوں پر مشتمل تھی انھیں ہم نے اللہ کے فضل سے ایک ہی بار کے مطالعے میں فی الفور محسوس کر لیا تھا۔ فی الفور محسوس کر لینا خود ہمارے علم و کمال کی دلیل نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ عربی تراجم میں جتنی فاش اور موٹی موٹی غلطیاں اس کتاب میں ہیں ان کا ادراک تو کوئی بھی معمولی قابلیت کا آدمی تھوڑے سے غور و تامل میں کر سکتا ہے بشرطیکہ عربی اس نے پڑھنے کی طرح پڑھی ہو۔ شاید عربی سے معتد بہ واقفیت نہ ہونے کے باعث ہی محترم خاں صاحب کے مطالعہ قرآن نے انھیں اس نتیجے پر مطمئن کیا ہے کہ مولانا مودودی نے قرآن کو نہیں سمجھا۔ ظاہر ہے جس شخص نے عربی جیسی مہتم بالشان زبان کو فقط غیر مرتب مطالعے کے ذریعہ سیکھا ہو اور اس کی صرف و نحو اور اسالیب اور اصطلاحات سے واقف نہ ہو وہ کتنی ہی

شدید یا نہ غلطیوں کا مرتکب ضرور ہوگا اور اگر اپنی علمی بے مائگی کا احساس کرنے کے عوض وہ کہیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ میرا علم کمال کو پہنچا اور بڑے سے بڑے عربی داں سے ٹکر لینا میرے لئے بہت آسان ہے تب بڑے طنطنے اور زعم کے ساتھ جسے چاہے گا چیلنج کر گذرے گا۔

گھبرائیے مت۔ ہم جو کچھ کہتے ہیں اس کا ثبوت بھی پیش کرنے کے عادی ہیں۔ ہم دونوں ہی باتوں کو دلائل قاہرہ سے ثابت کریں گے۔ اسے بھی کہ محترم خاں صاحب نے عربی تراجم میں کتنی ٹھوکریں کھائی ہیں اور اسے بھی کہ وہ اپنے علم و فہم کے بارے میں کس درجہ خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔

لیکن روداد ہم ماضی کی بیان کر رہے تھے "تعبیر کی غلطی" پر نقد و نظر کا قصد ملتا ہی کیوں گیا یہ طولانی داستان ہے۔ یوں کہیئے کہ بس قدرت ہی کی طرف سے موانعات پیش آتے چلے گئے۔ پھر جب کئی ماہ گذر گئے تو ہمارے ارادے کو اس علم و خبر نے بھی خاصا مضمحل کیا کہ عوام و خواص کے کسی بھی حلقے میں اس کتاب نے کوئی ایسا اثر پیدا نہیں کیا ہے جس کو زائل کرنا ہمارا دینی فریضہ ہو۔ تجلی کے صفحے میں ہمارا دائرۂ تعلق بہت وسیع ہے۔ کس تحریر نے علمی حلقوں میں کیا اثر ڈالا اور دین سے دلچسپی رکھنے والے عوام اس سے کس حد تک متاثر ہوئے اس کی اطلاع ہمیں خطوط کے ذریعے ہوتی رہتی ہے۔ قارئین تجلی کی طرف سے یہ اصرار تو عموماً ہوتا رہا کہ "تعبیر کی غلطی" پر تبصرہ کرو لیکن اس اصرار کی بنیاد اس پر نہیں تھی کہ لوگ

اس کتاب کا اثر قبول کر رہے ہیں بلکہ صرف اور صرف اُس ذوق و شوق پر بھی جس کے تحت یہ اللہ کے بندے ہماری تنقیدوں کا والہانہ انتظار کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ تجلی بجائے مہینے بھر کے روز روز نکلے اور روز روز یہ ہماری تحریریں پڑھیں۔ خود ستائی بالکل نہیں۔ ہماری تحریریں نہ کسی کمال کا آئینہ ہیں نہ فضل و عظمت کا۔ ان میں اگر کوئی حسن ہے تو فقط یہ ہے کہ وہ بے لاگ ہوتی ہیں۔ مدلّل ہوتی ہیں۔ مخلصانہ ہوتی ہیں۔ یہ حسن ایسے تمام لوگوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے جو عدل سے اخلاص سے حق گوئی سے محبت کرتے ہیں۔ جنھیں سچائی بھاتی ہے۔ جنھیں لاگ لپیٹ اور بے دلیل دعووں سے نفرت ہے۔

ان لوگوں نے کتنا کتنا اصرار کیا کہ تعبیر کی غلطی پر تنقید کرو۔ ہم ان کے اصرار پر تجلی کے صفحات میں بار بار وعدہ بھی کرتے رہے لیکن سچی بات ہے طبیعت کا پورا پورا میلان اس وعدے کے پیچھے نہیں تھا۔ اگر یہ اطلاع ملتی کہ یہ کتاب مؤثر ثابت ہوئی ہے اور جماعت اسلامی کے دینی فکر سے بعض اُن لوگوں کو بدظن کر رہی ہے جو آج تک بدظن نہیں تھے تب یقیناً ہمارا جوش مضمحل نہ ہوتا اور سارے کام چھوڑ کر ہم سب سے پہلے اسی کتاب کا جائزہ لیتے۔ لیکن صرف دلچسپی اور "رونقِ بزم" کے خیال نے ارادے کو تقویت نہیں دی اور مستزاد یہ حادثہ پیش آیا کہ کتاب ہی کوئی کرم فرما غائب کر گئے۔ اس نسخے پر مطالعہ کے دوران ہم نے جگہ جگہ نشانات لگائے تھے۔ اب گویا نیا نسخہ فراہم کریں تو پھر سے حرف حرف پڑھیں۔ یہ اور نکھٹے کو ٹھیلتے کا بہانہ بن گیا۔ ہو سکتا ہے کہ بہانہ مستقل بہانہ ہی رہتا اور ارادۂ نقد ہمیشہ کے لئے ملتوی کر دیا جاتا لیکن خبر یہ ملی ہے کہ اس کتاب کو دوبارہ چھاپنے اور پھیلانے کا منصوبہ عین دیوبند میں وہ ادارہ بنا رہا ہے جس نے "ردِّ مودودیت" کا لٹریچر بیچنا بات کی تیج اور گروہی مفاد کی تحصیل کے لئے ضروری سمجھ رکھا ہے۔ لہٰذا اللہ کے نام پر آج ہم نقد و نظر کا دروازہ کھولتے ہیں جس شرح و بسط کے ساتھ ہم جائزہ لینے کے عادی ہیں اس کا تو فی الوقت کوئی امکان نہیں۔ فروری کے آخری عشرے میں یہ سطور لکھی جا رہی ہیں جب کہ مارچ کے آغاز میں ہمیں "تنقید نمبر" قارئین تک پہنچانا چاہئے۔ ویسے بھی پانسو سے زائد صفحات کی کتاب پر سیر حاصل نقد بہت جگہ چاہتا ہے۔ اگر سچ مچ ضرورت ہوتی تب تو ہم سارا نمبر اسی کے لئے وقف کر دیتے، مگر فی الحال یہی کافی ہے کہ ہم بعض بنیادی اُمور قارئین تک پہنچا دیں تاکہ کتاب کی مجموعی حیثیت اور صاحبِ کتاب کے مقام اور استعداد کا اندازہ انھیں ہو جائے۔

"تصورِ دین" کے عنوان سے ایک مضمون آگے آپ دیکھیں گے۔ ہمارے اختصار کا کچھ خسارہ یہ پورا کر دے گا۔ مولانا صدر الدین کا مفصّل خط بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔ اس سے بھی ہماری کوتاہ قلمی کی کچھ تلافی ہو گی۔ خود مولانا مودودی کا ایک مختصر لیکن جامع اور کافی و شافی اقتباس شاملِ اشاعت ہے۔ یہ اصولی طور پر اُس تمام فکر کا جواب ہے جسے اس کتاب میں پھیلا کر پیش کیا گیا ہے۔

پھر ماہنامہ "زندگی" کے فاضل مدیر مہینوں سے اقامتِ دین کے موضوع پر جو شذرات قسط وار لکھ رہے ہیں وہ اس کتاب کے پیدا کردہ مغالطوں کے قاطع ہیں اور جب وہ کتابی شکل میں شائع کر دیئے گئے تو تقابلی مطالعہ کا کام دے سکیں گے اس طرح ہمارا اجزئی نقد بھی تشنہ نہیں رہ جاتا۔ اسے مذکورہ تحریروں سے جوڑ لیجئے تو پوری زنجیر سامنے آجائے گی۔

ہم سب سے پہلے یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ "تعبیر کی غلطی" لکھتے وقت محترم خاں صاحب کی ذہنی حالت کیا تھی۔ ان کے اعصاب پر کیا عالم طاری تھا اور کسی اونچے درجے کے فکر اور کسی دقیق و لطیف علمی مسئلہ کو پیش کرتے وقت دل و دماغ پر استقامت، جماؤ اور اعتدال کا جو مجموعی رنگ ہونا چاہئیے وہ موصوف کے یہاں پایا جاتا تھا یا نہیں۔

اس کا فیصلہ خود ان کے فرمودات سے کیجئے۔ وہ آغاز ہی میں صفحہ ۷ پر فرماتے ہیں:—

"دارالمصنفین اعظم گڑھ کے کتب خانے کا وسطی کمرہ ہے چاروں طرف تفسیر، حدیث، فقہ، تاریخ، علم کلام اور لغت کی ایک درجن سے زیادہ الماریاں دیوار سے لگی ہوئی رکھی ہیں۔ ایک بجے دن کا وقت ہے کتب خانے کے دروازے بند ہو چکے ہیں اور تمام لوگ دوپہر کے وقفے میں اپنے اپنے ٹھکانوں کو جا چکے ہیں۔ مکمل تنہائی کا ماحول ہے جس میں ایک طرف میں ہوں اور دوسری طرف کتابیں۔ مسلسل مطالعہ کی وجہ سے اس وقت میری کیفیت یہ ہو چکی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے میرے سارے بدن کا خون نچوڑ لیا ہو' ابن جریر کی ایک جلد دیکھ کر میں اُٹھا کہ اس کو الماری میں رکھ کر دوسری کتاب نکالوں، مگر اٹھا تو کمزوری کی وجہ سے چکر آگیا اور سمت بھول گیا۔ یہ میرا مدت کا جانا پہچانا کمرہ ہے مگر تھوڑی دیر تک میں وہاں اس طرح کھڑا رہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کدھر جاؤں اور کس الماری سے کتاب نکالوں۔ کچھ دیر کے بعد ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ متعلقہ الماری فلاں سمت ہے۔

اس واقعہ کے کچھ دیر بعد جب میں نے اپنے حواس کو یکجا کیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں زیر بحث نظریے کے بارے میں اسلاف امت سے زیادہ خیال کرنے کے لئے بہت دور تک چلا گیا تھا اور چلتے چلتے تھک گیا مگر اس کمزوری اور تکان کے باوجود مجھے یہ سوچ کر خوشی ہو رہی تھی کہ مجھے ان کی رائے معلوم ہو گئی ہے اور اب میں اس پوزیشن میں ہوں کہ ان کی طرف سے پورے اعتماد کے ساتھ زیر بحث تصور کی تردید کر سکوں۔ مجھے ایسا نظر آیا گویا یہ تمام الماریاں اور اس میں بھری ہوئی کتابیں اسلاف کی روحیں ہیں جو میرے پیچھے کھڑی ہیں اور میں اپنے کمزور ہاتھوں اور کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ ان کی طرف سے مدافعت کرنے کے لئے جا رہا ہوں۔

یہ سوچ کر اتنی خوشی ہوئی کہ تکان اور بھوک پیاس سب بھول گئی اور میں دوبارہ مغرب تک کے لئے اپنے مطالعہ میں مشغول ہو گیا" صـ۸۹

اگر ہم دوسروں کی نیت پر حکم لگانے کی وہی روش اختیار کریں جو خاص طور پر مولانا مودودی کے بارے میں اس کتاب میں اختیار کی گئی ہے تو یہ کہنا کچھ بھی مشکل نہیں کہ اس داستان سرائی کا مقصود اپنے آپ کو پوز کرنا ہے۔ ٹھیک وہی ذہنیت اس کے عقب میں کام کر رہی ہے جو عجز و انکسار کی فنکارانہ نمائش کے عقب میں کام کرتی ہے۔ لیکن ہم دوسروں کو بلا تکلف بدنیت کہنے کے عادی نہیں لہٰذا یہی تسلیم کریں گے کہ اس کہانی کے پیچھے صرف اظہار واقعہ کا ارادہ کام کر رہا ہے اور فنکاری کی نفسیاتی تکنیک سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔

اب ذرا انسانی نفسیات اور انسانی ذہن و اعصاب پر نظر رکھنے والا کوئی شخص انصاف سے کہے کہ مولانا مودودی جیسے مفکر اور امام عصر کے سالہا سال کی فکری عمارت کو ڈھانے کے لئے کیا ایسے ناتواں دماغ اور کمزور اعصاب والا کوئی شخص اصولاً قابل اعتماد ہو سکتا ہے جس کا نقشہ اس عبارت میں کھینچا گیا ہے۔ مان لیجئے کہ مولانا مودودی کا سارا ہی فکر و فلسفہ غلط ہے۔ وہ حق کے نہیں گمراہی کے داعی ہیں مگر یہ حقیقت تو بہرحال تسلیم کرنی ہوگی کہ ان کی حیثیت ایک قائد اور مفکر کی ہے۔ کسی کافر مفکر اور فلسفی کا رد بھی مضبوط دماغ اور منطقی ذہن چاہتا ہے۔ ایسا ذہن جو دباؤ پڑنے پر توہمات اور تخیلات کی وادی میں نہ بھٹک جائے۔ جو ذہن اس منظر نامے میں اُبھارا گیا ہے وہ تو صاف طور پر ایسا واماندہ ذہن ہے جس کے علمی و منطقی پہلوؤں پر وہم و خیال نے قبضہ جما لیا ہے

آپ اگر قوی اعصاب اور مضبوط دل و دماغ کے آدمی نہیں تو رات کے وقت کسی قبرستان میں تنہا جا کر دیکھئے۔ قدم قدم پر ایسا محسوس کریں گے کہ مُردے قبروں سے نکل نکل کر آپ کو دبوچ لینے والے ہیں۔ آپ ہی آپ ایسا لگیگا

کہ کسی قبر سے خوفناک قہقہہ بلند ہوا، کسی قبر سے غراہٹ کی آواز آئی، گھبرا کر لوٹنے لگیں گے تو دُور تک یہ محسوس کرتے جائیں گے کہ پیچھے کوئی آرہا ہے۔ قدموں کی آہٹیں تک سنائی دیں گی اور دل کی ہر دھڑکن خوف اور توہمات کا ہتھوڑا بن کر سر پر پڑتی رہے گی۔

تو کیا یہ سب کچھ آپ کی اپنی کمزوری اور ضعف کے سوا بھی کچھ ہے؟ کیا آپ کے لئے مناسب ہوگا کہ اپنے ان محسوسات کو کسی علمی اور حقیقی مسئلہ میں بنیادی اہمیت عطا فرمائیں؟

اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو انصاف فرمائیے کہ اسلاف کی جن روحوں نے محترم خاں صاحب کو یہ یقین دلایا ہے کہ وہ حق پر ہیں ان کی حقیقت موصوف کی اپنی اعصابی کمزوری اور تخیل پرستی کے سوا کیا ہے۔ بات صرف قبرستان ہی کی مثال تک محدود نہیں۔ آپ معدے کو علق تک بھر کر سو جائیں بارہا ایسے خواب نظر آئیں گے جن کو لائق التفات مان کر آپ بے ملک نواب اور بے تاج بادشاہ بن سکتے ہیں آسمانوں کی سیر کر سکتے ہیں۔

کسی جذبے کی شدت دل و دماغ کے شریانوں میں جو ہیجان و اضطراب پیدا کرتی ہے وہ بھی کبھی کبھی آدمی کی چشم تصور کو عجیب و غریب مناظر سے دوچار کر دیتی ہے لیکن خارج میں ان مناظر کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ خون کی کمی یا دوران خون کا اختلال بھی ایک سبب ہے جو کبھی جاگتے میں خواب دکھاتا اور سوتے میں ہوا پر اُڑاتا ہے۔

الحاصل کسی بھی سنجیدہ مفکر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اپنے جسمانی ضعف یا اعصابی اختلال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بعض کیفیات کو وہ نہ صرف زندہ حقیقتیں تسلیم کرے گا بلکہ انھیں اپنے فکر و دراست کا سنگِ بنیاد بھی بنائے گا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ واقعہ خانصاحب نے اس وقت کا لکھا ہے جب وہ مولانا مودودی کے فکر کی غلطیاں اور اپنے خیالات کے دلائل تلاش کر رہے تھے۔ تلاش و تحقیق کی تکمیل سے پہلے ہی انھوں نے یہ قطعی فیصلہ کر لیا کہ ان کے خیالات کی پشت پناہی اسلاف کی روحیں کر رہی ہیں اور ان کا موقف یقینی طور پر برحق ہے۔ ایسا یقین دماغ میں بٹھا لینے کے بعد کوئی زندگی بھر بھی ریسرچ کئے جائے وہ ہر حال میں اپنے ہی موقف سے مطابقت رکھنے والے دلائل کو لائقِ اعتناء سمجھے گا اور جو بھی دلائل اسکے خلاف ہوں گے ان سے اس کی نظر اُچٹ جائے گی۔ عدلِ کامل غیر جانبداری چاہتا ہے۔ شروع ہی میں یا دوران تفتیش میں ہم ذہنی جانبداری میں گرفتار ہو جائیں تو نتیجہ ظلم کے سوا کیا نکلے گا۔

ذہنی و جسمانی اختلال سے ہٹ کر بھی سوچئے تو یاد آئے گا کہ اہل اللہ کے ساتھ شیطان بڑی بڑی شعبدہ بازیاں کرتا آرہا ہے۔ شاہ عبد القادر جیلانیؒ کو زمین سے آسمان تک نور ہی نور دکھلا کر ایک گمراہ کن پیغام دینے کا واقعہ خاصا مشہور ہے۔ جن اہل اللہ نے شیطان کی بازی گری کا ادراک کر لیا وہ تو ہلاکت سے بچ گئے لیکن جن پر اس کا فریب کام کر گیا وہ کہیں کے نہ رہے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ مولانا مودودی اور ان کی دعوت کا سب سے بڑا دشمن ابلیس اس ڈرامے کا مؤسس اور ہدایت کار رہا ہو جسے خاں صاحب نے افسانوی انداز میں بیان کیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ابلیس کے ہتھکنڈوں کا کوئی شمار ہی نہیں اسے اس سے بڑھ کر محبوب اور کیا چیز ہوگی کہ بیسویں صدی عیسوی کے ہولناک اندھیاروں میں دعوتِ اقامتِ دین کا جو ایک چراغ جل رہا ہے اسے بھی کسی نہ کسی طرح بجھا ہی دے اور نہ بجھا سکے تو کم سے کم اس کے مخالفین میں اضافے کی جد و جہد کئے جائے۔ ہمارا ناقص خیال ہے کہ اگر محترم خاں صاحب وہم و خیال کے پھندوں میں اس قدر جلد نہ پھنس جاتے تو بعید نہیں تھا کہ انھیں پھانسنے کے لئے آسمان سے یا الماریوں کے جوف سے یا کتابوں کے اوراق سے کوئی ایسی ندا بھی آتی کہ اے حق پرست انسان۔ گھبرا مت۔ تو حق و صداقت پر ہے اور تیرے ہی سر

اس سعادت کا سہرا باندھنا ہے کہ اسلاف کی طرف سے مودودی فتنے کا شاندار دفاع کرے۔

تفنن نہیں۔ بڑے بڑے اولیاء اللہ کو ایسی حسین و دل کش نداؤں سے سابقہ پڑتا رہا ہے اور بعض تو ان "بے آواز نداؤں" کے شدید تأثر سے مجذوبیت کی دنیا میں پہنچ گئے ہیں۔ مضبوط قلب اور مصفّا ذہن والے ہی تھے جنھوں نے ایسی ہر گمراہ کن ندا کو خندۂ استہزاء میں اُڑا دیا اور شیطان مُنھ تکتا رہ گیا۔

توجیہہ و تاویل کوئی کچھ بھی کرے اور ہماری توجیہات کو ملنے یا نہ ماننے لیکن یہ بہرحال مسلّم ہے کہ مولانا مودودی کی تعبیر دین کو فاسد و باطل قرار دینے کے سلسلے میں جس قسم کے غیر مستقیم، تخیل پرست اور واماندہ دل و دماغ سے تحقیق اور کتب بینی کی گئی ہے ان کا اعتماد کوئی ایسا شخص تو نہیں کر سکتا جسے وہم و خیال کی پریوں کے رقصِ جمیل سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ خاں صاحب نے اپنی کہانی دہرائی تو چاہے جس خیال سے ہو لیکن حق یہ ہے کہ وہ سمجھدار پڑھنے والوں کو آغاز ہی میں اپنے فکر کی استقامت اور اسکی سلامت روی سے مایوس کر گئے ہیں۔

عربی دانی کا حدود اربعہ

قرآن کو اُردو ترجمہ و تفسیر سے تو سبھی سمجھ لیتے ہیں مگر جو شخص یہ ثابت کرنے چلا ہو کہ مولانا مودودی نے اپنی کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" میں آیات کا غلط ترجمہ اور غلط مطلب پیش کیا ہے اسے کم سے کم عربی سے تو قابلِ لحاظ حد تک واقف ہونا ہی چاہئے۔ لیکن اس کتاب کے مندرجات سے تو ثابت نہیں ہوتا کہ محترم خاں صاحب یہ استعداد رکھتے ہوں۔

پہلی غلطی

صفحہ ۲۳۶ پر ثابت یہ فرما رہے ہیں کہ مولانا مودودی جو اُلوہیت کے مفہوم میں بادشاہت کا مفہوم شامل کرتے ہیں یہ غلط ہے۔ اور جب یہ غلط ہے تو یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کو سیاسی و تمدنی دائروں میں بھی حق بادشاہت حاصل ہے۔ اللہ مالک الملک ہونا اور اَلْمَلِكُ الْحَق ہونا فوق الفطری نوع کا ہے اور وہ عرشِ عظیم کا بے شبہ مالک ہے لیکن تخت و تاج اور تہذیب و تمدن کے دوائر میں اسی کی بادشاہت اور حکمرانی برحق ہونے کا دعویٰ مولانا مودودی کی اپنی اُپج ہے۔

اس باطل ترین دعوے کے ثبوت میں خاں صاحب رُوح المعانی کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں جو انھی کے ترجمے سمیت درج ذیل ہے:-

(اَلْمَلِكُ الْحَق) اے الحقیق بالمالکیۃ علی الاطلاق ایجاداً و اعداماً بدءً و اعادۃً احیاءً و اماتۃً عقاباً و اثابۃً و کل ما سواہ مملوكٌ لہ مقہور تحت ملکوتہ	مَلِكُ الحق کا مطلب یہ ہے کہ خدا ہی علی الاطلاق مالک ہونے کا حقدار ہے، وہی وجود دیتا ہے اور وہی ختم کرتا ہے، وہی آغاز کرتا ہے اور وہی دہراتا ہے، وہی زندہ کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، وہی عذاب دیتا ہے اور وہی ثواب دیتا ہے اور اسکے سوا جو کچھ ہے سب اسکے مقہور ہیں اور اسکے اقتدار کے تحت ہیں۔

اگر خاں صاحب صحیح مطلب سمجھتے تو کبھی اس عبارت کو اپنی دلیل بنا کر پیش نہ کرتے۔ یہ عبارت تو صریح طور پر وہی کہہ رہی ہے جو مولانا مودودی کہتے ہیں۔ علی الاطلاق کا مطلب اس کے سوا کیا ہوتا ہے کہ کسی قسم کا استثناء نہیں۔ تخصیص نہیں۔ تحدید نہیں۔ تقیید نہیں۔ جو شخص اللہ کے حقِ بادشاہت سے سیاسی و تمدنی دوائر کو مستثنیٰ کرنے کا مدعی ہو وہ ہرگز اس عبارت کو نقل نہیں کر سکتا تھا اگر اسے

علی الاطلاق کے معنی معلوم ہوتے۔ پھر صاحب روح المعانی نے بڑے بڑے اُمور کا تذکرہ کرنے کے بعد وکل ماسواہ کے الفاظ کہے جن کا منشاء صاف یہ ہے کہ جتنے اُمور تمثیلاً ہم نے بیان کئے ان کے علاوہ بھی ہر شے پر خدا ہی کا حقِ حکمرانی مسلّم ہے۔ کسی شے کو خارج اور مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔

ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کن اسلاف کی روحیں تھیں جنھوں نے خاں صاحب کے اس خیال کی ہمت افزائی کی کہ خدا کے حق بادشاہت کو فوق الفطری نوع کی بادشاہت تک محدود رکھو اور اس تمنا کو دل سے نکال دو کہ سیاست اور تہذیب تمدن کی مسندوں پر بھی خدا ہی کے دین کو رونق افروز ہونا چاہیئے۔ یہ روحیں مفسرین و محدثین اور تابعینؒ وصحابہؓ کی تو نہیں ہو سکتیں۔ فراعنہ اور زنادقہ کی ہوں تو ہوں۔

عربی نہ جاننے اور قدماء کے فرمودات پر نظر نہ رکھنے کے باعث بعض مقامات پر تو خاں صاحب عجیب وغریب دعوے کر گذرے ہیں۔ فقط ایک مثال پیش خدمت ہے:۔

الا له الخلق والامر (سنو۔ خلق اسی کی ہے اور فرماں روائی بھی اسی کی ہے) مولانا مودودی کہتے ہیں کہ اس آیت سے اللہ تعالیٰ کی ہر طرح کی فرماں روائی "بالادستی" حکمرانی "بادشاہت اور آقائی" ثابت ہے۔ مگر خانصاحب کہتے ہیں کہ نہیں اس سے صرف تکوینی بادشاہت مراد ہے تشریعی نہیں۔

وہ اگر اتنے ہی پر بس کرتے تو ہم صبر کر لیتے، لیکن غضب تو ان کا یہ فقرہ ہے کہ:۔

"یہی مفہوم مفسرین نے لیا ہے"

یعنی بعض یا اکثر مفسرین نے نہیں بلکہ تمام مفسرین نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ اب اگر ہم یہ کہیں کہ ان کا یہ دعوےٰ بالکل اوندھا ہے اور صورتِ واقعہ یہ ہے کہ ایک بھی مستند مفسر ایسا نہیں جس نے تشریعی اُمور کو اس آیت سے خارج کیا ہو تو بتلایئے ان کی راست بازی اور دیانتداری کے بارے میں آپ کیا حکم لگائیں گے۔

تفسیر المنار اُٹھایئے۔ اسی آیت کی تفسیر میں لکھا گیا ہے:۔

الا ان الله له الخلق	سنو۔ اللہ ہی کے لئے ہے خلق۔
فهو الخالق المالک	پس وہ خالق ہے مالک ہے تمام مخلوقات
لذوات المخلوقات	کے جسم وجان کا اور مخلوقات میں
وله فيها الامر وهو	اسی کی حکمرانی ہے۔ حکمرانی کا دائرہ
التشريع والتكوين والتصرف	تشریع اور تکوین اور تصرف اور تدبیر
والتدبير فهو المالك	سب کو حاوی ہے پس وہ مالک ہے
والمَلِكُ لا شريك له	اور بادشاہ ہے کوئی بھی اسکے قبضے
في مِلكه ولا مُلكه۔	اور اس کی سلطنت میں شریک
(جلد ۸ ص ۴۵۲)	نہیں ہے۔

کیا یہ ٹھیک وہی تفسیر نہیں ہے جو مولانا مودودی نے کی ہے اور کیا اس میں اُمور تشریعی کو صریح الفاظ میں شامل نہیں مانا گیا ہے۔ یہی ایک نمونہ خاں صاحب کے دعوے کو ختم کر جاتا ہے کیونکہ وہ تو تمام ہی مفسرین کو اپنا ہم رائے فرما رہے تھے۔

لیکن ہاتھوں ہاتھ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی تفسیر بھی دیکھ جایئے۔ وہ اسی آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں:۔

"پیدا کرنا "خلق" ہے اور پیدا کرنے کے بعد تکوینی یا تشریعی احکام دینا یہ "امر" ہے اور دونوں اسی کے قبضہ واختیار میں ہیں۔" (ص ۲۰۲۔ قرآن مترجمہ شیخ الہندؒ)

کیا یہاں بھی تشریعی کا شمول صاف صاف نہیں ہے

حقیقت یہ ہے کہ اسی روح المعانی میں جس کے متعدد حوالے خاں صاحب نے دیئے ہیں یہ تو موجود ہے کہ مفسرین کی ایک جماعت اس آیت کی تفسیر میں فقط امور تشریعی مراد لیتی ہے لیکن ایسے ایک بھی مفسر کا تذکرہ نہیں جو تنہا تکوینی اُمور مراد لیتا ہو۔

جیسا کہ ابھی ہم دکھا چکے خاں صاحب علی الاطلاق کا مطلب نہیں سمجھتے۔ چنانچہ اپنے بالکل خلافِ واقعہ دعوے کے ثبوت میں ڈھونڈ ڈھانڈ کے ایک حوالہ ابو السعود کی تفسیر کا لائے ہیں تو اس میں بھی علی الاطلاق کے الفاظ موجود ہیں۔

فانه الموجد والمتصرف فیه علی الاطلاق	وہی سب کو وجود دینے والا ہے اور کلی طور پر اسی کا تصرف سب کے اوپر ہے

علی الاطلاق کا ترجمہ "کلی طور پر" تو کر دیا، لیکن اس مفہوم لازم کا ادراک نہ فرما سکے کہ سیاست اور تہذیب و تمدن کُل سے باہر نہیں ہیں۔ تشریعی اُمور بھی سب کے سب علی الاطلاق کے مصداق میں لازماً آتے ہیں اور مولانا مودودی نے کوئی نئی بات نہیں کہی اگر امور تشریعی اور سیاست و تمدن کو بھی علم الٰہی کا مورد و محل قرار دیدیا۔

دوسری غلطی

صفحہ ۲۴۰ پر :-

ولہ العدل التام فلا یظلم احداً ولہ التصرف فلا یشغلہ شان عن شان فیسرع الحساب	اور اسی کا انصاف مکمل انصاف ہے۔ پس وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا اور وہی متصرف ہے اور وہ جلد حساب کرنے والا ہے۔

عربی دانی کا جغرافیہ یہ ہے کہ خاں صاحب فلا یشغلہ شان عن شان کا کوئی مطلب نہ نکال سکے تو اسے حذف ہی کر گئے۔ ملاحظہ کر لیجئے اس فقرے کا کوئی ترجمہ عبارت کے ترجمے میں موجود نہیں ہے اور مزید لطیفہ یہ کہ فیسرع کی فا کا ترجمہ "اور" کر دیا گیا۔ حالانکہ مبتدی بھی جانتا ہے کہ جس فقرے پر فا داخل ہوتی ہے اس کا ترجمہ "اور" سے نہیں "پس" سے شروع ہوتا ہے کیونکہ وہ کسی پچھلے فقرے پر متفرع ہوا کرتا ہے اور تعقیب (یعنی کسی شے کے بعد بطور حاصل آنا) اس کی وضع میں داخل ہے۔ جیسے اسی عبارت میں یہ کہا گیا کہ :-

" اور اسی کا انصاف مکمل ہے "

تو اس پر اگلی بات متفرع ہوئی۔ یعنی بطور نتیجہ سامنے آئی کہ وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ لہٰذا فلا یظلم میں فا موجود ہے اور خاں صاحب نے اس کا ترجمہ بھی "پس" ہی کیا ہے "اور" نہیں کیا۔ لیکن فیسرع الحساب کی فا ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ آئی کہاں سے۔ یہ فقرہ جس پہلے فقرے پر متفرع ہے وہی ان کی سمجھ میں نہیں آیا لہٰذا اسے تو گول ہی کر گئے۔ اور فیسرع کا ترجمہ وہ کیا جو ویسرع کا ہوتا ہے ــــ پھر چکر یہ تھا کہ جس فقرے کو پی لیا گیا اس پر بھی فا داخل تھی (فلا یشغلہ) اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی کسی پچھلے فقرے

پر متفرع ہے۔ اب اس کا مفہوم ہی خاں صاحب کو معلوم نہ ہو سکا تو اس کے سوا کیا کرتے کہ جس عبارت میں واؤ عاطفہ فقط ایک بار آیا ہے اس کے ترجمے میں تین بار "اور" داخل کردیں اور فا کا ترجمہ "پس" بس ایک ہی بار رہنے دیں، حالانکہ فا تین بار سامنے موجود ہے۔

یہ بچکانہ حرکتیں اگر اس لئے کی گئیں ہوتیں کہ خانصاحب کی دانست میں ان کی کتاب فقط جہلاء ہی پڑھیں گے، تب تو بات قرینِ قیاس تھی، لیکن جس کتاب کو وہ چیلنج کے ساتھ اہلِ علم کے سامنے پیش کر رہے ہیں اس میں ارادۃً وہ موٹی موٹی غلطیاں نہیں رہنے دے سکتے۔ "بس" اس کے علاوہ کیا سمجھا جائے کہ وہ عربی سے نابلد ہونے کے باوجود بری طرح اس زعم میں گرفتار ہیں کہ عربی ان کی کنیز ہے اور جو تراجم انھوں نے کئے ہیں ان میں نقص کا سایہ تک نہیں ہے۔

تیسری غلطی

صفحہ ۲۴۷ پر روح المعانی کی ایک عبارت دی گئی ہے۔ جس کا ٹکڑا ہے حاصلہ جمیع الملك والتصرف فی المبدء والمنتھیٰ لہ تعالیٰ۔ اس کا ترجمہ یہ کیا گیا:-

"حاصل یہ ہے کہ اقتدار اور تصرف تمام کا تمام شروع سے آخر تک اسی کے لئے ہے۔"

خط کشیدہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ مترجم کو عربی کے حروفِ جارہ کے استعمال کا پورا علم نہیں۔ فی المبدء والمنتھیٰ کا ترجمہ "شروع سے آخر تک" کرنا متدیانہ غلطی ہے۔ عبارت میں مبداء دنیا کو اور منتھیٰ عقبیٰ کو کہا گیا ہے اسی لئے "فی" کا حرفِ جر آیا۔ بات تو ظاہر ہے کہ ہر حال میں یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اول سے آخر تک ہر معاملے میں کُلّی اختیار حاصل ہے لیکن دیکھنا ترجمے کی صحت کا ہے۔ صحت مفقود ہے۔

چوتھی غلطی

صفحہ ۲۵۷ پر فتح القدیر ہی کی عبارت کا ایک قطعہ (خاں صاحب کے ترجمے کے ساتھ)

تفرقوا فرقاً فی الدین حتیٰ صار کالقطع المتفرقہ	انھوں نے دین میں فرقے کر ڈالے یہاں تک کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔

کسے نہیں معلوم کہ صار صیغۂ واحد ہے۔ اگر بات یہی کہی گئی ہوتی کہ "وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے" تو جمع کا صیغہ صاروا استعمال ہوتا۔ جیسا کہ تفرقوا صیغہ جمع موجود ہے لیکن جب عربی گرامر محفوظ ہی نہیں تو یہ خیال کیسے آتا کہ صار کا فاعل واحد ہونا چاہئیے اور وہ پاس ہی موجود ہے یعنی دین۔

صحیح ترجمہ یہ تھا:-

"وہ مختلف دینی فرقوں میں تقسیم ہو گئے یہاں تک کہ خود دین متفرق ٹکڑوں جیسا ہو گیا۔"

پانچویں غلطی

صفحہ ۲۵۵ پر فتح القدیر کی عبارت مع ترجمے کے ملاحظہ ہو:-

(ولہ الکبریاء فی السمٰوات والارض) ای الجلال والعظمۃ والسلطان، وخص السمٰوات والارض لظھور ذلك فیھما	"زمین و آسمان میں بڑائی اسی کی ہے"۔ یعنی جلال وعظمت اور اقتدار اسی کا ہے۔ اور آسمان و زمین کا خاص طور پر اس لئے ذکر کیا کہ انھیں میں اسکی ان صفات کا ظہور ہوا ہے:

ترجمہ خاں صاحب کا ہے واس کے جس فقرے پر ہم نے خط کھینچ دیا ہے اسے پڑھ کر عربی کا مبتدی بھی چونک اٹھیگا۔ اور جو عربی نہیں جانتا وہ بھی ضرور تشویش میں پڑے گا بشرطیکہ ذہین ہو۔ دیکھئے نا سلف کے ایک عظیم مفسر سے کیا اس کچے قول کی اُمید ہو سکتی ہے کہ اللہ کی صفاتِ عظمت کا ظہور فقط ارض وسماہی میں ہوا ہے! ترجمہ تو یہی بتا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ قصور ترجمے کا ہے متن کا نہیں۔ متن میں تو یہ بات کہی گئی ہے کہ خاص طور پر زمین و آسمان کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات عظمت وجلال ان میں بداہتہً اور صریحاً ظاہر ہیں۔ اس قول سے یہ متبادر نہیں ہوتا کہ خدا کی صفات کا ظہور بس زمین و آسمان ہی میں منحصر ہے

کائنات کی دوسری اشیاء میں ہے ہی نہیں۔ اس کے برخلاف ترجمہ اس ظہور کو فقط آسمان و زمین میں محدود کر رہا ہے اور معنی یہ پیدا ہو گئے ہیں کہ باقی تمام چیزیں اس ظہور سے عاری ہیں۔ ظاہر ہے خانصاحب ایسے غلط مفہوم کا قصد تو نہیں کر سکتے لیکن عربی پر عبور نہ رکھنے کے باعث اپنے ترجمے کی خامی کا احساس نہیں کر سکے ہیں۔

چھٹی غلطی

صفحہ ۲۷۳ پر:-

وقال الماوردی قال جمیع اھل التاویل معنی قولہ تعالیٰ۔۔۔	ماوردی اور تمام مفسرین نے کہا ہے کہ۔۔۔۔۔۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

یہ عبارت الجامع لاحکام القرآن سے نقل کی گئی ہے ترجمہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ آگے جو بات کہی جا رہی ہے اس بارے میں الجامع کے مؤلف خود اپنا علم و مطالعہ یہ بیان فرما رہے ہیں کہ ماوردی نے اور سارے مفسرین نے ایسا کہا ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ قال الماوردی کے بعد جو واو آیا ہے وہ عاطفہ نہیں ہے بلکہ خود ماوردی کے قول کا جزو ہے۔ الجامع کے مؤلف ماوردی کا یہ قول بیان فرما رہے ہیں کہ "تمام مفسرین نے ایسا کہا ہے۔"

فرق سمجھے آپ؟ عربی عبارت میں لکھنے والے نے یہ قول ماوردی کی طرف منسوب کیا تھا کہ

"تمام مفسرین نے ایسا کہا ہے۔"

اور خانصاحب عربی پر دسترس نہ رکھنے کے باعث سمجھے یہ ہیں کہ یہ قول خود لکھنے والے کا ہے۔ نتائج میں فرق یہ پڑا کہ الجامع کے مؤلفؒ نے اس دعوے کی ذمہ داری ماوردی کے دوش پر رکھی تھی کہ تمام مفسرین نے فلاں بات کہی ہے لیکن ترجمہ اس کا سہرا خود مؤلف کے سر باندھ رہا ہے

ساتویں غلطی

بحث سورۂ توبہ کی ایک آیت سے ہو رہی ہے۔ اس میں آیت کا ایک ٹکڑا تھا۔ وَلَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ اس کا ترجمہ مولٰنا مودودی نے یہ کیا تھا کہ:-

"اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے۔"

اب خانصاحب ان کا رد کرتے ہوئے البحر المحیط کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں:-

"قال ابو عبیدہ معناہ ولا یطیعون لطاعۃ اھل الاسلام"۔ (صفحہ ۲۸۵)

اور اس کا ترجمہ فرماتے ہیں:-

"ابو عبیدہ کا قول ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی اطاعت نہیں کرتے۔"

یہ بدگمانی ہمیں نہیں کہ خاں صاحب نے جان بوجھ کر ترجمہ غلط کیا ہے۔ بتا ہم صرف یہ رہے ہیں کہ انھیں عربی پر عبور نہیں ورنہ صحیح ترجمہ یہ ہوتا کہ:-

"وہ مسلمانوں جیسی اطاعت نہیں کرتے۔"

ان دونوں ترجموں میں جو فرق ہے بجائے خود ظاہر ہے۔ لیکن جب اصل بحث سے ملا کر دیکھئے تو اس فرق کی کرشمہ سازی پوری طرح نظر آئے گی۔ مولانا مودودی کے کئے ہوئے ترجمے کا صاف متن تو یہ تھا کہ "وہ لوگ دین حق قبول نہیں کرتے" اور خانصاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ آیت کے مذکورہ ٹکڑے میں دین حق قبول کرنے کا ذکر نہیں بلکہ دین حق کی سیاسی اطاعت قبول کرنے کا ذکر ہے۔ اسی دعوے کی تصدیق وہ غلط ترجمہ سے ابو عبیدہ کے ذریعہ کرنا چاہتے ہیں۔

ہم چونکہ اس وقت صرف عربی دانی پر گفتگو کر رہے ہیں اس لئے زیادہ تفصیل سے یہ بتانا نہیں چاہتے کہ مولٰنا مودودی کے ترجمہ و تفسیر کو غلط ٹھیرانے کی جو کوشش خاں صاحب نے کی ہے اس کی علمی و منطقی حیثیت کیا ہے۔ البتہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کم سے کم دو ترجمے اُن قریبی اسلاف کے پیش کر دیں جن پر امت عموماً اعتماد رکھتی ہے۔

شاہ عبد القادرؒ نے ولا یدینون دین الحق کا ترجمہ فرمایا ہے:-

"اور نہ سچے دین (اسلام) کو قبول کرتے ہیں۔"

اور حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ فرمایا ہے :-

"اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا"

اب فرمائیے مولانا مودودی کا متذکرہ ترجمہ ان دونوں تراجم سے مطابقت رکھتا ہے یا خاں صاحب کا یہ ارشاد کہ :-

"آیت کی صحیح تاویل یہ ہے کہ یہاں یدینون دین الحق کا فقرہ دین حق کی سیاسی اطاعت قبول کرنے کے معنی میں آیا ہے" صفحہ ۲۹۴

یعنی وہ کافرانہ حرکتوں سے باز نہ آئیں بلکہ مسلمان حکومت کی رعایا بنے رہیں تو آیت کا مقصود پورا ہے۔ اسی تاویل کو مؤکد کرنے کے لئے البحر المحیط کا مذکورہ ٹکڑا لایا گیا اور ہم یہ نہیں کہتے کہ قصداً ترجمہ غلط کیا گیا ہے بلکہ زبان سے ناواقفیت کے باعث خانصاحب صحیح یہی سمجھے ہوں گے کہ یطیعون طاعۃ اھل الاسلام کے معنی مسلمانوں کی اطاعت قبول کرنے کے ہیں — درانحالیکہ صحیح معنی "مسلمانوں جیسی اطاعت" کے ہیں۔ قرآن ہی میں جگہ جگہ اطاعت کا حکم آیا ہے۔ کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ اطیعوا اطاعۃ اللہ۔ یا اطیعوا طاعۃ الرسول۔ پھر بھی خاں صاحب متنبّہ نہ ہوئے کہ وہ کیا ترجمہ فرما رہے ہیں۔

آٹھویں غلطی

اگلے ہی صفحے پر ابن جریر کی عبارت یہ لکھ کر نقل کی گئی ہے کہ :-

"اسی تاویل کو ابن جریر طبری نے اختیار کیا ہے"

لیکن ابن جریر کی عبارت کو سمجھنے میں بھی موصوف نے ٹھوکر کھائی۔ ابن جریر جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ اصلاً مولانا مودودی کا مؤید ہے نہ کہ خاں صاحب کا۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس عبارت میں لا یطیعون اللہ طاعۃ الحق کے الفاظ موجود ہیں مگر انھیں پھر بھی تنبّہ نہ ہوا کہ البحر المحیط کی عبارت کا میں کیا ترجمہ کر آیا ہوں۔

نویں غلطی

صفحہ ۲۹۵ پر :-

(یدخلون فی دین اللہ افواجا) اے ملۃ الاسلام التی لا دین یضاف الیہ تعالٰی غیرھا (افواجا) اے یدخلون فیہ جماعات کثیفۃ کاھل مکۃ والطائف والیمن۔	یدخلون فی دین اللہ افواجا — یعنی دین اسلام میں کثیر تعداد میں داخل ہو رہے ہیں جیسے اہل مکہ طائف، یمن ۔۔۔

معلوم ہوتا ہے ایک پورے فقرے کا ترجمہ خانصاحب کی سمجھ میں نہیں آیا۔ چنانچہ اسے بالکل نظر انداز کر گئے۔ قاعدہ معروف ہے کہ جب ایک عبارت نقل کر کے اس کے بالمقابل ترجمہ دیا جاتا ہے تو جو بھی فقرے عبارت میں موجود ہیں ان سب کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ اصل عبارت میں چند مرادف الفاظ موجود ہوں اور مترجم ان میں سے کسی ایک لفظ کا ترجمہ کر دینا کافی سمجھے لیکن یہ صریحاً غلط ہے کہ پورا ایک فقرہ ترجمے میں حذف کر دیا جائے۔

دیکھ لیجئے۔ منقولہ عربی عبارت میں یہ جملہ موجود ہے کہ اے ملۃ الاسلام التی لا دین یضاف الیہ تعالٰی غیرھا۔ اس کا ترجمہ یہ تھا کہ :-

"یعنی ملتِ اسلام — وہ اسلام کہ اس کے سوا کوئی دین نہیں ہے جس کی اضافت اللہ تعالٰی کی طرف کی جائے"

مگر خاں صاحب اسے شاید اس لئے حذف کر گئے کہ اس پر قادر نہیں ہو سکے تھے۔

اور افواجاً کا ترجمہ بھی جھول سے خالی نہیں کہ "دین اسلام میں کثیر تعداد میں داخل ہو رہے تھے"

افواجاً کا صحیح مصداق ہے غول در غول اور

جوق در جوق داخل ہونا۔ کثیر تعداد میں داخل ہونا تو اسے بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک ایک کرکے بہت سارے آدمی داخل ہو جائیں۔ لیکن سورۂ اذا جاء میں وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کہہ کر جس منظر کی نشاندہی کی گئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ بہت کثرت سے لوگ دینِ الٰہی میں داخل ہوں گے بلکہ یہ ہے کہ جماعتیں کی جماعتیں اور گروہ کے گروہ بیک وقت اسلام لائیں گے۔ ان دونوں میں ہیئت کا جو فرق ہے وہ ظاہر ہے۔ مفہوم چاہے خاں صاحب نے ٹھیک ہی سمجھ لیا ہو لیکن ترجمے کے الفاظ صحیح ترجمے کی صلاحیت کی کمی پر دلالت کرتے ہیں۔ کوئی بھی مترجم قرآن اٹھا کر دیکھ لیجئے وہی ترجمہ ملے گا جسے ہم درست کہہ رہے ہیں۔ ایک ایک کرکے اگر سارا عرب بھی مسلمان ہو جاتا تو آیتِ قرآنی کی عملی توثیق نہیں ہو سکتی تھی۔ گویا آیت کا مقصود صرف کثرت کا بیان نہیں ہے، بلکہ ایک خاص منظر کا بیان ہے جو فوج در فوج داخلے کی شکل میں پیش آنے والا ہے۔ (اور پھر وہ پیش آیا)

دسویں غلطی

یہ غلطی اتنی موٹی اور بھونڈی ہے کہ اگر کوئی عربی داں اس مقام پر پہنچ کر کتاب کو بند ہی کر دے تو بعید نہیں۔ — ملاحظہ ہو۔ گفتگو اس آیت پر ہو رہی ہے:۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوریٰ ۱۳)	خدا نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو اور ابراہیم کو اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا اور (اے محمد) تمہاری طرف بھی ہم نے اسی کی وحی کی ہے یہ کہ اس دین پر قائم رہو اور اس میں متفرق نہ ہو۔ (یہ مولانا مودودی کا ترجمہ ہے)

اس کے مفہوم پر جو گفتگو کی گئی ہے اس سے یہاں بحث نہیں۔ بحث یہاں عربی دانی کی ہے۔ دورانِ گفتگو میں خانصاحب امام رازیؒ کی ایک عبارت اسی آیت کی تفسیر سے نقل کرتے ہیں۔ ذرا اہلِ علم حیرت کریں کہ ترجمہ اس عبارت کا خاں صاحب نے کیا فرمایا ہے:۔

انہ عطف علیہ سائر الانبیاء وذلک یدل علی ان المراد ھو الاخذ بالشریعۃ المتفق علیھا الکل (تفسیر کبیر)	شرع لکم من الدین — کے فقرے پر تمام انبیاء کا عطف ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حکم کا مطلب شریعت کے اس حصہ پر پوری طرح عامل ہوتا ہے جو تمام انبیاء کے درمیان متفق علیہ ہے۔

ترجمے کے جس جملے پر ہم نے لائن کھینچدی ہے اسے پڑھ کر عربی کا مبتدی بھی چونک پڑے گا اور پھر کہیں اس نے تفسیر کبیر اٹھا کر امام رازی کی وہ عبارت بھی دیکھ لی جس میں سے کاٹ کر یہ ٹکڑا نقل کیا گیا ہے تو اپنا سر پیٹ لے گا۔ آیئے ہم بتائیں کہ امام رازیؒ کی پوری عبارت کیا ہے — واحتج بعضھم بقولہ شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا علی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی اول الامر کان مبعوثا لشریعۃ نوح علیہ السلام والجواب ماذکرنا انہ عطف علیہ سائر الانبیاء وذلک یدل علی ان المراد ھو الاخذ بالشریعۃ المتفق علیھا بین الکل۔

اس پوری عبارت میں سے خانصاحب نے صرف وہ نقل کیا ہے جس پر ہم نے خط کھینچا ہے۔ کوئی بھی طالب علم پہلی ہی نظر میں سمجھ سکتا تھا کہ انہ عطف علیہ میں علیہ کی ضمیر حضرت نوح کی طرف لوٹ رہی ہے نہ کہ شرع لکم والے فقرے کی طرف۔ امام رازیؒ یہ کہہ رہے ہیں کہ آیت مذکورہ میں جو متعدد انبیاء حضرت ابراہیمؑ اور اور حضرت عیسیٰؑ وغیرہ کا نام واؤ عاطفہ کے ساتھ آیا ہے تو یہ عطف نوحؑ پر ہے۔ اب اگر طالب علم کے سامنے تفسیر کبیر نہ ہوتی اور وہ خاں صاحب کا نقل فرمودہ ٹکڑا ہی دیکھتا تب بھی وہ بلا ادنیٰ تامل اس نتیجے پر پہنچ جاتا کہ

ترجمہ لغو کیا گیا ہے کیونکہ یہ بات عربی کے مبتدی بھی جانتے ہیں کہ مفرد کا عطف فقرے پر نہیں ہوا کرتا۔ معطوف اور معطوف علیہ دونوں ہی یا تو مفرد ہوں گے یا مستقل فقرے یہ قاعدہ تنہا عربی ہی کا نہیں بلکہ دنیا کی ہر زبان کا ہے۔

جیسے آپ یوں کہیں کہ:-

"زید وہاں گیا اور عمر بھی"

تو عمر کا عطف زید پر مانا جائے گا نہ کہ پورے فقرے پر۔ زید اور عمر دونوں اپنی اپنی جگہ مفرد ہیں۔ لیکن جب آپ یوں کہیں کہ:-

"زید وہاں گیا اور عمر نہیں گیا"

تو دوسرے فقرے کا عطف پہلے فقرے پر ہوگا۔

متذکرہ بالا آیت قرآنی میں حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ جملہ انبیاء کا تذکرہ فرداً فرداً ہے اور ہر ایک کے ساتھ واو عاطفہ موجود ہے لہٰذا جو مترجم یہ ترجمہ کر گذرے کہ "تمام انبیاء کا عطف شرع لکم من الدین کے فقرے پر ہے" اسے اجہل کہیں گے۔ عطف صریحاً اور یقیناً نوحؑ پر ہے۔ افسوس خانصاحب کی خود فریبی نے مفسرین سلف کا حلیہ بھی بگاڑا۔ یہ الگ بات ہے کہ اہلِ علم قاری مفسرین پر نہیں فاضل مترجم کی قابلیت پر اناللّٰہ پڑھیں گے۔

گیارھویں غلطی

صفحہ ۳۴۴ کی عبارت ملاحظہ ہو:-

"مفسرین بعض مستثنیٰ راویوں کو چھوڑ کر سب کے سب لِیُظْهِرَہٗ کا فاعل خدا کو مانتے ہیں نہ کہ رسول کو۔ ضمیر مفعول (ہ) کے بارے میں تو ضرور ان کے درمیان اختلاف ہے۔ کچھ لوگ اس کا مرجع رسول کو مانتے ہیں اور کچھ دینِ حق کو۔ مگر یظہر کا فاعل سب کے نزدیک خدا ہے"۔

اس عبارت میں جو فکری الجھاؤ ہے اس کے علاوہ صریح تضاد بھی موجود ہے۔ پہلے تو خاں صاحب خود ہی "بعض مستثنیٰ راویوں کو چھوڑ کر" فرماتے ہیں جس کا مطلب اسکے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ کچھ راوی ایسے بھی ہیں جو یظہر کا فاعل خدا کو نہیں مانتے۔ اس اقرار کے فوراً بعد ان پر فرمانا کہ

"مگر یظہر کا فاعل سب کے نزدیک خدا ہے"

کیا تضاد مبین نہیں۔

پھر ایک اور لطیفہ۔ جب وہ کہہ رہے ہیں کہ:-

"ضمیر مفعول (ہ) کے بارے میں تو ضرور ان کے درمیان اختلاف ہے کچھ لوگ اس کا مرجع رسول کو مانتے ہیں اور کچھ دین حق کو"۔

تو اس سے کیا یہی معلوم نہیں ہوتا کہ دونوں قسم کی رائے رکھنے والے خاصی خاصی تعداد میں موجود رہے ہیں اور ان کے مابین شمار کا اتنا بڑا فرق نہیں ہے کہ ایک فریق کی تعداد تو برائے نام ہو اور دوسرا فریق بھاری اکثریت میں ہو۔

جب یہی ان الفاظ سے بداہتہً ظاہر ہے تو اب سنئے کہ جو لوگ لِیُظْهِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ کے فقرہ قرآنیہ میں ضمیر مفعول (ہ) کا مرجع رسولؐ کو مانتے ہیں وہ یظہر کا فاعل لازماً اللّٰہ ہی کو مانتے ہیں۔ یعنی وہ ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ

"تاکہ اللّٰہ غالب کر دے رسولؐ کو تمام دینوں پر"

ثمرہ یہ نکلا کہ ایک ہی مقام پر چند ہی سطروں میں خاں صاحب نے تین باتیں کہہ ڈالیں۔ ایک یہ کہ۔

بعض مستثنیٰ راویوں کو چھوڑ کر سب مفسرین یظہرہٗ کا فاعل اللّٰہ کو مانتے ہیں۔

دوسری یہ کہ۔ یظہر کا فاعل سب کے نزدیک خدا ہے

تیسری یہ کہ۔ یظہر کا فاعل خدا کو ماننے والے اتنی بھاری اکثریت میں نہیں ہیں کہ دوسرے فریق کے مقابلہ میں انھیں کوئی خاص فوقیت دی جا سکے۔

ارشاد فرمائیے کیا یہ تینوں باتیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر یہ نہیں کہہ رہی ہیں کہ لکھنے والے کے فکری قویٰ جواب دے چکے ہیں اور وہ سخت ذہنی انتشار کا شکار ہے

اور ملاحظہ ہو:-

"امام رازیؒ نے (اسی طرح اور بعض مفسرین نے)

اگرچہ اظہار کا فاعل خدا کو ماننے کے ساتھ امکان بھی تسلیم کیا ہے کہ اس کا فاعل رسول بھی ہو سکتا ہے مگر ان کی یہ رائے محض نحوی اعتبار سے ہے۔ ورنہ اس فقرے میں جس عمل کا ذکر ہے اس کو وہ حقیقتاً خدا ہی کا عمل جانتے ہیں رسول صرف اس کا ایک ظاہری ذریعہ تھا اور بس۔" (ص ۳۲۵)

اس عبارت سے متبادر ہوتا ہے کہ امام رازیؒ اس بات کو بس برائے نام ہی ممکن سمجھتے ہیں کہ اظہار کا فاعل رسولؐ کو مانا جائے۔ لیکن خود امام رازیؒ کے الفاظ کیا ہیں۔ ملاحظہ ہوں:۔

فیحتمل ان یکون الفاعل للاظھار ھو اللہ ویحتمل ان یکون ھو النبی۔	پس یہ بھی احتمال ہے کہ اظہار کا فاعل اللہ ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ فاعل نبی ہو۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

کیا کوئی بھی عربی داں کہہ سکتا ہے کہ اس عبارت میں دونوں احتمالوں کو برابر کا تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ خانصاحب امام رازیؒ کے مجموعی کلام کا منشا ہی نہیں سمجھے ورنہ یہ فیصلہ نہ کرتے کہ رسول کو اظہار کا فاعل قرار دینا بس برائے نام امکان کے درجے میں ہے۔ امام رازیؒ نے دونوں احتمالوں کو یکساں قرار دیتے ہوئے صرف قیاس کے ذریعے ایک احتمال کو زیادہ ظاہر اور راجح خیال کیا ہے۔

دوسری بات یہ دیکھنے کی ہے کہ فاعل چاہے رسول ہی کو بنایا جائے مگر کیا تمام ہی مسلمان پہلے بھی اور آج بھی یہی عقیدہ نہیں رکھتے ہیں کہ کوئی بھی کامیابی اور فتح و غلبہ ظاہراً کسی بھی رہنما اور پیغمبر کی قیادت میں حاصل ہو مگر فاعلِ حقیقی اس کا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہ لوگ فاعلِ حقیقی نہیں ہیں جو ظاہراً سبب اور وسیلہ بنے ہیں۔ پھر کیا حاصل کہ امام رازیؒ اور بعض مفسرین کی تخصیص کے ساتھ اس عقیدہ و خیال کا اثبات کیا جارہا ہے اور اسی معلوم و مسلّم عقیدے کے اثبات میں مزید ایک صفحہ سیاہ کیا گیا ہے۔ تحصیل حاصل کی یہ بھونڈی مثال ہے۔ مگر خانصاحب اس سے دراصل ایک خاص مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ کہ مولانا مودودی جو دین کو غالب کرنے کی نسبت رسول کی طرف فرما کر امتِ مسلمہ کا نصب العین اقامتِ دین قرار دیتے ہیں وہ اس لئے غلط ہے کہ دین کو غالب کرنے کا کام اللہ کا تھا نہ کہ رسول کا! اب بتایا جائے کہ کیا یہ تأثر دینا صریح زیادتی نہیں ہے کہ جب مولانا مودودی غلبۂ دین کی نسبت رسول کی طرف کرتے ہیں تو ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ فاعلِ حقیقی بھی رسول ہی ہے اور خدا کے ارادے اور فیصلے کا اس سے کچھ تعلق نہیں۔ استغفر اللہ۔ مولانا مودودی ہوں یا کوئی اور، جب بھی وہ یہ کہے گا کہ رسول کے فلاں فعل کی پیروی کرو تو یہ مطلب ہرگز نہیں ہوگا کہ اس فعل کے فاعلِ حقیقی بھی رسول ہی تھے۔ ہو سکتا ہے خانصاحب نے قصداً یہ تأثر نہ دینا چاہا ہو، لیکن قلم کی ایسی بے راہ روی تو بہرحال افسوسناک ہی ہے جو حقائق کا منہ چڑھائے اور بےگناہوں کو مجرم باور کرائے۔

بارھویں غلطی

عمدۃ القاری کی ایک عبارت:۔

قولہ (حتی یقیم بہ) ای حتی ینفی بہ الشرک ویثبت التوحید۔	یقیم بہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے رسولؐ کے ذریعہ شرک کی نفی اور توحید کا اثبات کرے۔

یہ ترجمہ بادی النظر میں تو درست ہے لیکن جب یہ دیکھئے کہ مترجم اس سے فائدہ کیا اٹھانا چاہتے ہیں تو بالکل غلط ہو جاتا ہے۔ وہ چونکہ یہ ثابت کرنے کے درپے ہیں کہ رسول کا کام صرف تبلیغ اور وعظ ہے عملی جدوجہد سے حکومتِ الٰہیہ قائم کرنا اس کا نصب العین نہیں لہٰذا نفی اور اثبات کے الفاظ ترجمے میں رکھ کر اس بات کو چھپا گئے کہ نفی اور اثبات سے مراد اس جگہ صرف وعظ و تبلیغ نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ عملاً شرک کا استیصال کر دیا جائے اور عملاً ہی توحید کا استقرار کیا جائے۔ عبد اللہ

ابن عمرؓ توراۃ کے حوالے سے اللہ کی جس پیشین گوئی کا تذکرہ فرما رہے ہیں وہ اگر صرف یہ ہو کہ آنے والے نبی (محمدؐ) صرف وعظوں میں شرک کی نفی اور توحید کا اثبات کریں گے تو یہ کوئی قابلِ ذکر بات نہ ہوتی۔ اس مضمون کے وعظ تو سارے ہی پیغمبر کرتے رہے ہیں اور پیغمبر بھیجے ہی جاتے ہیں اسی تبلیغ کے لئے۔ لیکن خصوصیت کچھ ہو سکتی ہے تو یہ کہ آنے والا نبی وعظ و تبلیغ سے گذر کر جہد و عمل کے ذریعے اسلام کو مسندِ اقتدار پر بٹھائیگا اور شرک کو عرب کے حدود میں کچل کر رکھدے گا۔ یہی خصوصیت پیشین گوئی بننے کے شایانِ شان تھی۔ لیکن خانصاحب کو چونکہ حکومتِ الٰہیہ کی جد وجہد سے ضد ہوگئی ہے اس لئے وہ ترجمہ ایسے الفاظ میں کر گئے جو اقدام وعمل کے رُخ پر خاموش ہیں۔

تیرھویں غلطی

صفحہ ۴۵۷ پر:۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ آذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَاءٍ	اگر یہ لوگ اعراض کریں تو ان سے کہدو کہ میں نے پیغامِ رسالت سے آگاہ کر دیا ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

فرمایا جائے کہ "پیغامِ رسالت" کس لفظ کا ترجمہ یا مفہوم ہے؟ "علیٰ سواءٍ" کا ترجمہ نہ کرنا اور "پیغامِ رسالت" کے الفاظ اپنی طرف سے بڑھا دینا لائقِ داد ہے یہ مت کہیئے کہ خلاصۂ مطلب ہر حال میں ایک ہی ہے دیکھنا تو زبان فہمی کا ہے۔ کوئی بھی مترجم قرآن اُٹھا کر دیکھئے کیا اس میں علیٰ سواءٍ کا ترجمہ "پیغامِ رسالت پہنچانا" کیا گیا ہے۔

اور عنوان اس آیت کا "ایذانِ وحی" دیا گیا ہے جبکہ پورے قرآن میں یہ مصادرہ وحی یا پیغام رسالت پہنچانے کے لئے کہیں استعمال نہیں ہوا۔ اس سے عربی دانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

چودھویں غلطی

صفحہ ۴۵۸ پر:۔

وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ۔	(موسیٰ کو ہم نے بھیجا کہ) لوگوں کو اللہ کے دنوں کی یاد دلاؤ۔

آیت کا فقط اتنا سا ٹکڑا لیکر ایک ایسا ترجمہ کر دینا جو فقط وعظ و تبلیغ کا تصور دیتا ہو اور اقامتِ دین کی عملی جد وجہد کا تصور پاس نہ پھٹکنے پائے آیاتِ قرآنیہ سے مذاق کرنا ہے۔ اس ٹکڑے سے متصل قبل ہی یہ الفاظ موجود ہیں:۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ	اور ہم نے موسیٰ کو نشانیاں دیکر بھیجا کہ نکال اپنی قوم کو اندھیروں سے روشنی کی طرف۔

کیا یہ اَخْرِجْ کا حکم فقط زبانی تذکیر و تبلیغ کا حکم ہے یا اس کے پیرائے اور اسپرٹ میں اقامتِ دین کی جد وجہد کا حکم بھی صاف نظر آرہا ہے۔

تاہم پچھلے کسی پیغمبر کے لئے یہ ہی ثابت ہو جائے کہ اس کا فریضہ صرف وعظ کہنا تھا تب بھی یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ خاتم الانبیاء کا فریضہ بھی فقط وعظ و تبلیغ تھا۔ اسلام کو سیاسی معنوں میں غالب کرنے کی جد وجہد ان کے فریضۂ رسالت سے خارج تھی۔ مولانا مودودی کے رد میں قرآنی آیات سے تو غلط تاثر دینے اور لینے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔

پندرھویں غلطی

صفحہ ۴۶۴ پر:۔

ان الاول عبارة عن رتبة العبادة التي هي فعل ما يرضى به الله تعالى والثاني عن رتبة العبودية التي هي الرضا	اس لئے کہ "حق" عبادت کا یہ درجہ ہے کہ بندہ وہ کچھ کرے جو اللہ تعالیٰ کی رضا ہو اور "صبر" عبادت کا یہ درجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ آئے اس پر

بما فعل اللہ تعالیٰ | بندہ بالکل راضی رہے۔

یہ ترجمہ اس پر تو ضرور دلالت کرتا ہے کہ مترجم کی عربی خُدا خُدا کر کے اصل مفہوم تک پہنچ گئی ہے لیکن وہ خوبی اس میں یکسر مفقود ہے جو اس بات کا مظہر ہوا کرتی ہے کہ مترجم نے متن کے پیرائے اور اسلوب کو بھی سمجھ لیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے :-

"بندہ وہ کچھ کرے —— اور —— بندہ بالکل راضی رہے۔"

یہ فعلیہ جملے ہیں۔ انھیں ترجمے کی بلاغت کی رو سے فعلیہ ہی جملوں کا ترجمہ ہونا چاہیئے تھا لیکن اہلِ علم دیکھ رہے ہیں کہ متن میں لفظ فعل اور لفظ رضا بطور اسم استعمال ہوا ہے۔ اسے صیغہ بنا کر نہیں لایا گیا۔ پھر اس کے سوا کیا سمجھا جائے کہ مفہوم تک پہنچ جانے کے باوجود مترجم عربی عبارت کے لفظی دروبست کو نہیں پا سکے۔

اتنا کچھ عرض کرنے کے بعد ہم تمام قارئین سے یہ بھی کہدینا چاہتے ہیں کہ وہ فقط ہمارے اعتماد پر مطمئن نہ ہو جائیں بلکہ کسی بھی ایسے عربی داں سے جو جماعت اسلامی سے تعصب نہ رکھتا ہو دریافت کر کے دیکھ لیں کہ غلطیاں چھانٹنے میں عامر عثمانی نے زیادتی اور دھاندلی تو نہیں کی ہے۔ یقین جانیئے ہم نے استقراء کی کوشش نہیں کی یعنی یہ ارادہ نہیں کیا کہ ساری کتاب میں عربی تراجم کی جتنی خامیاں ہیں سب کو گرفت میں لائیں۔ یہ کافی طولانی عمل ہوتا کیونکہ بعض خامیوں کے اثبات میں طویل بحث درکار بھی لہٰذا ہم اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہوئے اہلِ انصاف سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اس استعداد اور ایسی عربی قابلیت کا آدمی بجا طور پر اس کا حقدار ہے کہ اپنے طور پر قرآن اور قدیم کی تفاسیر کا مطالعہ کر کے مسلّمہ استادوں کی غلطیاں نکالے۔

خود اعتمادی اچھی چیز ہے، لیکن جب یہ خود پرستی اور زعم باطل میں تبدیل ہو جائے تو جہل مرکب کہلاتی ہے

آپنے دیکھا کہ خانصاحب اعظم گڑھ میں ہیں۔ وہاں اہلِ علم کی کمی نہیں۔ دل و دماغ میں غیر معمولی خود پسندی اور زعم کی بہتات نہ ہوتی تو کوئی دشواری نہ تھی کہ اپنے تراجم کسی عالم کو دکھا لیتے اور مشورہ کر لیتے کہ جو کچھ میں سمجھ رہا ہوں وہ غلط ہے یا درست۔ مگر وہ :-

آں کس کہ نداند و بداند کہ بداند

کی منزل میں ہیں۔ بظاہر انہیں آپ ایک مجذوب صفت عابد پائیں گے۔ صالح اور دیندار دیکھیں گے۔ سوز و گداز ان کے لفظ و بیان میں کروٹیں لیتا نظر آئے گا، عجز و انکسار سے ان کے الفاظ و اطوار لبریز ہوں گے، لیکن ذہن و قلب کی جڑوں میں خود پسندی اور خوش فہمی کا جو زہر سرایت کر گیا ہے اس کا شعور شاید خود انھیں بھی نہیں۔ یہ ہوتا ہے۔ بارہا ہوتا ہے کہ ہم خود اپنے ہی دل و دماغ میں پرورش پانے والے جرثوموں کا ادراک و احساس نہیں کر پاتے اور وہ اندر ہی اندر کینسر پھیلاتے رہتے ہیں —— ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ مولانا مودودی یا کسی اور کے رَد کا فکر کرنے کی بجائے خاں صاحب کو خود تنقیدی کا جرأت آزما مرحلہ طے کرنا چاہیئے۔ آدمی اپنے کو پالے تو سب کچھ پا لیا۔ اپنے کو نہ پائے تو ہفت اقلیم کی بادشاہت بھی کنکر سے زیادہ نہیں۔ کیا خوب کہہ گئے ہیں ڈاکٹر اقبال :-

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

"تعبیر کی غلطی" میں ایک مراسلت خاں صاحب اور مولانا جلیل احسن ندوی کی بھی ہے۔ سچ یہ ہے کہ مولانا موصوف نے جس قسم کے خطوط لکھے ہیں انھیں پڑھ کر الجھن ہوتی ہے، اور بدگمانی بھی انگڑائی لیتی ہے۔ خیر سے خاں صاحب کا مقصود بھی مراسلتوں کی اشاعت سے یہی ہے کہ وہ اپنی مظلومیت اور اکابر جماعت کی کج روی کا یقین دلا سکیں۔ جب ہمیں

الجھن ہوئی تو عام قارئین تو جتنا بھی بدمزہ ہوں کم ہے۔ لیکن مولانا موصوف کی فراست اور مردم شناسی کا اندازہ اس وقت ہوا جب پوری کتاب پڑھ کر خاں صاحب کی عربی دانی کا جغرافیہ سامنے آگیا۔ مولانا تو ان کے استاد ہیں۔ وہ پہلے ہی جانتے رہے ہوں گے کہ شاگرد رشید کی زباندانی کس پائے کی ہے۔ اسی پہلو کا احساس دلانے کے لئے انھوں نے اصل مسئلہ پر گفتگو کرنے کی بجائے عربی زبان کے قواعد و مطالب کو اپنے سوالات کا محور بنایا۔ نتیجہ یہ کہ خاں صاحب ایک دو ہی خطوں میں بھاگ کھڑے ہوئے۔

مولانا مودودی نے کس لئے ان کے مرسلہ مضمون پر تبصرہ نہیں کیا اور کیوں اسے واپس کر کے خاموش ہو گئے اس کی معقولیت کا اندازہ بھی وہی شخص کر سکتا ہے جو خانصاحب کی صحیح استعداد اور مقام و منصب کا ادراک کر لینے کے بعد یہ نظارہ کرے کہ وہ برابر علم و استعداد کس اونچے مقام سے بول رہے ہیں۔

مولانا مودودی نے اپنے خط میں فرمایا:۔

"میرا خیال یہ ہے کہ آپ کا مطالعہ نہایت ناقص ہے آپ نے غلط نتائج نکالے ہیں اور میرے مسلک کو بھی آپ پوری طرح نہیں سمجھے ہیں بلکہ اس کی ایک غلط تعبیر آپ نے کر لی ہے۔ لیکن غضب یہ ہے کہ اس مضمون میں آپ اپنے آپ کو ایک بہت اونچے مقام پر فائز سمجھ کر کلام فرما رہے ہیں اور آپ کا انداز کلام یہ ہے کہ جو شخص آپ کے نقطۂ نظر کو قبول نہیں کرتا وہ جاہل و ناداں بھی ہے اور ضال و مضل بھی۔ اب میری مشکل یہ ہے کہ علم کی کمی کے ساتھ جو شخص اس طرح کے زعم میں مبتلا ہو اس سے مخاطب ہونے کی مجھے عادت نہیں ہے۔" (صلہ ۱۶۲)

مراسلتیں چونکہ کتاب کے شروع میں ہیں اس لئے مولانا مودودی کا یہ ریمارک پڑھ کر ہمیں ان پر غصہ آیا تھا۔ ہم واقعی اس کتاب کو پڑھنے سے قبل خاں صاحب کی استعداد کے بارے میں کافی حسن ظن رکھتے تھے۔ کم سے کم انھیں عربی کا فارغ التحصیل تو سمجھتے ہی تھے۔

لیکن جوں جوں کتاب کو پڑھا حسن ظن کے شیش محل کی ایک ایک دیوار پاش پاش ہوتی چلی گئی اور ماننا پڑا کہ مولانا مودودی کا بحث سے اجتناب غلط نہیں تھا۔ آخر ایسے شخص سے کوئی سنجیدہ اور علمی انسان مباحثے میں وقت کیوں برباد کرے گا جو چھوٹا سا عطارخانہ فراہم کر لینے کی بنیاد پر بڑے بڑے اطبار کے لب و لہجے میں گفتگو کرنے لگا ہو اور جو چند سال ریل کی ڈرائیوری کر لینے کے نتیجے میں اس نے یہ سمجھ لیا ہو کہ اب میں پیچیدہ سے پیچیدہ مشین کے میکنزم اور ٹکنک پر ماہرانہ کلام کر سکتا ہوں۔

زعم و ادّعا

آگے بڑھنے سے پہلے ہم دیانتۃً یہ وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ خاں صاحب کی علمی غلطیاں سامنے لانے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی تمام ہی خوبیوں اور قابلیتوں کا انکار ہے۔ ہم صفائی سے کہتے ہیں کہ ان کی ذہانت اور ان کے سلیقۂ تحریر کے ہم دل سے معترف ہیں۔ وہ فہیم بھی ہیں، نقد و نظر کی صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں۔ اُردو بہت اچھی لکھتے ہیں۔ مطالعے کے بھی شائق ہیں۔ صوم و صلوٰۃ میں بھی کسی سے پیچھے نہیں اور عین ممکن ہے کہ تہجد، اشراق اور اوّابین بھی پڑھتے ہوں۔ انھیں نہ غرض پرست کہا جا سکتا ہے نہ حریص۔ وہ اخلاص بھی رکھتے ہیں اور حبِّ دین بھی۔

لیکن یہ تمام ہی خوبیاں کسی شخص کو کید الشیاطین کی زد سے باہر نہیں لے جاتیں۔ یہ اس بات کی ضمانت نہیں ہیں کہ وہ شخص ہر مسئلے میں منزلِ صواب ہی تک پہنچے گا اور ان کی موجودگی یہ بھی لازم نہیں کرتی اب یہ شخص اپنی ان صلاحیتوں کو غلط راہ میں استعمال نہیں کرے گا۔ یہاں ہم خانصاحب ہی کی کتاب سے چند فقرے نقل کرتے ہیں۔ وہ قبولِ حق کی رکاوٹیں گنواتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"چوتھی چیز استکبار یا اپنے بارے میں برتری کا احساس ہے استکبار در حقیقت خود فریبی کی ایک حالت کا نام

ہے۔ ایسا شخص اپنے اندر کچھ خوبیاں دیکھ کر انھیں کی روشنی میں کمتری اور برتری کا ایک خود ساختہ معیار بنا لیتا ہے جس کی وجہ سے کسی اور کی حقیقی خوبیاں اسے نظر نہیں آتیں۔ اس کے ذہنی چوکھٹے میں ہمیشہ اس کا اپنا وجود ہی دوسروں سے اونچا دکھائی دیتا ہے۔" (صفحہ ۵)

یہ تقریر بجائے خود غلط نہیں بلکہ ایک نفسیاتی صداقت پر مبنی ہے لیکن دوسروں کو متکبر اور فریب خوردہ قرار دینے سے پہلے اگر خاں صاحب خود اپنی نفسیات میں جھانک کر دیکھتے تو عین ممکن تھا کہ انھیں وہاں بھی وہی استکبار اور احساس برتری کُھد بُد لیتا نظر آجاتا جو ان کی دانست میں ان کے موقف کی تائید نہ کرنے والوں کے اندر پایا جاتا ہے اور انھیں گمراہی پر جامد اور حق و صداقت سے گریزاں کئے ہوئے ہے

ایسی تو کوئی ترازو نہیں جس میں آدمی اپنے مغز کو دال آٹے کی طرح تول سکے لہٰذا خاں صاحب اگر اپنی ذہانت اور اصابت رائے کو دنیا بھر سے فائق اور روزنِ دار خیال کرتے ہوں تو اسے بجائے استکبار کے سادہ لوحی بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ تو بہرحال ان کے علم میں پوری طرح تھا کہ میں نے عربی کتنی اور کیسے پڑھی ہے۔ ان جیسا باخبر اور فہیم آدمی اس سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ زبان عربی کا کیا پایہ ہے اور اسے معتد بہ طور پر حاصل کرنے کے لئے کم سے کم کیا جد و جہد کس ترتیب اور دروبست کے ساتھ ہونی چاہئے۔ عربی مدارس قائم کرنے والوں نے آٹھ آٹھ دس دس سالوں کے نصاب یوں ہی نہیں بنائے۔ عربی سے معتد بہ آگاہی اگرچہ مدارس کی اسناد ہی حاصل کرنے پر منحصر نہیں ہے لیکن بہرحال میں ضروری ہے کہ آدمی کافی وقت دے کر اس کی صرف و نحو کو سمجھے پھر ایک خاص ترتیب سے آگے بڑھے۔ تب ایک مدت

بعد وہ اس لائق ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اس زبان سے واقف خیال کر سکے معمولی سی شُدہ بُدہ لیکر کسی لائبریری میں پہنچنا اور قدیم عربی کتابوں سے اپنے حسب مطلب فقرے اُٹھا کر شاملِ تصنیف کر دینا دو ہی باتوں پر دلالت کرتا ہے ــــ یا تو نیت میں فساد ہے۔ جان بوجھ کر قارئین کو یہ تأثر دیا جا رہا ہے کہ ہم علم و فضل میں کسی سے پیچھے نہیں۔ یا پھر یہ شخص اسی خود فریبی میں مبتلا ہے جس کا تذکرہ خاں صاحب کے مذکورہ اقتباس میں ہے۔ موصوف نظر انداز کر گئے کہ جن ذہنی کثافتوں اور نفسیاتی خامیوں کے انبار انھیں فریقِ ثانی میں نظر آ رہے ہیں ان سے وہ خود بھی خالی نہیں۔ ثبوت ہم نے سامنے رکھدیا۔ عربی سیکھنے کے سلسلے میں اپنی کوشش کا طول و عرض جاننے کے باوجود وہ اگر یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ابن جریرؒ روح المعانی اور البحر المحیط جیسی تفسیروں کی عبارتیں مَیں خوب خوب سمجھ سکتا ہوں حتٰکہ ترجمے کے سلسلے میں کسی اہلِ علم سے مشورے تک کی ضرورت نہیں تو خود فریبی اور احساسِ برتری اس کے سوا کس چیز کا نام ہوگا۔

پھر پوری کتاب پڑھ کر یہ اندازہ کیجئے کہ لب ولہجہ اور پرداز موصوف نے کس قسم کا اختیار فرمایا ہے۔ یہ درست ہے کہ عربی جانے بغیر بھی کسی شخص کی ذہانت کسی مسئلہ میں عربی جاننے والوں پر سبقت لے جا سکتی ہے اور ہم یہ ہرگز نہیں کہتے کہ وہ جو اعتراض مولانا مودودی پر کریں گے وہ اس لئے لازماً غلط ہوگا کہ انھیں عربی نہیں آتی لیکن دیکھنا طرزِ گفتگو کا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ خاں صاحب دسیوں سال جماعت اسلامی میں رہے ہیں ــــ وہی جماعت اسلامی جس کے مؤسس اور فکری قائد مولانا مودودی ہیں۔ انھوں نے شدومد سے جماعت کے فکر کی تائید و تصویب کی ہے۔ مقالے اور کتابچے لکھے ہیں۔ جماعت کی رکنیت اور ملازمت دونوں ہی سے منسلک رہے ہیں۔ اب اگر اتنے سالوں مولٰنا مودودی کی دعوتِ دین کو برحق سمجھتے رہنے کے بعد ان کے علم و فہم نے یہ احساس دلایا تھا کہ یہ دعوت برحق نہیں باطل ہے تو اس احساس کا اظہار انھیں اس انداز میں نہیں کرنا چاہئے تھا کہ جیسے ان پر اچانک وحی نازل ہوگئی ہو۔ ایک شخص اپنی ذہانت اور قابلیت کے باوجود اگر سالہا سال تک فریب میں مبتلا رہ سکتا ہے تو کیا ضمانت ہے کہ آئندہ وہ کبھی فریب کا شکار نہ ہوگا۔ خانصاحب کو یہ لحاظ ضرور رکھنا چاہیئے تھا کہ میں اتنی طویل مدت تک جس فکر اور دعوت کو تہہِ دل سے عین حق سمجھتا رہا ہوں آج مجھے اس کے باطل ہونے کا ادراک ہو رہا ہے تو عین ممکن ہے کہ اب جو فکر مجھے برحق نظر آنے لگا ہے وہ بھی اسی طرح باطل ہو جس طرح پہلا فکر باطل تھا۔ یہ لحاظ رکھتے تو مولانا مودودی کے فکر پر تنقید کا انداز جدا ہوتا۔ آپ پوری کتاب پڑھ جائیے کسی ایک جگہ بھی یہ نہیں ملے گا کہ مولانا مودودی کے استدلال کو لغو و باطل قرار دینے کے بعد اپنے خیالات کو سپردِ قلم کرتے ہوئے خانصاحب نے ایسا کوئی فقرہ لکھا ہو کہ:۔

"میں ایسا خیال کرتا ہوں ــــ میرے علم کی حد تک بات یوں ہے ــــ میں ایسا سمجھتا ہوں"

یہ رسمی فقرے ذہن کی شائستگی کے علاوہ اس بات کے بھی آئینہ دار ہوا کرتے ہیں کہ لکھنے والا جذباتی اشتعال میں مبتلا نہیں ہے اور یہ نہیں بھولا ہے کہ میں بھی ایک بشر ہی ہوں جس کی رائے کم علمی یا کم فہمی کے باعث غلط یا کمزور بھی ہو سکتی ہے۔

مگر خانصاحب کی "خود اعتمادی" پوری کتاب میں اس شان سے جلوہ گر ہے کہ جیسے ہر وہ بات جو ان کی زبان سے نکل رہی ہے پیغمبرانہ قطعیت کی حامل ہے اور جس شخص کو وہ ہدفِ تنقید بنا رہے ہیں اس کا ضال و مضل ہونا آسمانی فیصلے کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ یہ وہ شخص بول رہا ہے جس کے فکر و نظر اور علم و خبر نے ایک دو دن نہیں، سال دو سال بھی نہیں دسیوں سالوں تک فریب کھایا ہے جس کی بینائی اتنی طویل مدّت تک اُس شے کو سفید دیکھتی رہی ہے جسے آج وہ سیاہ کہہ رہا ہے۔ کم سے کم جو بات خاں صاحب کے لب و لہجے اور اسٹائل کے بارے میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کتاب کو لکھتے وقت وہ اپنے آپ کو مولانا مودودی سے اونچا مفکر اور صاحبِ علم گمان کرتے

رہے ہیں - یہ گمان چاہے شعوری نہ ہو لیکن ان کے تحت الشعور میں یقیناً جا گزیں رہا ہے۔

نفسِ مسئلہ

اس پوری کتاب میں تنقید کے رُخ پر خانصاحب نے جو کچھ کہا ہے وہ خود ان کے الفاظ میں یہ ہے :-

"پوری تنقید کا خلاصہ یہی ہے کہ جو چیزیں بعد از ایمان مختلف پہلوؤں سے دین میں شامل ہوتی ہیں ان کو اس کتاب میں (یعنی مولانا مودودی کی جس کتاب "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" پر خانصاحب تبصرہ کر رہے ہیں) "اصل دعوتِ رسالت کی حیثیت سے پیش کر دیا گیا ہے۔" ص ۲۹

اس دعوے کو خاں صاحب نے جس نوع کے علم کلام سے ثابت کرنا چاہا ہے وہ اس انداز کا ہے کہ مثلاً مولانا مودودی قرآن میں نازل شدہ لفظ اِلٰہ کے مصداق و مفہوم میں کامل اقتدار و اختیار کو بھی شامل کرتے ہیں تو خانصاحب معترض ہوتے ہیں کہ :-

"مگر ان تمام آیتوں میں اِلٰہ کے ساتھ اقتدار و اختیار کا ذکر خدا کے اِلٰہ صحیح ہونے کے لئے بطور دلیل آیا ہے نہ کہ یہ بتانے کے لئے کہ اُلوہیت اور اقتدار اپنی روح و معنی کے اعتبار سے ایک ہیں" (ص ۲۲۴)

اسی طرح دوسرے الفاظ مثلاً "رب" اور "عبد" وغیرہ کے سلسلے میں انھیں اعتراض ہے کہ مولانا مودودی ان کے مفہوم میں ایسے معانی شامل کرتے ہیں جو اگرچہ تقاضے کی حیثیت سے شامل تو ہیں مگر ان الفاظ کے لغوی اور وضعی مفہوم کا جزء نہیں۔

خلاصہ اس علم کلام کا یہ دعویٰ ہے کہ قرآن میں جو بھی الفاظ آئے ہیں ان کی اصل مراد اور مدعا صرف وہ معانی ہیں جو لغتہً ان سے ثابت ہوں۔ نہ کہ وہ معانی جو بطور تقاضا یا بطور نتیجہ نکلتے ہوں۔ مولانا مودودی کا قصور یہ ہے کہ انھوں نے وضعی مفہوم کو مقدم رکھنے کے عوض اس چیز کو مقدم رکھا جو مفہوم سے خارج تو نہیں تھی مگر اس کی حیثیت اصل وضعی مفہوم کی بھی نہیں تھی۔ یہ قصور اس درجہ ہولناک تھا کہ سارا دین ہی اس سے اُلٹ گیا اور مولانا مودودی اس درجے میں پہنچ گئے کہ ضال و مضل اور محرّفِ دین سے کم انھیں کچھ نہ کہا جا سکے۔

یہ دعویٰ ساری کتاب میں پیرائے اور الفاظ بدل بدل کر مسلسل دہرایا جاتا رہا ہے لیکن آیئے ہم چند مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کریں کہ اس کا وزن کیا ہے۔

فرض کیجئے راستے میں دو بچے لڑ رہے ہیں۔ ایک نے دوسرے کو گالی دی۔ آپ ادھر سے گذر رہے تھے۔ آپ نے فرمایا "نہیں بیٹے۔ گالی نہیں دیا کرتے۔"

دیکھنے کی بات یہ ہے کہ لفظ "بیٹا" لغت اور وضع کے اعتبار سے کیا مصداق رکھتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ یہ لفظ ایک معیّن رشتے کو ظاہر کرنے کے لئے وضع ہوا ہے محبت اور پرورش وغیرہ اس کے تقاضے تو ہیں وضعی مفاہیم نہیں۔ اب جس بچے کو آپ نے "بیٹے" کہہ کر خطاب کیا کیا وہ واقعی آپ کا بیٹا تھا؟ ___

ظاہر ہے کہ وہ بیٹا نہیں تھا لیکن یہ لفظ آپکی زبان سے اس لئے نکلا کہ گالی دینے پر سرزنش اسے آپ محبت اور بہی خواہی کے جذبے سے کر رہے تھے اور خود اسے بھی یہی تاثر دینا چاہتے تھے کہ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں ہمدرد اور مشفق ہیں۔

کیا اس روزمرہ کی مثال سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ بعض الفاظ اس طرح بھی استعمال کئے جاتے ہیں کہ وہاں ان کا لغوی مفہوم سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا بلکہ بولنے والا انھیں صرف اُس مفہوم کی خاطر بولتا ہے جو لغوی مفہوم کا محض تقاضا ہے۔

اسی مثال کو ذرا بدل کر یوں دیکھئے کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو جب بیٹا کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ جیسے یوں کہتا ہے کہ :-

"بیٹے فلاں جگہ ضرور ہو آنا" ـــــ "بیٹے فلاں کام مت کرنا"۔ وغیرہ

تو اگرچہ یہاں لفظ "بیٹے" کا لغوی مفہوم بصورتِ واقعہ موجود ہے، لیکن سچ کہئے کیا اس لفظ کو بطورِ خطاب استعمال کرتے وقت باپ کا اصل مقصد یہ یاد دلانا ہوتا ہے کہ تم میرے ہی نطفے سے ہو اور تمھاری ماں میری ہی زوجہ ہے ؟ ـــــ

ایسا جو شخص کہے آپ اسے احمق کہیں گے۔ اکثر و بیشتر ایک باپ کے ذہن میں اس لفظ کو استعمال کرتے وقت اس کے وضعی و لغوی معنی کا کوئی ہلکا سا تصور بھی نہیں ہوتا بلکہ اس لفظ کے زبان پر آنے کا محرک وہ متقاضی اور غیر وضعی مفہوم ہوتا ہے جسے شفقت و محبت کہتے ہیں۔

ٹھیک اسی طرح قرآن میں جو بھی لفظ کسی جگہ آیا ہے اس کے بارے میں یہ مطالبہ درست نہیں کہ اسکی ترجمانی اور تفسیر میں تقدم اور بنیادی اہمیت صرف اور صرف اُسی مفہوم کو دو جو اس کا لغوی مفہوم ہے۔ اگر تقاضوں کو اصل مفہوم بنا دیا یا اصل مفہوم کی فہرست میں رکھ دیا تو قرآن کی تحریف ہو جائے گی۔

آپ "تعبیر کی غلطی" اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں بال کی کھال نکالنے میں تو خاں صاحب نے بڑی شاندار ذہانت صرف کی اور ژرف نگاہی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے لیکن یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی ذہین اور قابل یورپین تھوڑی سی اُردو سیکھ لینے کے بعد اُردو کے کسی ایسے شعر پر دادِ تحقیق دینے لگے جس میں کوئی محاورہ استعمال ہوا ہو۔ محاورات کا تعلق منطق اور لغت سے نہیں ہوا کرتا۔ جو شخص کسی محاورے کے صحیح استعمال اور مصداق کو نہیں جانے گا وہ ارسطو اور افلاطون کے علم و فہم بھی اٹھالائے تو یا محاورہ زبان کا حق تنقید ادا نہیں کر سکتا بلکہ جتنی جتنی وہ دماغ سوزی کرے گا اتنا ہی اتنا مضحکہ خیز بنتا جائیگا ایسا ہی منظر جگہ جگہ اس کتاب میں نظر آتا ہے

خانصاحب زبان و بیان کی نزاکتوں سے نابلد نہیں ہیں لیکن مودودی فکر کے رد میں انھوں نے اپنے سارے قوائے فکری کو اس قدر یکسو اور مرتکز کر لیا کہ جن اسالیب زبان سے وہ عام حالات میں باخبر تھے وہ بھی دماغ کے کسی تاریک کونے میں پڑے رہ گئے اور یہ پہاڑ جیسی غلط فہمی انھیں عین حق نظر آئی کہ آیت قرآنی کے بعض الفاظ کی تشریح میں مولانا مودودی نے جو بعض تقاضوں کو اصل مفہوم میں شامل کر دیا ہے یہ علمی اور اصولی حیثیت سے غلط ہے۔

دوسری مثال

اللہ کے رسول ﷺ نے ایک بار کچھ صحابہؓ کو ایک بستی کی طرف رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ عصر کی نماز وہاں پڑھنا۔ بستی اتنے فاصلے پر تھی کہ اگر یہ صحابہؓ تیز رفتاری کے ساتھ نہ چلیں تو مغرب سے قبل وہاں پہنچنا دشوار ہو۔ اب یہ صحابہ چلتے ہیں لیکن باوجود تیز رفتاری کے سورج اس بستی میں داخلے سے قبل ہی غروب ہونے لگتا ہے۔ اس وقت کچھ صحابہ تو نماز عصر پڑھ لیتے ہیں اور کچھ نہیں پڑھتے۔

واپسی پر جب حضورؐ کے آگے یہ واقعہ بیان ہوتا ہے تو آپ دونوں میں سے کسی کی تغلیط نہیں فرماتے۔ گویا جنھوں نے نماز پڑھ لی تھی ان کے طرزِ عمل کو بھی درست مانا اور جنھوں نے نہیں پڑھی تھی انھیں بھی خطا کار قرار نہیں دیا۔

اب غور فرمائیے۔ حضورؐ نے فلاں بستی میں عصر پڑھنے کا جو حکم دیا تھا وہ صاف و صریح تھا اس کا وضعی، لغوی اور حقیقی مفہوم ذرا بھی مبہم نہیں۔ البتہ اس کا مقتضیٰ اور مجازی مفہوم یہ بھی تھا کہ تیز رفتاری سے جاؤ۔ سستی مت کرو۔ کہیں ٹھیرو نہیں۔

جن صحابہ نے بستی میں داخلے سے قبل ہی نماز پڑھ لی ان کا نقطہ یہ تھا کہ حضورؐ کے فرمان کا اصل مدعا وہ نہیں تھا جو الفاظ سے صراحتاً معلوم ہو رہا ہے بلکہ مدعا صرف یہ تھا کہ تیز رفتاری سے جاؤ۔ اب ہم اگر تیز رفتاری سے چلنے کے باوجود مغرب سے قبل اس بستی میں نہ پہنچ سکے تو ہمیں نمازِ عصر

پڑھ لینی چاہئیے۔ اس سے حضورؐ کے حکم کی نافرمانی نہیں ہو گی۔ ہم نے تعمیل حکم کر دی ہے۔

اکثر شارحین حدیث نے رائے زنی کی ہے کہ اگرچہ تصوروار وہ صحابہ بھی نہیں ٹھیرائے جا سکتے جنھوں نے حضورؐ کے منطوقِ کلام اور ظاہر الفاظ کی تکریم کرتے ہوئے اس بستی سے پہلے نمازِ عصر پڑھنی پسند نہ کی بلکہ اس کا قضا کرنا گوارا کر لیا لیکن تفقّہ کے اعتبار سے طرزِ عمل دوسری ہی جماعت کا اوفق اور اولیٰ تھا جس نے نماز ادا کر لی۔

اگر ہم ان شارحین کا تتبع کریں تب تو ثمرہ یہ نکلتا ہے کہ بعض مواقع پر منطوقِ کلام اور الفاظ کے حقیقی ووضعی مفہوم کو چھوڑ کر محض تقاضائے کلام کو اصل مان لینا زیادہ فقیہانہ طریق ہے اور تتبع نہ کریں تب بھی یہ تو ثابت ہوتا ہی ہے کہ تقاضائے کلام کو اصل مان لینا خطا اور گناہ ہرگز نہیں ہے۔

پھر اگر مولانا مودودی بعض الفاظِ قرآنی میں لغوی اور حقیقی مفہوم کے عوض مجازی اور متقاضی مفہوم کو بنائے استدلال بناتے ہیں تو اسے نہ صرف خطا بلکہ عظیم خطا اور تحریف و تضلیل قرار دینا آخر کہاں کا انصاف ہے۔

تشدد اور ظلم

مولانا مودودی ایک انسان ہی ہیں۔ غلطیاں ان سے ہو سکتی ہیں لیکن ان غلطیوں کی گرفت میں انصاف اور توازن ضروری ہے۔ ہم بعض مقامات پر تو بڑا ہی تشدد دیکھتے ہیں مثلاً مولانا مودودی سورۃ الصّافات کی آیات (۲۲ تا ۳۲) کی تفسیر میں ایک ایسی رائے اختیار کرتے ہیں جو عام طور پر اختیار نہیں کی گئی۔ قارئین اس بحث کو سمجھنا چاہیں تو قرآن کھول کر آیاتِ مذکورہ پر نظر ڈالیں۔ مولانا مودودی کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں جس گفتگو کا ذکر کیا ہے وہ عابدوں اور معبودوں کے درمیان ہو رہی ہے۔

خاں صاحب کہتے ہیں کہ یہ غلط ہے۔ گفتگو کافروں اور ان کے لیڈروں کے مابین ہو رہی ہے۔ اس تغلیط کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:-

"یہی مفہوم تمام مفسرین نے لیا ہے۔"

اس ارشاد کا حاصل عام قارئین یہی تو سمجھیں گے کہ مولانا مودودی نے ایک ایسی تفسیر کی جو تمام ہی مفسرین کی رائے کے خلاف ہے۔ خصوصاً جب اس ارشاد کے متصل بعد خاں صاحب ابن کثیر اور روح المعانی کا حوالہ بھی دیتے ہیں تو سمجھا جائیگا کہ یہ دعویٰ خود خاں صاحب کا نہیں بلکہ ان دونوں شہرۂ آفاق تفاسیر میں یہی کہا گیا ہے کہ:-

"تمام مفسرین یہی مفہوم لیتے ہیں"

مگر امرِ واقعہ کیا ہے یہ بھی سن لیجئے۔ قدماء میں امام رازیؒ کی "تفسیر کبیر" مشہور ترین تفسیر ہے اور خاں صاحب بھی کئی جگہ اس کے حوالے دیئے ہیں۔ اس میں مذکورہ آیات کی جو تفسیر موجود ہے وہی اس بات کے لئے کافی تھی کہ خاں صاحب اگر دیانت اور عدل برتتے تو نقشہ وہ نہ کھینچتے جو بحالتِ موجودہ ان کی کتاب میں نظر آرہا ہے۔

ملاحظہ ہو۔ امام رازیؒ "القول الثانی" کا عنوان دے کر فرماتے ہیں:-

ان المراد من قوله وما کانوا یعبدون من دون اللہ الشیاطین الذین دعوھم الی عبادۃ ما عبدوہ فلما قبلوا منھم ذلک الذین صاروا کالعابدین اولئک الشیاطین وتأکد ھذا بقولہ تعالیٰ اَلَمْ اَعْھَدْ اِلَیْکُمْ یَا بَنِیْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّیْطٰنَ۔	اللہ کے ارشاد وَمَا کَانُوْا یَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ سے مراد وہ شیاطین ہیں جو لوگوں کو ان باطل معبودوں کی عبادت کرنے کی دعوت دیتے تھے جن کے وہ خود پجاری تھے۔ پس جب لوگوں نے ان کی دعوت قبول کر لی تو گویا وہ انھیں شیاطین کے پجاری ہو گئے ـــ اور اسی مفہوم کی تاکید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے کہ "اے بنی آدم! کیا میں نے تم کو تاکید نہیں کر دی تھی کہ شیطان کی عبادت مت کرنا۔"
* * * *	(کبیر)

یہ بجا ہے کہ امام رازیؒ نے اس قولِ ثانی کو راجح اور اولیٰ نہیں مانا ہے لیکن یہ تو بہر حال آپ کے سامنے ہے کہ یہ قول

بھی بعض اہل علم نے کیا ہے اور امام رازیؒ اسے قابل لحاظ تصور فرماتے ہیں۔ یہ قول اختیار کرنے ہی کے نتیجے میں مولانا مودودی نے یہ فرمایا ہے کہ گفتگو عابدوں اور معبودوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ خانصاحب اگر یہ کہتے ہیں کہ عام لوگوں کو کفر پر آمادہ کرنے والے لیڈر خود معبود نہیں تھے بلکہ وہ بھی کسی دوسرے اِلٰہ کو پوجتے تھے تو اصلاً یہ درست ہے لیکن مولانا مودودی نے اس کا انکار کب کیا۔ وہ اتنے نادان کیسے ہو سکتے ہیں کہ گفتگو کا ایک فریق پتھر کے بتوں کو قرار دے لیتے۔ انھیں بھی معلوم ہے کہ یہ لیڈر اور پیشوا جنھوں نے عوام کو اپنے دامِ تقدس میں پھنسایا بجائے خود بُت اور اصطلاحی معبود نہیں تھے، لیکن جیسا کہ امام رازیؒ کی عبارت سے ظاہر ہے جو لوگ کسی گمراہ کرنے والے پیشوا کی اندھا دھند تقلید و تعمیل کرنے لگتے ہیں وہ گویا اس کے عابد بن جاتے ہیں اور وہ معبود قرار پا جاتا ہے۔

ترمذی کی اُس حدیث سے بھی یہ مضمون ثابت ہے جس میں حضورؐ نے نصاریٰ پر لعنت کی تھی کہ انھوں نے اپنے پیشواؤں اور شیوخ کو معبود بنا لیا اور اس پر ایک صحابی نے، جو پہلے نصرانی تھے جب یہ عرض کیا تھا کہ حضور! ایسا ہوتا تو میرے علم میں نہیں تو حضورؐ نے فرمایا تھا کہ یہ معبود بنا لینا ہی ہے کہ جس چیز کو یہ پیشوا حرام کہیں اسے حرام مان لیا جائے اور جسے حلال کہیں اسے حلال۔

جب حدیث سے بھی ان لیڈروں اور پیشواؤں کو معبودوں کی حیثیت دینا درست ثابت ہوتا ہے جو بجائے خود اِلٰہ نہیں تھے بلکہ دوسرے باطل خداؤں کی طرف لوگوں کو بلاتے تھے تو اعتراض کیسا؟ — زیادہ سے زیادہ نزاع صرف الفاظ کا رہ گیا۔ مفہوم مولانا مودودی کا بھی ٹھیک وہی ہے جو خانصاحب کا ہے۔ وہ بھی کہہ ہی رہے ہیں کہ گفتگو عام کافروں اور ان کے لیڈروں کے مابین ہے ——— ان لیڈروں کو آج کی زبان میں پیشوا، لیڈر، ائمہ، پیر، سجادے، جو چاہے کہہ لیجئے۔ مولانا مودودی نے انھیں "معبود" کہہ دیا ہے اور ساتھ ہی تصریح بھی کر دی ہے کہ "معبود" سے مراد گمراہ کرنے والے پیشوا اور رہنما ہیں۔

امام رازی کی مذکورہ عبارت اور ترمذی کی حدیث کے بعد کوئی ریب اس بات میں نہیں رہتا کہ انھیں معبود کہہ دینا نہ جرم ہے نہ تحریف۔ خود اللہ کے رسولؐ نے یہی کہا، فرمایا اور اسی مجازی تعبیر کو اختیار کیا تو کس میں جرأت ہے کہ آپ پر انگلی اُٹھا سکے۔ یہ بڑا ہی ظلم ہے کہ فقط الفاظ اور اندازِ تعبیر کے فرق کو مستقل الزام بنا کر یہ تاثر دیا جائے کہ مولانا مودودی سارے مفسرین سے ہٹ کر اپنی الگ تفسیر رکھتے ہیں ——— درانحالیکہ الفاظ اور تعبیر کی حد تک بھی یہ دعویٰ غلط ہے۔

زیادتی کی ایک مثال یہ ہے کہ جب مولانا مودودی نے فرمایا:-

"عبادت کا لفظ عبد سے نکلا ہے۔ عبد کے معنی بندے اور غلام کے ہیں اس لئے عبادت کے معنی بندگی اور غلامی کے ہوئے۔"

تو خانصاحب کہتے ہیں کہ:-

"عبادت کا لفظ عبد سے نہیں نکلا ہے بلکہ اسکے برعکس عبد کا لفظ عبادت سے ماخوذ ہے" ص۳۶

خاں صاحب تردید نہایت قطعیت کیساتھ کرتے ہیں مگر دلیل کوئی نہیں دیتے۔ ہم تو کتبِ لغات میں نہیں پاتے کہ "عبادۃ" کو بطور مادّہ اور "عبد" کو بطور مشتق لکھا گیا ہو۔ لغت نویسی کا یہ معروف قاعدہ ہے کہ جن الفاظ میں تصریف کی اور فعل بننے کی گنجائش ہوتی ہے ان کا مادّہ ہی زیر ترتیب لایا جاتا ہے پھر اس کے مشتقات بیان ہوتے ہیں۔ المنجد دنیا کی مشہور ترین لغت ہے۔ اس میں دیکھ لیجئے عبد کا لفظ بطور اصل نظر آئے گا اور عبادۃ بطور فرع۔ خانصاحب اگر اصل "المنجد" ملاحظہ فرمائیں تو یہ بھی دیکھیں گے کہ لفظ عبد جب باب نصر ینصر سے آتا ہے تو جہاں اس کا مصدر عبادت بنتا ہے

وہیں عبودۃ اور عبودیۃ بھی بنتا ہے اور پھر ان دونوں ہی الفاظ کے معنی صاحبِ المنجد نے الطّاعۃ اور الاسترقاق للاسیاد (آقاؤں کی غلامی) لکھے ہیں۔ کیا پھر بھی یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ اطاعت اور فرماں برداری عبادت کے اصل مفہوم میں شامل نہیں۔

قرآن میں لَا تَعْبُدُوا الشَّیْطَانَ کا حکم دیا گیا ہے یعنی شیطان کی عبادت مت کرو۔ کیا یہاں عبادت کے معنی پیروی اور اطاعت کے سوا بھی کچھ ہیں؟ اسی طرح کہا گیا ہے کہ:۔

أَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ۔ — اے پیغمبر! کیا تو نے اس شخص کی حالت دیکھی جس نے خواہشِ نفسانی کو اپنا اِلٰہ بنا رکھا ہے

❊ ❊ ❊ ❊

کیا یہ آیت بھی صریح طور پر یہ نہیں بتاتی کہ الٰہ بنالینا اطاعت اور پیروی کرنے کے ہم معنی ہے نہ کہ پوجنے کے۔ خاں صاحب کہتے ہیں کہ:۔

"عبادت کا اصل مفہوم خضوع اور تذلیل ہے"

پھر وہ کہتے ہیں کہ:۔

"خضوع اور تذلل (انسان کے اعتبار سے) قلبی جھکاؤ اور اندرونی احساسِ عجز کا نام ہے۔ یہی عبادت کی اصل ہے جب یہ کیفیت کسی کے اندر پیدا ہو جاتی ہے تو اسکا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے معبودوں کا تابع فرمان بن جاتا ہے وہ اس کی اطاعت کرنے لگتا ہے۔"

مگر دونوں آیتیں آپ کے سامنے ہیں۔ بتایا جائے کہ جو لوگ زنا، شراب خوری، ترکِ صلوٰۃ وغیرہ کبائر کے مرتکب ہوتے ہیں کیا وہ سچ مچ شیطان یا اپنی خواہشات کی عظمت اور ان کے مقابلے میں اپنے عجز کا احساس رکھتے ہیں؟ — ظاہر ہے کہ نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ بد سے بدتر گناہ کرنے والے بھی عموماً خدا ہی کو معظم جانتے اور مانتے ہیں۔ شیطان اور اپنی خواہشات کے بارے میں احساسِ عظمت و رفعت کا شائبہ تک ان کے اندر نہیں ہوتا مگر پھر بھی وہ گناہ کئے جاتے ہیں اور ان کے اس کردار کو اللہ یہی معنی دیتا ہے کہ انھوں نے خواہشات کو اپنا معبود بنالیا ہے اور شیطان کی عبادت میں لگے ہوئے ہیں۔

معلوم ہوا کہ خاں صاحب کی منطق غلط در غلط ہے، نہ تو یہ ضروری ہے کہ شیطان اور خواہشات کی غلامی آدمی اسی وقت کرے جب وہ اندرونی طور پر ان کی عظمت تسلیم کرلے۔ نہ یہ ضروری ہے کہ جس وقت ایک شخص بالفاظ قرآنی "عبادتِ شیطان" اور "عبادتِ ہوا" میں مصروف ہو اس وقت اس کے قلب میں اللہ کی عظمت و کبریائی پر ایمان کا سایہ تک موجود نہ ہو۔ یہ تو خوارج کا طرزِ فکر ہے۔ آدمی بسا اوقات اطاعت کسی اور کی کر رہا ہوتا ہے اور ایمان کسی اور کے واجب الاطاعت ہونے پر رکھتا ہے۔ اسی دوغلے کردار پر نکیر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ شیطان کی عبادت سے دور رہو اور خواہشات کو خدا مت بنالو۔ مولانا مودودی بھی یہی زور دیتے ہیں کہ ایمان اور قلبی جھکاؤ کو اعمال میں ظاہر ہونا چاہئے اسی اظہار کا نام "اطاعت" ہے۔ یہ آیات صاف طور پر بتا رہی ہیں کہ خضوع اور تذلّل اور قلبی جھکاؤ معتبر ہی اس وقت ہوگا جب یہ اطاعت کا جامہ پہنے لہٰذا اطاعت فقط ایک تقاضا اور ثمرہ ہی نہیں ہوئی بلکہ ایک ایسا مظہر ہوئی جس کے بغیر "عبادۃ" کے کسی مفہوم کی تشکیل ہی ممکن نہیں اب یہ بھی دیکھ لیا جائے کہ دلوں کے احوال تو سوائے خدا کے کوئی نہیں جان سکتا۔ انسان صرف اسوۂ و کردار کو دیکھ سکتا ہے لہٰذا جو لوگ بھی بگڑے ہوئے انسانوں کی اصلاح اور دنیائے ظاہر میں دین کی اقامت کا داعیہ لیکر اٹھیں گے انھیں لازماً خدا کی اطاعت پر ہی زور دینا ہوگا اور اندر کی مخفی کیفیتوں سے زیادہ اطاعت کی ظاہری اشکال پر نظر رکھنی ہوگی۔ اس کا یہ منشا نہ ہوگا کہ اندرونی کیفیات ان کی نظر میں کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتیں بلکہ منشا یہ ہوگا کہ اطاعت ہر حال میں ضروری ہے۔ اطاعت سے گریز کے لئے یہ عذر مقبول نہیں کہ ابھی ہمارے اندر دینی

کیفیتِ خضوع و تذلل پیدا نہیں ہوئی جب ہو جائے گی تو اطاعت بھی کرلیں گے۔ اطاعت لازماً کرنی ہے چاہے قلب ابھی پورے طور پر راغب و مائل ہوا یا نہ ہو۔ اطاعت پر ثابت قدم رہو گے تو قلب بھی رفتہ رفتہ میلان و رغبت قبول کرے گا اور نفور و گریز کی کیفیت کم ہوتی جائے گی۔

رہبانی تصورِ دین

خاں صاحب نے مولانا مودودی کے تصورِ دین کا ابطال کرنے کے بعد اپنا جو تصورِ دین پیش کیا ہے وہ یک رُخا اور غیر متوازن ہے۔ قرآن و حدیث سے انھوں نے چند کلمات چُن لئے اور یہ نہیں دیکھا کہ بے شمار اور نصوص بھی ہیں جو مجموعی تصورِ دین کو اعتدال و توازن دیتی ہیں۔ کیسے غضب کی بات ہے کہ کل تک جو شخص شد و مد سے دعوتِ اقامتِ دین کا مجاہد تھا آج ایک خالصتہً رہبانی اسلام کا خاکہ کھینچکر جاہلیت کے نوک پلک سنوار رہا ہے۔ جس کا جی چاہے پڑھ کر دیکھ لے۔
خانصاحب کے تصورِ دین کے خانے میں تو نہ امام ابوحنیفہؒ کسی لائق نظر آتے ہیں نہ امام مالکؒ۔ حتیٰ کہ حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جیسے صحابہ بھی دین کے صحیح تصور سے بےخبر قرار پاتے ہیں۔ دیدنی ہے کہ امام غزالیؒ کا یہ درس تو موصوف کو بہت جچا کہ شہوات ولذّات سے پورے طور پر کنارہ کئے بغیر وصول الی اللہ ممکن نہیں ہے لیکن یہ حدیثِ رسولؐ کسی لائق نہ ٹھیری کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ اَن یریٰ اثرَ نعمتہٖ علیٰ عبدہٖ (اللہ تعالیٰ یہ بات پسند کرتا ہے کہ اپنے بندے پر اپنی عطا فرمودہ نعمت کا اثر دیکھے) ـــــ امام ابوحنیفہؒ اسی نقطۂ نظر سے بے حد قیمتی لباس پہنتے تھے، لیکن موصوف قرآن کی ایک آیت کی ترجمانی کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیا کی کسی بھی نعمت کو نعمت کی نظر سے دیکھنا مومن کے شایانِ شان نہیں۔ اس کی نعمت تو بس خدا اور اس کی جنت ہے۔

رہبانیت کے یہ زاویئے دراصل اس کا نتیجہ ہیں کہ ایک طرف خانصاحب غیر معمولی طور پر تخیل پرست ہیں اور دوسری طرف قرآن و حدیث کا مطالعہ ناقص ہے۔ کاش وہ محسوس فرماتے کہ دین میں سب سے بڑا سب سے نازک اور سب سے اہم مسئلہ توازن کا ہے۔ توسّط و اعتدال کا ہے۔ دین نہ ترکِ لذات کا نام ہے نہ لذت پرستی کا۔ کتنا ظلم ہے کہ مولنا مودودی نے اگر یہ کہدیا کہ :-

" ایک شخص اگر سکنڈ کلاس میں آرام سے سفر کرکے دوسرے دن اپنی منزل مقصود پر پہنچتے ہی اپنا کام شروع کرسکتا ہو تو وہ کیوں تھرڈ کلاس میں رات بھر کی بے آرامی مول لے اور دوسرا دن کام میں صرف کرنے کے بجائے تکان دور کرنے میں صرف کرے "

تو خانصاحب اسے دنیا طلبی اور لذت پرستی سے جوڑتے ہوئے اسلامی معیارِ زہد کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ ان کی یہ ذہنیت بدیہی طور پر رہبانی ہے۔ اس کی صحت کے لئے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں جب کہ اس کی تغلیط کے لئے اسلام سراپا احتجاج ہے۔

میں اپنی مثال پیش کرتا ہوں۔ دیوبند سے دہلی تقریباً پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔ میں اگر تھرڈ کلاس میں بیٹھوں تو بھیڑ بھاڑ اور ناخوشگوار ماحول کے باعث یہ سارا وقت بیکار جائے گا۔ میں دو لفظ بھی نہ لکھ سکوں گا۔ اللہ نے مجھے گنجائش عطا کی ہے کہ اونچی کلاس کا ٹکٹ خریدوں۔ اس نعمتِ خداوندی سے میں فائدہ اٹھاتا ہوں اور اس پورے سفر میں بہت کچھ لکھ پڑھ لیتا ہوں۔ کیا سوائے تنگ نظر راہبوں اور متقشفوں کے بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ میں نے کچھ پیسے زائد خرچ کرکے اور نرم گدیلوں پر بیٹھ کر اسلامی زہد و تقویٰ کا منھ چڑھایا ہے۔

خاں صاحب کہتے ہیں کہ :-

" خدا کے دین کا کام بہتر اور زیادہ مقدار میں انجام دینے کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے وہ دل کی تڑپ ہے اور دل کی تڑپ اسی وقت رخصت ہونے لگتی ہے جب اس کو سہولتوں کے غلاف میں لپیٹ دیا جائے " (ص ۱۳۷)

ہم کہتے ہیں کہ خالی " تڑپ " کسی مرض کا علاج نہیں

اگر انسان کے قوا بھی اس کا ساتھ نہ دے سکیں۔ ذہنی و جسمانی استعدادیں خدا کی پیدا کردہ ہیں۔ ایک شخص کا ذہن اگر گندے اور پُر شور ماحول میں ٹھیک کام کرنے کا اہل نہیں تو اسے تعیش اور تن آسانی نہیں کہیں گے کہ وہ قلم کے ذریعہ خدمت دین کرنے کی خاطر بہتر اور سازگار ماحول تلاش کرے۔ یہ پہلوؤں سے کنارہ کشی عین رہبانیت ہے جب کہ اس کا مقصد خواہ مخواہ خود کو تکلیف میں ڈالنا ہو۔ تہجد کے لئے، روزے کے لئے، اوابین اور اشراق کے لئے۔ تبلیغی سفر کے لئے آپ تکلیف اٹھائیں تو یہ معقول ہوگا۔ یہ تکلیف بجائے خود مقصد نہیں کہلائے گی لیکن یہ حماقت کہ تھرڈ میں سفر کرکے ہاتھ پیر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو اور باوجود گنجائش کے اونچی کلاس کا ٹکٹ لیکر وقت کو کام میں نہ لاؤ زہد و تقویٰ نہیں بدنصیبی اور نادانی ہے۔

آخری بات

وقت اور جگہ دونوں ہی کی قلت کے پیش نظر ہم صرف اتنا کہکر اس جزوی تبصرے کو ختم کرتے ہیں کہ خانصاحب نے مولانا مودودی کا تصور دین بھی صحیح طور پر یا تو سمجھا نہیں یا سمجھا تو ان کی تخیل پرستی اور انتہا پسندی نے اس میں حذف و اضافہ کیا۔ ایک ایسے تصور کو انھوں نے مولٰنا مودودی کی طرف منسوب کیا ہے جو اُس تصور سے خاصا مختلف ہے جسے ہم مولانا کی تحریروں سے اخذ کرتے ہیں۔ اس طرح بہت سے وہ اعتراضات بھی مولانا مودودی کے نصیب میں لکھ دیئے گئے ہیں جو ان کے اپنے تصور دین پر کسی طرح عائد ہی نہیں ہوتے۔

ضرورت پڑی تو آئندہ بھی ہم کچھ لکھیں گے، لیکن بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس معروضے کے بعد ضرورت نہیں پڑے گی۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

نوٹ

اسی پرچے میں قارئین کو مولانا صدر الدین اصلاحی کا ایک مفصل خط ملے گا اسے غور سے پڑھیے اور اندازہ لگائیے کہ خانصاحب کے متکبرانہ اور ظالمانہ رویّہ کے بالمقابل مولانا موصوف کی روش کتنی متانت، فروتنی اور انکسار کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ راقم الحروف امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابو اللیث سے بھی مفصل گفتگو کر چکا ہے۔ انھوں نے خط و کتابت کا جو فائل عاجز کو دکھایا اور واقعات کی پوری تفصیل بیان کی تو یہ تسلیم کرنے کے سوا چارہ نہ رہا کہ خانصاحب اکیلے مولٰنا صدرالدین ہی کے اقوال کے ساتھ ہی نہیں، مولٰنا ابو اللیث کے ساتھ بھی ناانصافی کی ہے اور واقعات کے خد و خال فی الحقیقت وہ نہیں ہیں جو انھوں نے دیکھے اور دکھائے ہیں ہم مولٰنا ابو اللیث سے مراسلت کا فائل لیکر واقعات کی صحیح تصویر پیش کر سکتے تھے۔ اور کر سکتے ہیں۔ لیکن موجودہ مرحلے میں اس کی ضرورت نہیں کبھی ضرورت ہوئی تو یہ بھی کر لیا جائے گا۔

ویجوز قضاء المرأة فی کل شیٔ الا فی الحدود والقصاص (ہدایہ کتاب ادب القاضی) — حدود و قصاص کے سوا ہر معاملے میں عورت کا قاضی ہونا جائز ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب منصب قضا حکومت کا سب سے بڑا منصب ہے اور یہ منصب عورت کو سپرد کیا جا سکتا ہے تو پھر اسکو حکومت کی سربراہی کا منصب کیوں نہیں دیا جا سکتا جو شخص کسی حکومت کا جج بن سکتا ہے آخر وہ اس حکومت کا صدر کیوں نہیں بن سکتا۔ آپ کہیں گے کہ میں نے پھر قیاس شروع کر دیا اسلئے آخر میں وہ خاص جزئیہ لکھ رہا ہوں، درج ذیل جزئیہ درحقیقت اس بحث کا نتیجہ ہے جو ابھی عورت کی اہلیت قضا کے بارے میں کی گئی ہے کنز الدقائق کی عبارت یہ ہے:-

وتقضی المرأة فی غیر حد وقود — عورت حد اور قصاص کے علاوہ دوسرے معاملات میں فیصلہ کریگی۔

اس متن کی شرح میں علامہ ابن نجیم نے حدیث نبوی لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأة کا بھی ذکر کیا ہے صاحب فتح القدیر کی رائے بھی پیش کی ہے اور اس کی بنیاد پر اپنے ایک فتوے کا بھی ذکر کیا ہے اور آخر میں اپنا جو فتویٰ دیا ہے وہ یہ ہے:-

واما سلطنتها فصحیحة وقد ولی مصر امرأة تسمی شجرة الدر جاریة الملک الصالح بن ایوب (بحر الرائق جلد ۷ ص۵) — اور رہی اس کی سلطنت تو وہ صحیح ہے اور مصر کی بادشاہ ایک عورت بنائی گئی جس کا نام شجرۃ الدر تھا اور جو الملک الصالح بن ایوب کی لونڈی تھی۔

عورت کی سربراہی کے جواز میں یہ ہے علامہ ابن نجیم (متوفی ۹۷۰ھ) کا صریح فتویٰ جس کی تائید میں انھوں نے شجرۃ الدر کی حکومت کا ذکر کیا ہے۔ اب دیکھئے کہ جو لوگ جماعت اسلامی پاکستان اور مولانا مودودی پر صرف اسلئے تحریف دین کا الزام لگا رہے ہیں کہ انھوں نے مخصوص حالات میں بطور استثناء عورت کی صدارت کو جائز قرار دیا ہے ان کے اس الزام کی زد کس شان سے فقہ حنفی اور ائمہ احناف پر پڑ رہی ہے اسلئے کہ صاحب بحر الرائق نے یہاں نہ اضطرار کا ذکر کیا ہے اور نہ استثناء کا۔ جب استثناء کی صورت میں جواز کا قائل نعوذ باللہ محرف دین ہے تو اضطرار و استثناء کے بغیر جواز کا فتویٰ دینے والا کیا ہوگا؟

اس مسئلے کو ایک اور پہلو سے دیکھئے۔ مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جمہوری حکومت میں عورت کی صدارت و حکومت کے جواز کا فتویٰ دیں تو وہ برحق۔ مفتی محمد شفیع صاحب جائز کہیں تو کوئی بات نہیں۔ مفتی مہدی حسن صاحب اور مولانا عبد الماجد دریابادی صاحب گنجائش نکالیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن مولانا مودودی جائز کہہ دیں تو وہ محرف دین، ہادم شریعت، ابن الوقت اور معلوم نہیں کیا کیا۔ اور مولانا مودودی پر یہ تمام الزامات دین کی حمایت کے نام پر لگائے جا رہے ہیں اگر اس تمام شور و شغب کا محرک جماعت اسلامی پاکستان اور مولانا مودودی سے بغض و نفرت کے بجائے دین کا درد ہوتا تو پھر دلائل دے کر ان تمام لوگوں کی نام بنام تردید کی جاتی جنھوں نے مخصوص حالات میں عورت کی سربراہی کو جائز قرار دیا ہے لیکن جہاں تک مجھے علم ہے مولانا مودودی کے سوا کسی کو ہدف تنقید و نشانۂ ملامت نہیں بنایا گیا۔ ایسے لوگوں نے بھی انصاف نہیں کیا جو بزرگوں کے صحبت یافتہ ہونے پر فخر کے مارے پھولے نہیں سماتے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ کم سے کم مولانا تھانوی رحمۃ اللہ کی روح اپنے معتقدوں کی اس زیادتی اور بے انصافی سے ضرور بیزار ہو رہی ہوگی اور زیادتی بھی ایسی جس کی زد براہ راست مولانا تھانویؒ پر بھی پڑ رہی ہے۔

سید احمد قادری (مدیر "زندگی")

اعلیٰ درجے کے عطریات

عطر روح چمن

نہایت دل نواز اور پُر کیف خوشبو دل و دماغ کو سرور و تسکین کا احساس دینے والی۔ کافی تیز اور دیرپا۔

- ایک تولہ کا پیکنگ۔ بارہ روپے
- چھ ماشے کا پیکنگ۔ ساڑھے چھ روپے
- تین ماشے کا پیکنگ۔ ساڑھے تین روپے
- ڈیڑھ ماشے کا پیکنگ۔ دو روپے

گلزار سینٹ

اس کی خوشبو "روحِ چمن" سے کچھ ہلکی ہے بعض طبائع ہلکی اور بھینی خوشبو پسند کرتی ہیں ان کیلئے خاص تحفہ۔

- ایک تولہ ۔ دس روپے
- چھ ماشے ۔ ساڑھے پانچ روپے
- تین ماشے ۔ تین روپے
- ڈیڑھ ماشے ۔ ڈیڑھ روپیہ

کوئی سی بھی ایک یا دو تین شیشیاں طلب فرمائیں گے تو محصول ڈاک ہر صورت میں ڈیڑھ روپیہ صرف ہوگا اگر سرمہ دُرِ نجف بھی ساتھ ہی منگائیں تب بھی محصول ڈاک یہی رہے گا۔ البتہ جو لوگ دُرِ نجف کی تین شیشیاں ایک ساتھ طلب فرماتے ہیں وہ عطر بھی ہمراہ منگائیں تو ڈاک خرچ معاف رہے گا۔

پچھلی مشتہرہ قیمتیں منسوخ سمجھیے

منگانے کا پتہ

دار الفیض رحمانی۔ دیوبند (یو۔پی)

جناب عبدالرشید صاحب
باجرہ گڑھی سیالکوٹ

ولی کون ہے؟

عام طور پر ولی کے لفظ سے اہل بدعت نے عوام کو خوب دھوکا دیا ہے اور اپنے کاروبار کو خوب خوب چمکایا ہے، حالانکہ کون نہیں جانتا کہ اہل اسلام میں ایک سے ایک بڑھ کر ولی گذرے ہیں۔ ہمارا تو یہ عقیدہ ہے کہ حضور نبی علیہ السّلام کی شریعت مطہرہ پر عمل کرتے ہوئے یقیناً ایک مسلمان ولی ہو سکتا ہے اور ہم اس کو ولی اللہ تسلیم بھی کرتے ہیں۔ مگر جو آدمی سرورِ کائنات کی شریعت مطہرہ پر عمل نہیں کرتا بلکہ الٹا شریعت کی مخالفت کرتا ہے وہ ہرگز ہرگز ولی نہیں ہو سکتا۔ اب جب یہ طے ہو گیا کہ سنت نبوی پر عمل کرتے ہوئے آدمی ولی اللہ ہو سکتا ہے تو پھر جھگڑا کس بات کا باقی رہا، جھگڑا تو دراصل کج فکر لوگوں نے من مانے تصورات کے ذریعہ پیدا کیا ہے، اہل بدعت کے نزدیک جبتک ایک ولی اللہ کو عالم الغیب اور مختارِ کل، حاضر و ناظر، غوث اکبر، اور مددگار بلکہ اولاد عطا فرمانے اور رزق دینے والا وغیرہ وغیرہ نہ تسلیم کر لیا جائے اس کے ولی ماننے کا حق ادا نہیں ہوتا۔ آپ لاکھ قسمیں کھائیں کہ ہم اولیاء اللہ کو مانتے ہیں مگر جب تک آپ ان اولیاء اللہ میں وہ اوصاف تسلیم نہ کریں جو کہ خاصۂ خداوندی ہیں، تب تک یہ لوگ کہتے ہی رہیں گے کہ یہ اولیاء اللہ کو نہیں مانتے یہ وہابی ہیں وغیر ذلک، جس طرح کہ اہل سنّت لاکھ چلائیں کہ ہم اہل بیت نبی علیہ السلام کو اپنی آنکھوں کا تارا سمجھتے ہیں مگر شیعہ حضرات ہرگز نہیں مانیں گے جب تک صحابہ کرام کو برا بھلا نہ کہا جائے۔ ان کے نزدیک اہل بیت کرام کو ماننے کا مطلب صرف یہ ہے کہ صحابہ کرام سے بغض رکھا جائے۔ اسی طرح اہل بدعت کے نزدیک جب تک بزرگانِ دین کو خدا کی جگہ نہ بٹھایا جائے یہ ہرگز تسلیم نہ کریں گے کہ بزرگانِ دین کو مانا گیا ہے حالانکہ صداقت و حقیقت جو کچھ ہے اس پر قرآن و حدیث ناطق ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ کریم نے بے شمار جگہ فرمایا ہے کہ عالم الغیب اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ — کہہ دے نہیں ہوں میں نیا رسول رسولوں
الرُّسُلِ وَمَآ اَدْرِیْ — میں سے اور نہیں جانتا میں کیا کیا جائیگا
مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ — ساتھ میرے اور ساتھ تمہارے، نہیں
اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى — پیروی کرتا میں مگر جو کچھ کہ وحی کیا جاتا
اِلَيَّ وَمَآ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ — ہے طرف میری اور نہیں ہوں میں مگر
مُّبِيْنٌ ○ — ڈرانے والا ظاہر۔

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ فرماتے ہیں :-

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ — یہ ہے خبروں غیب کی سے وحی کرتے
نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ — ہیں ہم اس کو طرف تیری اور نہیں تھا
لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ — تو پاس ان کے جس وقت وہ ڈالتے
اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ — تھے اپنی قلموں کو کہ کون ان میں کا
وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ — کفالت کرے مریم کی اور نہیں تھا تو
اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ○ ۳/۴۴ — پاس انکے جس وقت وہ جھگڑتے تھے

اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں :-

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ — ہم بیان کرتے ہیں اوپر تیرے بہت
الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ — اچھا قصہ ساتھ اس چیز کے کہ وحی
اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ — کیا ہم نے طرف تیری یہ قرآن اور
وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ — تحقیق تھا تو پہلے اس سے البتہ
لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ ○ ۱۲/۳ — بے خبروں سے۔

مزید فرمایا :-

اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ — آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں
اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ — کر سکتے، بلکہ اللہ جس کو چاہے
يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ — ہدایت کر دیتا ہے۔

وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ○ قصص۔
اور وہ جانتا ہے راہ پانے والوں کو۔

ایک اور جگہ ارشاد خداوندی ہوتا ہے:۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ○
بخشش مانگ واسطے ان کے یا نہ مانگ اگر بخشش مانگے واسطے ان کے ستر بار پس ہرگز نہ بخشے گا اللہ واسطے ان کے یہ اس واسطے ہے کہ کافر ہوئے ساتھ اللہ کے اور رسول اس کے کے۔ اور اللہ نہیں ہدایت کرتا قوم کافروں کو۔ سورۂ توبہ پ۱۵۔

ایک اور مقام پر

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ۔ سورۂ انعام پ۷
اور نزدیک اس کے ہیں کنجیاں غیب کی نہیں جانتا ان کو مگر وہ۔

قُلْ لَّا اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَا اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ج اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰى اِلَيَّ پ۔ سورۂ انعام
کہہ (اے نبی) نہیں کہتا میں تم کو کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہیں جانتا میں غیب کو اور نہیں کہتا میں تم کو میں فرشتہ ہوں سوائے اس کے نہیں کہ میں تابعدار ہوں اس کا جو وحی کیا جاتا ہے مجھ پر۔

اس کے بعد ایک جگہ اور اللہ کریم ارشاد فرماتے ہیں:۔

قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ج وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ج اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ پ۹ سورۃ الاعراف۔
کہہ (اے نبی) نہیں اختیار رکھتا میں واسطے جان اپنی کے نفع کا اور نہ ضرر کا مگر جو چاہے اللہ اور اگر ہوتا میں جانتا غیب کو البتہ بہت سے لیتا میں بھلائی سے اور نہ لگتی مجھ کو برائی نہیں میں مگر ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا واسطے اس قوم کے کہ ایمان لاتے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ پ۹ سورۂ اعراف۔
تحقیق جن کو پکارتے ہو سوائے اللہ کے۔ بندے ہیں مانند تمہاری پس پکارو تم ان کو پس چاہئے کہ جواب دیں تم کو اگر ہو تم سچے۔

قُلْ لَّا اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ط لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ط اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ○ پ۱۱ سورۂ یونس۔
کہہ نہیں اختیار رکھتا میں واسطے جان اپنی کے ضرر کا اور نہ فائدے کا مگر جو چاہے اللہ واسطے ہر امت کے وقت مقرر ہے جب آتا ہے وقت ان کا پس نہیں پیچھے رہتے ایک ساعت اور نہ آگے بڑھتے ہیں۔

ان آیات اور ان کے علاوہ دیگر آیاتِ کثیرہ مثلاً واقعہ تحریم واقعہ افک اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ملائکہ سے مکالمہ اور سورۂ بنی اسرائیل میں سرورِ کائنات سے کفارِ مکہ کا مطالبہ وغیرہ سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا عالم الغیب کوئی نہیں اور نہ ہی کسی کو کسی قسم کا کوئی اختیار ہے۔ ہاں یہ ہم مانتے ہیں کہ اولیاء اللہ سے کرامات کا ظہور ہو سکتا ہے مگر یہ بالکل غلط ہے کہ اولیاء اللہ جب چاہیں اور جو چاہیں اللہ سے کروا سکتے ہیں قرآن اس کی سخت تردید کرتا ہے، دعا کا قبول کرنا یا رد کر دینا اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔

بخوفِ طوالت ایک ہی واقعہ درج کیا جاتا ہے، سنئے۔ جب وقت کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا کافروں کے ساتھ غرق ہو گیا تو جناب نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں عرض کی، قرآن کے الفاظ میں سنئے:۔

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ ج وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ○ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ج اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ز فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ
اور پکارا نوح نے پروردگار اپنے کو پس کہا اے پروردگار میرے تحقیق بیٹا میرا اہل میرے سے ہے اور تحقیق وعدہ تیرا سچ ہے اور تو بہتر حکم کرنے والا ہے سب حکم کرنے والوں سے۔ کہا اے نوح تحقیق اس کا عمل ہے ناشائستہ پس

عِلْمٌ ط اِنِّیْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ○ پ ۱۲ سورہ ہود۔ | مت سوال کر مجھ سے اس چیز کا کہ نہیں واسطے تیرے ساتھ اسکے علم، تحقیق میں نصیحت کرتا ہوں واسطے تیرے کہ ہوجاوے جاہلوں سے

+ + + +

اس کے مقابلہ میں دوسری جگہ اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے جب فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوگیا تو اس وقت شیطان نے بھی ایک دعا کی تھی اور وہ یہ تھی:

قَالَ اَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ○ قَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ○ پ سورۃ الاعراف | کہا ڈھیل دے تو مجھ کو اس دن تک کہ قبروں سے اٹھائے جاویں۔ کہا (اللہ نے) تحقیق تو ڈھیل دئیے گیوں سے ہے۔

یعنی شیطان نے قیامت تک زندہ رہنے کے لئے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے فوراً قبول فرمالی، کیا یہ اس بات کا کھلا ثبوت نہیں کہ دعا قبول فرمانے یا رد کر دینے میں اللہ تعالیٰ کسی کے پابند نہیں ہیں، اپنی مرضی ہوئی تو اپنے ایک مخلص بندے یعنی جناب نوح علیہ السلام کی دعا رد کر دی بلکہ ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ اگر پھر کبھی تم نے مجھ سے ایسا سوال کیا جس کے متعلق تم کو علم نہیں تو تم جاہلوں میں گنے جاؤ گے۔ اور اس کے جواب میں جناب نوح علیہ السلام کو معذرت کرنی پڑی، اور جب بھی اللہ تعالیٰ ماننے پر آیا تو کس کی مان لی۔ شیطان رجیم کی۔ سو اسی طرح یہ بات بالکل غلط ہے کہ اولیاء اللہ میں سے کسی نے کبھی خود یہ بھی کہا ہے کہ ہم جب چاہیں اور جو چاہیں اللہ سے منوا سکتے ہیں اگر کہا ہو تو ہمیں بھی مطلع کیجئے۔ ہاں اگر کسی بے دین اور خلاف شرع ملنگ نے بھنگ کے نشہ میں ایسی کوئی بات کہہ دی ہو تو یہ دوسری بات ہے۔ ان کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ نہ نماز نہ روزہ، اور بن گئے ولی اللہ۔ اللہ کی پناہ۔ جہلاء بھی کیسے پھنس گئے ہیں کہ نہیں سوچتے کہ اگر ان کی نماز دل میں ہوسکتی ہے تو یہ کھانا بھی دل ہی کیوں نہیں کھالیتے، ایک ہفتہ دل ہی دل میں روٹی کھا کر دیکھیں تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔

غور سے سن لو! ہم اولیاء اللہ کے منکر نہیں ہیں بلکہ ہم اولیاء اللہ کے تابعدار ہیں مگر ہم اولیاء اللہ اس کو مانتے ہیں جو نبی علیہ السلام کے طریقہ پر چلتا ہے اور جو حضور سرور کائنات کے طریقے کے مخالف ہوں ہم ان کو اولیاء اللہ تو کیا اچھا مسلمان بھی نہیں سمجھتے۔ اللہ تعالےٰ ان کے دام سے بچائے۔ آمین!۔

تاریخ و تحقیق

کتاب	پیسہ	روپیہ
کیا ہم مسلمان ہیں؟ مجلّد	۲۵	۲
عورت کیا کچھ کر سکتی ہے؟ غیر مجلّد	۲۵	۱
ہمہ زندگی اسلامی نقطۂ نظر سے 〃	۵۰	-
تحریکِ اسلامی دوسری تحریکوں کے مقابلے میں	۱۲	۱
اسلام اور انسانی قانون	۹۴	-
اسلام اور اجتماعیت	۳۰	۱
آلاتِ جدیدہ کے شرعی احکامات	۲۵	۲
تحقیق اسم اعظم	۳۷	-
سجود الشمس (علامہ شبیر احمد عثمانیؒ)	۳۷	-
معجزہ کیا ہے؟ (مولٰنا محمد طیّب صاحب)	۵۰	۱
درویشی کیا ہے؟ (مولوی مقبول سیوہاروی)	-	۲
رحمت اللعالمینؐ خورد (دوسروں کی نظر میں)	۱۹	-
تحقیق سیّد و سادات (محمود احمد عباسی)	-	۸
تحقیق مزید بسلسلہ خلافت معاویہؓ و یزید (محمود احمد عباسی)	-	۸
اسباب زوال امت (شکیب ارسلان مصری)	-	۱
توحید نمبر (فاران کراچی)	۵۰	۴
تاریخ اسلام کے حیرت انگیز لمحات مجلّد	-	۳
تاریخ اسلام مکمل (مولٰنا اکبر شاہ) 〃		۳۶
〃 فتوح البلدان (علامہ بلاذریؒ) 〃	-	۱۵
تاریخ فیروز شاہی (شمس سراج عفیف) 〃	۲۵	۸
فلاسفۃ الاسلام (محمد لطفی جمعہ) 〃	۷۵	۸
ہزار سال پہلے 〃	۲۵	۴
سنت خیر الانامؐ 〃	۵۰	۳
تواریخ عجیب (عرف کالا پانی)	۵۰	۴
فرعون و کلیم کی داستانِ کشمکش	۴۴	-
کیا پردہ ملک کی راہ میں رکاوٹ ہے؟	۱۹	-
نظام اسلام مشاہیر اسلام کی نظر میں	۵۰	۶
کیا ہندوستان ترقی کر رہا ہے؟	۵۰	-
کیا دین قائم ہے؟	۳۱	-

کتاب	پیسہ	روپیہ
آواگون کا تحقیقی جائزہ	۷۵	۱
اوتار اور عقیدۂ رسالتؐ	۵۰	۲
نظام الملک طوسی (مولٰنا عبد الرزاق کانپوری)	-	۱۲
البرامکہ (برمکی وزراء کے سوانح اور حالات)	-	۱۲
مغلیہ دورِ حکومت مکمل از بابر تا محمد شاہ	-	۳۹
عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن اُردو (کیمبل جانسن)	-	۱۲
شاہجہاں کے ایام اسیری اور عہد اورنگ زیبؒ (ڈاکٹر برنیر)	-	۱۲
سفرنامہ ابن بطوطہ مکمل (رئیس احمد جعفری ندوی)	-	۱۵
مآثر عالم گیری (محمد ساقی مستعد خاں)	-	۱۲
آئینہ حقیقت نما (سلاطین ہند پر کئے گئے اعتراضوں کا جواب)	-	۱۲
تاریخ غرناطہ اُردو مکمل (محمد لسان الدین الخطیب)	۷۵	۲۱
〃 فاطمیینِ مصر ہر دو جلد (ڈاکٹر زاہد علی)	۵۰	۱۷
اقبال نامۂ جہاں گیری مرزا محمد خاں (معتمد خاں بخشی)	۷۵	۶
خلافت بنی اُمیّہ (مولانا فرید الوجدی)	۲۵	۱
مقدمہ ابن خلدون مکمل مجلّد	-	۱۶

مکتبہ تجلّی - دیوبند (یو، پی)

آزمائش

دیوار پر ایک ایسا نشان لگائیے جسے آپ گز بھر کے فاصلے سے دیکھ سکتے ہوں مگر سوا گز کے فاصلے سے نظر نہ آئے۔ پھر ایک ماہ پابندی سے سرمہ دُرِّ نجف استعمال کیجئے۔ انشاء اللہ آپ اسوقت اسے سوا گز کے فاصلے سے بھی دیکھ سکیں گے — بینائی کو نکھارنا دُرِّ نجف کا خصوصی وصف ہے۔

مستقل عنوان

ملا ابن العرب مکی

مسجد سے میخانے تک

یادش بخیر۔ ہمارے موجودہ وزیر داخلہ شری نندا جی نے وزارت داخلہ کا قلمدان سنبھالتے ہوئے فرمایا تھا :-

"میں دیش سے ملاوٹ دور کرکے رہوں گا اور اگر دو سال کے اندر کامیاب نہ ہوا تو اپنے منصب سے دستبردار ہو جاؤں گا۔"

پھر سنا گیا تھا کہ وہ فریادیوں کی فریاد سننے اور بالکل نقد انصاف دینے کی خاطر دربار بھی لگا رہے ہیں۔

بس ابھی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک صبح مرزا گلزار علی تشریف لائے۔ چہرے پر تشویش کے سے آثار تھے۔ کہنے لگے

"ارے بھائی ملا صاحب آج ایک زحمت دینے آیا ہوں۔"

"تشریف رکھیے ــــ پہلے یہ فرمائیے چائے پئیں گے یا کافی ؟"

"دونوں ہی پی لیتے ــــ مگر آج اپنی غرض کو آئے ہیں اس لئے کچھ نہیں پئیں گے۔"

میں نے دل ہی دل میں سجدۂ شکر ادا کیا۔ چائے تو مر مار کے پلائی بھی جا سکتی تھی مگر کافی تو میرے فرشتے بھی مہیا نہ کر سکتے۔

"خادم کیا خدمت بجا لا سکتا ہے ؟" میں نے استفسار کیا

انھوں نے چارمنار کی ڈبیا جیب سے نکال کر ایک سگریٹ جلایا پھر ریل کے انجن کی طرح دھواں نکال کر دبی آواز میں کہنے لگے :-

"بھئی ایک تعویذ چاہیئے۔"

"خیر تو ہے" میں چونکا "کیا پھر کسی قتالہ نے صبر و قرار لوٹ لیا ہے ؟"

"ارے نہیں" وہ جلدی سے بولے "اب میاں عشق عاشقی کے زمانے کہاں دھرے ہیں۔"

"اوہو ــــ تین سال میں کونسے زمانے بدل گئے۔"

"کیا یہ معمولی تبدیلی ہے کہ گیہوں اٹھارہ آنے کلو بک رہا ہے۔"

"ہم جیسے مسکینوں کے لئے یقیناً معمولی نہیں ــــ مگر آپ جیسے کانگریسیوں کے لئے ...."

"اماں چھوڑو۔ میں اس وقت قطعی سنجیدہ ہوں۔"

"پھر تو حیرت ہے کہ آپ مجھ سے تعویذ مانگ رہے ہیں حالانکہ ضلع بھر میں خواجہ حنیف شاہ کے تعویذ گنڈوں کی دھوم ہے۔"

"تعویذ تو شاہ صاحب ہی کا چاہیئے ــــ مگر تمھارے توسط سے۔"

وہ ذو معنی انداز میں مسکرائے۔

"کیوں ؟" میں نے تعجب سے پوچھا۔

"بھئی شاہ صاحب کے آستانے پر بھیڑ بھاڑ بہت رہتی ہے۔ اب کیا وہ ہر کس و ناکس کو خاصے کی چیزیں عطا فرما دیتے ہوں گے۔"

"آپ دوہرا ہدیہ دیجئے۔ عام ہدیہ شاید گیارہ روپے

پانچ آنے ہے۔"

"تم ابھی دے سکتا ہوں۔ مگر تمھارے تعلقات سنا ہے ان سے بہت پرانے ہیں۔ پچاس میں بھی کوئی تیر بہدف چیز ہتھے لگ جائے تو میں تمھارا ممنون ہوں گا۔"

"صرف پچاس" میں بڑبڑایا۔ ان کی بھویں تن گئیں

"کم تو نہیں ہیں پچاس۔ چلو دس پانچ اور سہی۔ یار تم چاہو تو مفت بھی ان سے ہتھیا سکتے ہو۔ مولوی صبغۃ اللہ کہہ رہے تھے کہ ایک زمانے میں تم اور شاہ صاحب لنگوٹیا یار رہے ہو۔"

"بے شک رہے ہیں۔ مگر یہ وہ زمانہ تھا مرزا صاحب جب شاہ صاحب فقط نبھو تھے۔ اس وقت کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ یہ نبھو کل خواجہ حنیف شاہ بنجائیگا اور اس کی ڈیوڑھی پر گدھے جھولا کریں گے۔"

انھوں نے بے یقینی کے انداز میں مجھے گھورا۔

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں ـــ آپ دس سال قبل یہاں ہوتے تو ایک خراب وخستہ سے آدمی کو کسی دکان کے تختے پر رکھشا والوں کے ساتھ تاش کھیلتا ضرور دیکھتے ـــ یہ اپنا نبھو ہی تھا ـــ"

"چلو بھئی ہوگا" وہ اُکتائے ہوئے لہجے میں بولے "ماضی میں کوئی کچھ رہا ہو دیکھنا تو حال کا ہے۔ تم یہ ہرگز نہیں کہہ سکتے کہ اب تمہارا ان سے کوئی بھی تعلق نہیں رہا"

"رہا تو ہے ـــ مگر برائے نام سا ـــ وہ بھی خواجائن کے طفیل۔"

"اخّوہ .... تو یوں کہونا" انھوں نے طویل سانس کھینچا پھر مسکرائے۔

"آپ نے غلط سمجھا ـــ خواجائن سے مراد ان کی نئی زوجہ نہیں ہیں ـــ میں پرانی کی بات کر رہا ہوں سر"

"ارے بس رہنے دو ـــ چلو میں کونسا اعتراض کر رہا ہوں ـــ مجھے تو تمھاری وساطت سے تعویذ چاہیئے۔ جب تعلقات گھریلو نہج کے ہیں تو آگے بات ہی کیا رہ گئی۔"

طنز کی کرکرے سے اب بھی ان کا لہجہ خالی نہ تھا ـــ وہ تو کہیئے اس وقت اپنا مطلب اٹک رہا تھا ورنہ وہ ان لوگوں میں ہیں جو "عورت" کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے دو وقت کے فاقے کی بھی پروا نہیں کرتے۔

"خیر آپ حرف مدعا تو زبان پر لائیں خادم کو کب کسی خدمت سے عار ہے" میں نے عرض کیا۔

انھوں نے سگریٹ کا لمبا سا کش لیکر اِدھر اُدھر دیکھا جیسے اطمینان کرلینا چاہتے ہوں کہ کوئی اور تو آس پاس نہیں ہے۔ پھر آگے کو جھک کر سرگوشی کے انداز میں کہنے لگے:-

"تمھیں تو علم ہی ہے کہ اپنا ضمیر حسن دلّی میں سرکاری ملازم ہے۔"

"جی ہاں"

"اس کی تنخواہ فقط دو سو تیس روپے ہے۔"

"ماشاء اللہ ......"

"کیا ماشاء اللہ ـــ اماں تین سو روپے تو مجھی کو بھیجدیتا ہے۔ نہ بھیجے تو اس کے آدھی درجن پلروؤں کو کہاں سے کھلاؤں۔"

"بچے یہیں ہیں؟"

"اور نہیں تو کیا ـــ اب تم خود سوچو جب تین سو یہاں بھیجدیئے تو اپنے خرچ کے لئے بھی سو ڈیڑھ سو رکھتا ہی ہوگا۔"

"جادوگر معلوم ہوتا ہے" میں نے آنکھیں پھیلا کر بطور تحسین کہا۔

"تمسخر جانے دو۔ ظاہر ہے کہ آج کل دلّی میں کوئی ڈیڑھ سو سے کم میں کیا گذارہ کرلے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ـــ مگر ریاضی کا کوئی ایسا فارمولا مجھے نہیں معلوم مرزا صاحب جس کی رو سے تین اور ڈیڑھ کی میزان فقط ڈھائی بنتی ہو۔"

وہ کھسیانے سے انداز میں ہنسے۔

"اب ایسے بھی بدھو نہیں ہو تم کہ مجھ سے حساب سیکھوگے۔"

" یقین کیجئے ــــ حساب کے معاملے میں میں سو فی صدی بدھو ہوں۔ آج تک یہی نہیں سمجھ سکا کہ یہ صفر کیا بلا ہے ــ"

" صفر یعنی زیرو " ان کے مُنہ سے رَو میں نکلا۔

" جی ہاں۔ اب دیکھئے نا دو میں سے دو گھٹائیے تو کہتے ہیں صفر بچا یعنی کچھ نہیں بچا۔ مگر جب یہی "کچھ نہیں" کسی ہندسے کے پہلو میں رکھد یجئے تو اس کی قیمت دس گنا مان لی جاتی ہے۔"

" بھئی مسخرہ پن نہ کرو ــــ میں واقعی بڑا متفکر ہوں "

" فکر کریں آپ کے دشمن ــــ چلئے مان لیا کہ آپ کے صاحبزادے تنخواہ سے دُگنا خرچ کرتے ہیں ــــ پھر؟ "

" اب خطرہ پیدا ہو گیا ہے "

" یعنی؟ "

" پڑھا تو ہو گا تم نے بھی اخبار میں۔ نئے وزیر داخلہ نندہ جی کیا کرنے جا رہے ہیں "

" ہاں وہ ملاوٹ کے خلاف جنگ کریں گے "

" صرف ملاوٹ ہی نہیں۔ انھوں نے سرکاری دفاتر سے بالائی لین دین کا بھی خاتمہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے "

" یہ بھی سننے میں آیا ہے "

اماں سننا کہاں کا۔ وہاں تو پکڑ دھکڑ بھی شروع ہو گئی ہے۔ خصوصی نگرانیاں جاری کی جا رہی ہیں ــ"

" غنیمت ہے کوئی وزیر تو ایسا نکلا جو کہنے کے ساتھ کرتا بھی ہو ــ"

" یہ تم اس لئے کہہ رہے ہو پیارے دوست کہ گھر بیٹھے نوابی کرتے ہو " انھوں نے بُرا سا منھ بنا کر کہا " کہیں سرکاری ملازم ہوتے تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا ــ"

" میری ملازمت سرکاری سے کم نہیں ہے مرزا صاحب البتہ بالائی آمدنی کا کوئی چانس نہیں۔ زہر بھی خریدنا ہو تو تنخواہ ہی میں سے خریدنا پڑے گا "

" تمھارے اخراجات ہی کیا ہیں ایک بیوی دو بچے ــ یہاں تو فوج ہے ــ"

" کیوں نہ آپ خاندانی منصوبہ بندی سینٹر سے رجوع کریں ــ"

" یہ خوش گپیاں پھر کرنا ــ آج ہی تعویذ لاکر دو۔ کل میاں ضمیر کا دستی خط آیا ہے بڑا پریشان ہے "

" کیا اتنی جلدی گرفت ہو گئی ــ"

" لاحول ولا قوۃ ــــ اماں جو منھ میں آئے کہہ دیتے ہو ــ گرفت ہو اس کے دشمنوں کی ــــ پھر بھی گھیرا گھیری تو ہو ہی رہی ہے لکھا ہے کہ سارا کام ٹھپ پڑا ہے "

" اللہ مسبب الاسباب ہے۔ میں شاہ صاحب سے آپ کو امام کو ضامن لاکر دوں گا "

" فقط امام ضامن سے کام نہ چلے گا ــــ ایسا تعویذ لاکر دو کہ ۔۔۔ بس ۔۔۔"

یہ کہتے ہوئے انھوں نے خاص انداز میں میری کمر تھپتھپائی

" ایسا ہی لیجئے۔ اپنے شاہ صاحب کے پاس وہ وہ جادو ہے کہ کوئی مائی کا لال آپ کے صاحب زادے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے گا "

" بس بس ایسی ہی چیز چاہیئے ــــ تم خود سوچو بھائی ملّا اگر خشک تنخواہ ہی سے کام چلانا پڑے تو کوئی کیسے دن جی سکتا ہے "

" ایک دن بھی نہیں ــ ویسے مجھ جیسا سور ہاڑی تو ہزار سال تک بھی جی سکتا ہے "

" تم اپنی بات بیچ میں نہ لایا کرو۔ تمھارے نصف درجن بچے ہو جائیں تب پوچھوں کہ مزاج کیسا ہے "

" کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اپنے یہاں کا تو ہر بچہ اپنا راشن ساتھ لیکر پیدا ہوتا ہے ــ"

" چلو ختم کرو ــ بتاؤ میں پھر کب آؤں "

" کل۔ اسی وقت ــ"

وہ چلے گئے تو گھر میں پہنچکر میں نے سب سے پہلے اہلیہ کی صندوقچی ٹٹول کر زرد رنگ کی پڑیا نکالی۔ پھر اسے کھولکر تعویذ لکھنے بیٹھ گیا۔

" خدا خیر کرے۔ اب کیا تعویذ گنڈے بھی چلیں گے "

ملانی نے مضحکہ اڑانے کے انداز میں کہا۔

"کیوں نہ چلیں گے۔ تم اور تمہارے بھیّا قدر نہ کریں تو یہ مطلب تو نہیں کہ باہر بھی ملا ابن العرب مکی کا کوئی قدر شناس نہیں۔"

اس نے وہ طشتری اُٹھالی جس میں رنگ گھولا گیا تھا "پہلے بتائیے کیا چکر ہے ۔۔۔"

"ارے وا۔ چکر کیا معنی تعویذ لکھ رہا ہوں ۔۔۔ لاؤ طشتری رکھدو۔"

"نہیں۔ آپ جب تک شانِ نزول نہیں بتائیں گے طشتری نہیں رکھی جائے گی۔"

"خدا کی بندی میں قرآن کی تفسیر نہیں لکھ رہا ہوں جو شانِ نزول بھی بتانی ضروری ہو ۔۔۔ طشتری رکھدو میں قطعی طور پر سنجیدہ ہوں۔"

"مرزا گلزار علی کیوں آئے تھے؟" اس نے میرے رُخ انور پر نگاہیں جماکر سوال کیا۔

"یہ بتانے آئے تھے کہ جب بیویاں شوہروں کی والد صاحب بن جائیں تو سمجھ لو قیامت دُور نہیں ہے" میں نے جھلّا کر کہا "تعویذ لکھ لینے دو اس وقت موڈ ہے۔ بعد میں سب کچھ پوچھ لینا۔"

"میں اپنی آنکھوں سے آپ کو تعویذ لکھتا نہیں دیکھ سکتی۔"

"کس نے کہا ہے کہ تم دیکھو۔ جاؤ تم ہانڈی چڑھاؤ۔"

"ہرگز بھی نہیں چڑھاؤں گی۔ خدا غارت کرے ان عقل کے اندھوں کو اتنا بھی نہیں دیکھتے کہ تعویذ کس سے لکھوانا چاہیئے۔"

"تم حد سے بڑھ رہی ہو نیک بخت ۔۔۔ میری صلاحیتوں کا اعتراف گھر میں نہ ہو تو کیا باہر بھی نہ ہوگا ۔۔۔ تمہیں تو فخر کرنا چاہیئے کہ تمہارے شوہر کو خدا نے ہرفن مولا پیدا کیا ہے۔"

"بس ایک فن آتا ہے آپ کو۔ ہر حال میں ہنسنا چاہے گھر میں جنازہ ہی کیوں نہ رکھا ہو۔ خبر بھی ہے آٹا اور شکر سب ختم ہے۔ گھی بھی چھٹانک بھر پڑا ہوا ہے ۔۔۔ ۔ ہانڈی کیا ردّ کھی چاٹی جائے گی۔"

"تو یہ تعویذ آخر کیوں لکھ رہا ہوں ۔۔۔ کبھی کبھی تو تم بالکل ٹھس ہو جاتی ہو۔ پچاس روپے میں ایک تعویذ۔"

"اسی لئے میں آپ کو ایک حرف نہیں لکھنے دوں گی۔ خالہ تجیبن کہہ رہی تھیں کہ آپا سلمٰی کو بھی آپنے کوئی تعویذ دیا تھا۔"

"یہ بھی تو وہ کہہ رہی ہوں گی کہ آپا سلمٰی پر اسی دن سے آسیبی دورہ نہیں پڑا۔ تم چاہتی ہو کہ میں خدمتِ خلق بھی نہ کیا کروں۔"

"یہ پچاس روپے میں ایک تعویذ خدمت خلق ہے؟"

"پھر کیا ہے۔ پچاس روپے کا تعویذ لیکر کسی کی سیکڑوں روپے ماہوار کی آمدنی محفوظ ہو جائے تو ۔۔۔ ۔"

"ایسے ہی جادوگر ہیں آپ ۔۔۔ اچھا قسم کھاکر بتائیے آپنے تعویذ کا فن کس سے سیکھا؟"

"صوفی ہدہد سے ۔۔۔ وہ اس فن کے امام رہے ہیں۔"

"رہے ہوں گے ۔۔۔ لیکن جب وہ مرے تو آپ شاید دو برس کے تھے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا" میں نے متحیّر ہو کر سوال کیا "تم تو بہت بعد میں دنیا میں آئی ہو ۔۔۔"

"آج میرے سر میں درد ہے۔ جلدی بتائیے یہ کس کا تعویذ لکھ رہے ہیں نہیں تو میں طشتری پھینک دوں گی۔"

"پھینک دو۔ میں خون دل سے لکھوں گا ۔۔۔ خدا جانے تم بیوی ہو یا تھانے دار۔"

آخر کار بتانا ہی پڑا کہ مرزا گلزار کیوں آئے تھے۔ وہ بھڑک اُٹھی۔

"خدا کی پھٹکار ۔۔۔ لوگ رشوت کا بھی تعویذ لیتے ہیں ۔۔۔"

"لوگ کہہ رہی ہو۔ ارے وہ تو اپنے دوست ہیں"۔

"تمہارے سب دوست ایسے ہی الابلا ہیں۔ وہ صوفی مسکین۔ وہ میر بلاقی۔ وہ ۔۔۔ ۔"

"ارے۔ زبان سنبھالو نیک بخت۔ یہ حضرات تو زمین کا نمکھن ہیں۔ یہ نہ ہوں تو آسمان اپنے پیروں پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔"

"آسمان ٹوٹ پڑے تو صبر ہی نہ آجائے — مجھے تعجب ہوتا ہے آپ کو ان لوگوں کی صحبت سے گھن نہیں آتی —"

"کمال کرتی ہو — میر بلاقی تو اکثر عطر حنا استعمال کرتے ہیں۔ صوفی مسکین تو کہیں سے "ایوننگ اِن پیرس" کا کنٹر اٹھا لائے ہیں —"

"میں مرزا اگلزار علی کے گھر جا کر ان کی بیوی سے کہہ دوں گی کہ تعویذ حنیف شاہ کا نہیں ہے میرے شوہر صاحب نے خود لکھا ہے —"

"کہا کرو — میں مرزا صاحب کو چیلنج کر دوں گا کہ اگر یہ تعویذ ناکام ہو جائے تو ہزار روپے جرمانہ ادا کر دوں گا —"

"وہ اتنے احمق نہیں ہو سکتے کہ آپ کی اطمینان دہانیوں پر اعتماد کر لیں —"

"ہونا عورت — ناقص العقل — خدا کی بندی جو شخص پیشہ ور تعویذ فروشوں سے تعویذ خریدیگا وہ احمق نہیں تو کیا عقلمند ہوگا —"

"خیر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی — آسیب اکثر پیشہ ور ہی اُتارتے ہیں۔ جادو کا توڑ بھی یہی لوگ کرتے ہیں۔ اب اگر کسی عقلمند کو ضرورت پیش آ ہی جائے تو وہ کس سے رجوع کرے گا —"

"اللہ اکبر۔ تم غصّے میں بھی باتیں خاصی باریک کر لیتی ہو — منشا یہ ہے کہ تم ملّا بدبخت اور مرزا خوش بخت کو ان کے حالوں پر چھوڑ دو۔ تمھیں کیا مطلب کہ مرد کیا کرتے پھر رہے ہیں — میں نے تو آج تک تمھارے باورچی خانے کے معاملات میں دخل نہیں دیا —"

"اسی لئے تو بیوی بدنصیب کا سر گنجا ہوتا جا رہا ہے — روز کنگھے کے گچھے بال جھڑتے ہیں —" اس کے چہرے پر رنج و حسرت کی لہریں نظر آئیں۔

"دل تھوڑا کیوں کرتی ہو — آج کل لمبے بالوں کی کوئی قیمت نہیں۔ ایسی شاندار چوٹیاں چل گئی ہیں کہ گنجے بھی لگا لیں تو زلف بنگالہ کا مزا آجائے —"

"خدا غارت کرے مصنوعی چوٹیوں کو —"

"چلو یوں ہی سہی — مہذب خواتین تو آجکل پٹھے رکھتی ہیں —"

"مہذب خواتین تو بالشت بھر کا بلاؤز بھی پہنتی ہیں" وہ جھلا کر بولی "اب میں مہذب ہی بن کر دکھاؤں گی —" صاف نظر آرہا تھا کہ وہ رونے والی ہے۔

"آج کس موڈ میں ہو بھاگوان — لو میں تعویذ نویسی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ آج سے باورچی خانے کے معاملات پر بھی تم سے تبادلۂ خیال ضرور کیا کروں گا —"

"بس تو ابھی جائیے کہیں سے آٹا شکر اور گھی لیکر آئیے —"

"دن میں چوریاں نہیں ہوتیں۔ رات آنے دو پھر دیکھنا اس فن میں بھی میری صلاحیتیں —"

"آج گویا فاقہ رہے گا؟"

"اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ میں اخبار میں خبر بھیجدوں گا کہ اُردو کو اس کا حق دلانے کیلئے ملّا اور ملّانی نے مرن برت رکھا ہے —"

"صرف ملّا اور ملّانی نے نہیں ان کے دو ننھے بچوں نے بھی —"

"یہ اور بھی بیوٹی فُل رہے گا۔ ویسے بسکٹ وسکٹ تو ہم انھیں چپکے سے کھلا ہی دیں گے —"

"اس بھلاوے میں نہ رہیئے گا۔ بسکٹ بھی کل صاف ہو چکے —"

"بس تو پیسے نکالو۔ ابھی سب کچھ لائے دیتا ہوں —"

"پیسے ہوتے تو آپ سے بحث میں وقت کیوں برباد کرتی۔ آخری روپیہ کل بھُن چکا ہے —"

"پھر بھی تعویذ لکھنے سے روکتی ہو۔ یقین جانو مرزا اگلزار نقد پچاس دے رہے ہیں —"

"کوئی اور چکر ہوگا۔ آپ سے وہ تعویذ ہرگز نہیں خرید سکتے —"

"ہاں چکر تو ذرا سا ضرور ہے ـــ وہ میرا انھیں شاہ حنیف کا تعویذ چاہتے ہیں۔"

"پھر!"

"میرا تعویذ بھی وہی کام کرے گا جو کسی بڑے سے بڑے شاہ صاحب کا کر سکتا ہے۔ تجھے کیا سمجھتی ہو۔"

"اور جو کچھ بھی سمجھوں، مگر یہ نہیں سمجھ سکتی کہ آپ تعویذ لکھنے کا فن بھی جانتے ہوں گے۔"

"بے شک نہیں جانتا ـــ لیکن جن خطرات کے پیشِ نظر تعویذ لیا جا رہا ہے وہ محض واہمے کی پیداوار ہیں ـــ حالات بغیر تعویذ کے بھی جوں کے توں رہیں گے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔"

"بڑے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں۔ شری نندہ ابھی نئے نئے آئے ہیں وہ وعدے اور تقریریں کر کے جوش ٹھنڈا کرلیں۔ حالات کا پہیہ اپنی رفتار پر چلتا رہیگا۔"

"کیسے معلوم ہے۔"

"بندے کو معلوم ہے۔ جو سمندری دلدلیں برسوں کے طبعی عمل سے بنتی ہیں انھیں کیا ریت کے چند بوروں سے پاٹا جا سکتا ہے۔"

"کیا مطلب ہوا؟"

"مطلب تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ ویسے بزرگوں سے سنا ہے کہ برگد کے درخت کی جڑیں زمین میں دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔"

"حکومت کی طاقت زمین کو تحت الثریٰ تک کھود سکتی ہے۔"

"دلوں کی زمینیں خالی طاقت سے نہیں کھدا کرتیں ـــ ختم کرو تم نہ سمجھ سکوگی۔"

"کچھ بھی ہو آپ تعویذ نہیں لکھیں گے۔ لکھا تو اس کے پیسے گھر میں نہیں لائیں گے۔"

"دوسری شکل منظور ہے ـــ مدت ہوگئی کچھ نہیں دیکھی۔ کیپسٹن کی ڈبیا نہیں خریدی۔ بنگالی رس گلے نہیں کھائے۔"

وہ طشتری سمیت باورچی خانے میں چلی گئی۔

اگلے دن مرزا گلنار پھر تشریف لائے تو میں نے انھیں خوش خبری سنائی کہ آپ کا کام ہو گیا ہے۔"

"زندہ باش ـــ ملّا بھیّا قیامت تک جیو۔ لاؤ کہاں ہے۔"

میں نے موم جامہ کیا ہوا تعویذ جیب سے نکالا۔ وہ اتنے بیتاب تھے کہ بس جھپٹ ہی لیں گے۔

"ذرا ٹھیر یئے۔ اسے وضو کے بغیر ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا۔ آپ کا وضو ہے؟"

"وضو کہاں دھرا ہے۔ لاؤ پانی ابھی کرلوں ـــ ویسے کام کتنے میں ہوا؟"

"صرف سو روپے میں ـــ منھ نہ بنائیے۔ تعویذ ایسا ہے کہ وارے کے نیارے ہو جائیں گے ـــ"

"سو پھر بھی بہت ہیں۔ خیر" انھوں نے مُردہ سی آواز میں کہا۔

"یہ تو سنیئے کہ سو آپ کو نہیں دینے ہوں گے۔ وہ اندر خانے ادا ہو چکے ہیں۔"

"ادا ہو چکے" انھوں نے آنکھیں پھیلائیں۔

"جی ہاں ـــ بُرانی خواجائن نے خواجہ صاحب سے کہدیا کہ یہ روپے میں دوں گی ملّا صاحب سے مت لینا۔"

"ویری نائس ڈیر ملّا ـــ" وہ اچھل پڑے "تم واقعی کمال کے آدمی ہو۔"

"ہوں نا ـــ اچھا تو کیا کھلا پلا رہے ہیں ـــ"

"جو تم کہو۔ مٹھائی سے منھ بھر دوں گا ـــ لیکن سچ بتاؤ شاہ صاحب نے کوئی چیز بھی دی ہے؟"

"کیا پوچھتے ہو ـــ کہنے لگے کہ جو چیز بمبئی کے سیٹھ انگر کھے والے کو پانچ ہزار میں دی تھی وہ تمھیں ازراہ تعلق صرف سو میں دے رہا ہوں۔ کوئی بھی خطرہ ہو ٹل جائیگا۔ آمدنی میں برکت ہوگی۔ دشمن زیر ہوگا۔ مراد بر آئے گی۔"

"لاؤ جلدی میں وضو کئے لوں، پھر آج ہی کی ڈاک سے روانہ

کر دوں گا۔"

"ابھی لیجئے — مگر شو کا پروگرام کب بنا رہے ہیں؟"

"جب کہو۔ اسپیشل کلاس میں دکھلاؤں گا —"

"اچھا ضمیر میاں کو یہ بھی لکھ دیجئے گا کہ پہلے غسل کریں پھر تین بار آیۃ الکرسی پڑھ کر بدن پر دم کریں پھر یہ تعویذ داہنے بازو پر باندھ لیں۔ باندھتے وقت رُخ بغداد شریف کی طرف ہونا چاہئے۔"

انھوں نے آنکھیں پھڑ پھڑا کر سوال کیا — "یار بغداد کس طرف ہے؟"

میں سمجھ رہا تھا کہ قبلہ کا رُخ انھیں چاہے معلوم نہ ہو مگر بغداد کی سمت ضرور جانتے ہوں گے۔ مگر وہ تو گلابی وہابی نکلے

"بس یہ سمجھ لیجئے اجمیر، کلیر اور بغداد خطِ مستقیم پر واقع ہیں۔"

"اماں مجھے تو ان میں سے ایک کی بھی سمت معلوم نہیں۔"

"شمال مشرق لکھ دیجئے گا۔"

مہینوں پر مہینے گذرتے جا رہے ہیں۔ تعویذ تیر بہدف ثابت ہوا۔ ضمیر میاں نے ایک موٹر سائیکل بھی خرید لی ہے۔ تین سو کے علاوہ بچوں کے لئے ریڈی میڈ کپڑے بھی ہر مہینے سوڈیڑھ سو کے بھیج دیتے ہیں۔ مرزا گلزار کی مونچھیں پہلے سے گھنی اور نکیلی ہو گئی ہیں۔ آدمی قدر شناس ہیں۔ آئے دن اپنے خرچ پر سینما لیجاتے ہیں عشق عاشقی کا زمانہ بھی لوٹ آیا ہے۔ ابھی ۲ مارچ کی صبح الجمعیۃ ہاتھ میں لئے تشریف لائے۔ چہرے پر نور ہی نور تھا، باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی ہنسنا شروع کر دیا۔ ہنستے ہنستے مجھے سینے سے لپٹا لیا اور برابر ہنستے رہے۔ میں نے پہلو میں چٹکی لی تو اُچھل کر بولے:۔

"ہائیں — اماں یہ کیا کرتے ہو۔"

"بریک لگاتا ہوں مرزا ڈیر — تشریف رکھ کر ہنسی کی وجہ تو بیان کر دیجئے۔"

"لو — دیکھو۔" انھوں نے اخبار میری طرف بڑھا دیا اور پھر پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگے۔ اخبار اس طرح تہہ تھا کہ ایڈیٹوریل سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔

"کیا پورا ایڈیٹوریل پڑھوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہو۔ ہو ہو۔۔۔ بس پہلی ہی ڈیڑھ سطر۔۔۔"

عنوان تھا "ملاوٹ میں ترقی" آغاز یوں تھا:۔

"ملاوٹی غذا کی نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر داخلہ شری نندہ نے کہا کہ ملاوٹ کی برائی کم ہونے کی بجائے بڑھ گئی ہے۔"

"اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی!" میں نے سوال کیا۔

"اوہو — یار دیکھتے نہیں بچارے وزیر داخلہ اپنا شکار آپ ہو گئے۔"

"یعنی؟"

"پیارے کھوپڑی استعمال کرو۔ اب ۲ سال گذرنے میں کیا دیر ہے۔ ظاہر ہے وہ اپنے اعلان کے مطابق مستعفی ہو جائیں گے۔"

"گھاس کھا گئے ہیں آپ — ٹھیریئے اب ذرا میں بھی تو دل کھول کر ہنس لوں —"

"نہیں خدا کے لئے — مجھے یاد ہے طوفانی ٹارزن میں تم نے ہاف ٹائم سے ہنسنا شروع کیا تھا تو شو ختم ہونے تک ہنستے ہی رہے تھے۔"

"پھر مجھے رونا پڑے گا — آپ نے کیا ہمارے وزیر درداخلہ کو چھوئی موئی سمجھ رکھا ہے کہ ۲ سال قبل کے ایک چلتے ہوئے فقرے کی شرم میں وہ قومی خدمت سے ہاتھ اٹھا لیں گے — اِمپاسیبل!"

"بھئی عہد تو عہد ہی ہے — پھر ساری دنیا کے سامنے کیا ہوا عہد —"

"باتیں کرتے ہیں آپ — جناب بیسویں صدی میں تشریف لایئے۔ عُہدہ ویسے بھی عہد سے زیادہ قیمت رکھتا ہے۔"

"کس طرح؟" وہ خالی الذہنی کے انداز میں بولے۔

"اچھی طرح — کیا تین کے مقابلے میں چار کا عدد زیادہ نہیں مانا گیا۔"

"کدھر نکل گئے۔ اعداد کی یہاں کیا بحث تھی۔"

"تھی کیوں نہیں - عہد میں صرف تین حرف ہیں - عہدہ میں ایک حرف زائد ہے ـــــ عہد اگر قیمتی شے ہے تو عہدہ ظاہر ہے اس سے بھی زیادہ قیمتی ہونا ہی چاہئے"

"آں..... یار بات تو پتے کی ہے مگر..... نیچے نہیں اُترتی ـــ"

"ایک کٹورہ گنگا جل پی جائیے ـــ معدے کی تہہ میں اُتر جائے گی ـــ"

دفعتاً انھیں پھر ہنسی چھوٹی - میں نے بھی قہقہہ لگایا - پھر جو ہنسا ہوں تو انھیں بھاگتے ہی بن پڑی -

اب تقریباً روز ہی مجھ میں اور ملائن میں بحث ہوتی ہے وہ کہتی ہے دو سال پورے ہوتے ہو وزیر داخلہ انشاء اللہ ضرور ایفائے عہد کریں گے - یہ دیش راجپوتوں کا دیش ہے - راجپوتوں نے جان ہاردی ہے قول نہیں ہارا -

میں کہتا ہوں جان ہارنا آسان ہے لیکن عہدہ ہارنا آسان نہیں - تاریخی کہانیوں کے راجپوت بات کے دھنی ضرور رہے ہوں گے لیکن عشق کے میدان میں ان سے مردانگی نہ دکھائی جا سکی - آج کے راجپوتی نوجوان چاہے رات کی بات اگلی صبح ہی بھول جاتے ہوں لیکن میدانِ عشق میں ان کی شہسواری پوری تاریخ کے لئے چیلنج ہے - وہ بیچ بازار کے کسی بھی رادھا کو ڈھول بجا کر للکار سکتے ہیں کہ :-

بول رادھا بول سنگم ہوگا کہ نہیں

اور رادھائیں بھی آج کل کی ان سے ہیٹی نہیں وہ ڈنکے کی چوٹ جواب دے سکتی ہیں کہ :-

ہوگا ہوگا ہوگا ـــــ سنگم ہو کے رہے گا

ملائن یہ شنکھ پیر پٹختی باورچی خانے میں چلی جاتی ہے اور میں اس فکر میں گھلتا رہتا ہوں کہ دیکھئے ہم میں سے کون الہامی ثابت ہوگا ـــ فیصلہ مستقبل کے ہاتھوں میں ہے -

(ملا زندہ صحبت باقی)

نیروبی (افریقہ) سے ایک طویل خط!

...... سالم صاحب نے اپنی اور اپنے والدِ محترم کی تصاویر جیب سے نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیں کہ اخبار والوں کو بغرضِ اشاعت دیدوں تاکہ انٹرویو کے ساتھ چھپ جائیں......

اخبار کے نامہ نگار سے میں نے "مولانا قاری محمد طیب صاحب اور مولانا محمد سالم صاحب" کہہ کر متعارف کرایا تو سالم صاحب نے فوراً میری "تصحیح" فرمائی کہ "حکیم الاسلام" اور "پروفیسر محمد سالم"...!

پھر کیا ہوا؟

مفصل خط کی پوری نقل ـــــ ملا ابن العرب مکی کے فکر انگیز حواشی کے ساتھ اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیے -

ممبر بنیئے اور عربی کی ضخیم کتابوں کے تراجم و شروح معمولی قیمتوں میں قسط وار لیجئے

تفاسیر و شروحات

ناظرین تجلّی کی سہولت کے پیش نظر اب ہم نے درج ذیل تفاسیر و شروحات کی قسطیں بسلسلۂ ممبری بھیجنے کا انتظام کر لیا ہے۔ لہٰذا جو حضرات ممبر بن کر یہ چیزیں حاصل کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

شرائط ممبری — (۱) فیس ممبری ایک روپیہ جو قبل از وقت آنی ضروری ہے۔ بصورت دیگر پہلی وی پی میں یہ روپیہ بڑھا دیا جائے گا (۲) نئی قسطیں ہر دو ماہ بعد تیار ہوتی ہیں اور تیاری پر بذریعہ وی پی روانہ کر دیتے ہیں (۳) ممبران سے محصول ڈاک جو ہر قسط پر تقریباً ایک روپیہ لگتا ہے، نہیں لیا جائے گا، بلکہ قسط کی اصل قیمت سے ہی وی پی ہوگا (۴) فیس ممبری والا روپیہ ایک ہی وی پی واپس آنے کی صورت میں ختم ہو جاتا ہے۔ البتہ کوئی وی پی واپس نہ ہو تو آخری قسط میں وضع کر دیا جاتا ہے

(۵) پاکستانی حضرات:۔ دس یا پانچ روپے علی الحساب یا ہر قسط کے لئے ہر ماہ پوری رقم مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸ مینا بازار پیر الٰہی بخش کالونی کراچی کو بذریعہ منی آرڈر بھیجیں اور رسید منی آرڈر یہاں بھیجتے ہوئے آرڈر کی تفصیل تحریر کریں۔ اطلاع ملنے پر یہاں سے قسطیں بذریعہ رجسٹری انھیں بھیجدی جائیں گی۔

- تفسیر حقانی اُردو مع عربی۔ کل ۲۷ قسطوں میں مکمل ہو گئی۔ فی قسط ۲ روپے (مکمل سٹ کے بیک وقت خریدنے پر رعایتی قیمت ساٹھ روپے ہوگی (ممبران کے لئے محصول ڈاک بھی معاف)

- تفسیر بیان القرآن۔ یہ تفسیر ۳۰ قسطوں میں مکمل ہو گئی ہے۔ فی قسط دو روپے۔ مکمل سٹ ۶۰ روپے کا۔ ممبران کو بیک وقت مکمل سٹ خریدنے پر ۵۵ روپے میں دیں گے اور محصول بھی فری ہوگا۔

- درس قرآن اُردو مع عربی۔ ترجمہ کے ساتھ ہی آسان ترین تفسیر۔ عام فہم لیکن مستند۔ ابھی سات قسطیں تیار ہوئی ہیں۔ فی قسط دو روپے۔ ہر دوسرے ماہ نئی قسط تیار ہو رہی ہے۔

- **انوار الباری اُردو شرح بخاری** خاتم المحدثین علامہ انور شاہ کاشمیریؒ کے درس بخاری کا شہرہ حجاز و مصر تک ہے۔ ان کی بے مثل تقریروں کے معارف و نکات اس شرح میں دیکھئے۔ ان کے شاگرد رشید مولانا احمد رضا صاحب نہایت محنت اور قابلیت سے اس قیمتی ذخیرے کو مدوّن کر رہے ہیں۔ اعلیٰ۔ مدلل و مفصل اور فکر انگیز — ہر دوسرے مہینے ایک جلد چھپ رہی ہے۔ صرف مقدمہ ہی دو جلدوں میں ہے۔ جلد اول ساڑھے تین روپے۔ جلد دوم ساڑھے چار روپے۔ اس کے بعد اصل کتاب کی تین جلدیں چھپی ہیں۔ ہر جلد ساڑھے تین روپے — مقدمہ سمیت گویا پانچ جلدیں تیار ہو چکی ہیں۔

- ایضاح البخاری (اُردو مع عربی) یہ بھی بخاری کی شرح ہے اپنا خاص انداز لئے ہوئے۔ اسے مولانا فخر الدین صاحب مرتب فرما رہے ہیں۔ اب تک آٹھ قسطیں تیار ہوئی ہیں — ہر قسط کی قیمت دو روپے ہے۔

- معارف المشکوٰۃ (اُردو مع عربی) مشکوٰۃ شریف کی عمدہ شرح جو مولانا عبدالحق محدث دہلویؒ کی شرح مشکوٰۃ "مظاہر حق" کا نیا پیراہن ہے۔ ابھی تک ۱۳ قسطیں تیار ہوئی ہیں — ہر قسط کی قیمت دو روپے۔

- مظاہر حق جدید (اُردو مع عربی) مشکوٰۃ شریف کی مشہور شرح جسے مولانا عبداللہ جاوید صاحب اضافات کے ساتھ ایڈٹ فرما رہے ہیں۔ ابھی تک سولہ ۱۶ قسطیں تیار ہوئی ہیں۔ ہر قسط کی قیمت دو ۲ روپے ہے۔
- فتاویٰ عالمگیری (اُردو) یہ فتاویٰ قطعاً نایاب ہوگیا تھا۔ اب اسے ہر لحاظ سے معیاری بنا کر پیش کیا جا رہا ہے ابھی تک تین قسطیں آ چکی ہیں۔ چوتھی آخر مارچ ۶۵ء تک آنے کی اُمید ہے۔ ہر قسط کی قیمت ہے سوا دو ۲ روپے۔
- نور الہدایہ۔ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ھدایہ کا ترجمہ اور شرح۔ ہزارہا مسائل کا بہترین مجموعہ۔ ابھی تک سات قسطیں تیار ہوئی ہیں۔ ہر قسط کی قیمت دو ۲ روپے۔
- تفسیر ابن جریر (اُردو مع عربی) ابوجعفر محمد بن جریرؒ کی مشہور تفسیر جو پہلی بار اُردو میں آ رہی ہے۔ ابھی چار قسطیں تیار ہوئی ہیں۔ فی قسط دو روپے۔
- تفسیر مدارک (اُردو مع عربی) عبداللہ بن احمدؒ کی مشہور تفسیر۔ پہلی بار اُردو زبان میں — اب تک چار ۴ قسطیں تیار ہوئی ہیں۔ فی قسط دو روپے۔

نوٹ:۔ ملحوظ رہے کہ آپ جتنے سلسلوں کے ممبر بننا چاہیں گے اتنے ہی روپے فیس ممبری کے ادا کرنے ہوں گے۔ ایک روپیہ فقط ایک ہی سلسلے کی فیس ممبری کے لئے کافی ہوتا ہے۔

تعلیمی و نصابی کتب

کتاب	روپیہ	پیسہ	کتاب	روپیہ	پیسہ
اخلاقی کہانیاں اوّل	-	۲۰	ہماری کتاب (قابل نصاب) حصّہ دوم	-	۶۲
〃 〃 دوم	-	۲۰	〃 〃 (〃) 〃 سوم	-	۸۰
〃 〃 سوم	-	۲۰	〃 〃 (〃) 〃 چہارم	-	۸۰
〃 〃 چہارم	-	۴۰	〃 〃 (〃) 〃 پنجم	۱	-
رہنمائے عربی (مولوی ہلال عثمانی)	-	۶۰	〃 〃 (〃) 〃 ششم	۱	۱۲
آسان ریاضی (قابلِ نصاب) حصہ اول	-	۶۰	ہماری دنیا (〃) 〃 اوّل	-	۶۰
〃 〃 (〃) حصہ دوم	-	۶۰	〃 〃 (〃) 〃 دوم	-	۸۰
〃 〃 (〃) حصہ سوم	-	۸۰	〃 〃 (〃) 〃 سوم	۱	۵۰
〃 〃 (〃) حصہ چہارم	۱	۲۰	اُردو فارسی ڈکشنری پاکٹ سائز مجلّد	-	۷۵
〃 〃 (〃) حصہ پنجم	۱	۲۰	اُردو کی پہلی (انجمن حمایت اسلام) گلیز	-	۱۹
عام معلومات (〃) اوّل	-	۳۰	〃 دوسری (〃 〃 〃) 〃	-	۴۴
〃 〃 (〃) حصہ دوم	-	۴۰	〃 تیسری (〃 〃 〃) 〃	-	۶۲
〃 〃 (〃) حصہ سوم	-	۸۰	〃 چوتھی (〃 〃 〃) 〃	۱	۷۵
〃 〃 (〃) حصہ چہارم	۱	۳۰	اُردو زبان کا قاعدہ (اسمٰعیل والا)	-	۱۲
〃 〃 (〃) حصہ پنجم	۱	۴۰	〃 〃 کی پہلی (〃 〃)	-	۱۹
ہماری کتاب (〃) قاعدہ	-	۳۰	〃 〃 دوسری (〃 〃)	-	۳۷
〃 〃 (〃) اول	-	۴۰	〃 〃 تیسری (〃 〃)	-	۶۲

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر

کتاب	روپیہ	پیسہ
زاد المعاد (امام حافظ ابن قیم رح)	۴۴	۷۵
سیرت محمدیہ (سر سید احمد)	۱۲	-
رحمۃ اللعالمین مجلد (قاضی سلیمان منصور پوری رح)	۲۵	-
محسن انسانیت (از نعیم صدیقی) پاکستانی فائن ایڈیشن	۱۱	-
" " (" ") پاکستانی اعلیٰ ایڈیشن	۱۵	-
" " (" ") ہندوستانی ایڈیشن	۱۲	-
حیات سرور کائنات مکمل (ملا واحدی)	۱۱	۲۵
خصائل نبوی و شمائل ترمذی مترجم اُردو (مولانا زکریا)	۸	-
اصح السیر (مولانا ابو البرکات دانا پوری رح)	۱۰	-
رسول اکرم کی سیاسی زندگی (ڈاکٹر حمید اللہ)	۸	-
معمولات نبوی [illegible] کے معمولات	۱	۵۰
بزم پیغمبر ۳ (مولانا مقبول سیوہاروی)	۱	۲۵
پیغمبر اسلام نمبر (ماہنامہ نئی راہ)	۱	۲۵
ہمارے پیغمبر (مولوی محمد میاں)	۱	۲۵
رسول عربی (مولانا فرید الوحیدی)	۱	۱۲
رسول خدا کے اخلاق		۵۰
[illegible] انسانیت (مولانا یعقوب الرحمٰن)	-	۴۰
[illegible] رسول (مولانا تھانوی رح)	۲	-
سیرت رسول (شاہ ولی اللہ رح)	-	۷۵

مجموعۂ سیرت رسول حضور کی حیات مبارکہ کے تفصیلی حالات عام فہم زبان میں۔ بچے، بچیاں اور غرباء بھی فائدہ اُٹھا سکیں اسلئے کتاب ۲۵ حصوں میں بانٹ دی گئی ہے۔ فی حصہ ۱۴ نئے پیسے (سب حصے یکجا منگانے پر تین روپے)

صحابۂ کرام رض کے حالات و سیرت پر

کتاب	روپیہ	پیسہ
حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض	-	۶۲
حضرت عائشہ صدیقہ رض	-	۸۸
تاجدار مدینہ کی شہزادیاں	۱	-
صحابیات (درس آمیز واقعات و حالات)	۶	-
تاریخ الخلفاء (علامہ جلال الدین سیوطی رح)	۱۲	-
خلفائے راشدین (مولانا عبد الشکور رح)	۲	۵۰
دس بڑے مسلمان (صحابۂ کرام رض) مجلد	۶	-
حکایات صحابہ رض (مولانا ذکریا) "	۲	۲۵
کرامات صحابہ رض (مولانا تھانوی رح) "	۱	۵۰
صحابۂ کرام کی جاں بازی غیر مجلد	-	۵۰
حضرت ابوبکر رض (حسین ہیکل مصری)	۵	-
حضرت ابوبکر صدیق و عمر فاروق اعظم رض (ڈاکٹر طٰہٰ حسین)	۶	۷۵
" عمر فاروق اعظم رض (حسین ہیکل مصری)	۱۰	-
سیرت سیدنا عثمان غنی رض ہر دو حصہ مجلد	۱۰	-
حضرت عثمان غنی و حضرت علی رض (ڈاکٹر طٰہٰ حسین)	۱۲	-
الفاروق (علامہ شبلی نعمانی رح)	۶	-
حضرت عثمان ذی النورین رض (مولانا امام الدین)	-	۸۰
" صدیق اعظم رض (مولانا عبد الشکور رح)	-	۵۰
" فاروق اعظم رض (" ")	-	۹۰
" عثمان غنی رض (" ")	-	۴۵
" علی مرتضیٰ رض (" ")	-	۳۵
سید الشہداء حضرت حمزہ رض	-	۷۵
حضرت ابوذر غفاری رض (عاشق رسول)	۲	۲۵
" خالد سیف اللہ رض (ایک عظیم جرنیل)	۲	۵۰
" بلال رض (مؤذن اسلام)	-	۶۲
" ایوب انصاری رض (میزبان رسول)	-	۶۰
امیر معاویہ رض کی سیاسی زندگی عکسی مجلد	۱۰	-
" معاویہ رض ابن ابی سفیان رض	۱	۵۰
" عمرو بن العاص رض (فاتح مصر)	۲	۵۰
" عمر بن عبد العزیز رض	۱	۲۵
" عمرو بن العاص رض کلاں	۱۲	-

مکتبہ تجلی - دیوبند (یو۔پی)

کمیونزم کے اصلی خدوخال

	پیسہ	روپیہ
آج کا چین (چین کے چشم دید حالات)	-	۱
پتھر کے دیوتا (چھ مستند آپ بیتیاں)	-	۱
کمیونزم کی پہلی کتاب (تین سوالوں کے جواب)	-	۱
سوویٹ نظام کی چھ کنجیاں	-	۱
لینن (لینن کی سوانح اور حالات)	-	۱
اور یانگسی بہتا رہا (ایک درس آموز ناول)	-	۱
جمہوریت ہی کیوں؟ (ایک اہم سوال اور اسکا واضح جواب)	-	۱
ظلمت نیم روز (ایک عبرت آمیز ناول)	۲۵	۱
آزادی کی طرف (ایک دلچسپ اور عبرتناک آپ بیتی)	-	۳
عثمان بطور (چین کے مسلمانوں کی الم انگیز تاریخ)	۲۵	۱
سرگذشت امام (ایک مسلم امام کی آپ بیتی)	۷۵	-
چین کے مسلمان (تاریخ و واقعات)	۲۵	-
غیر جانبداری کا نظریہ	۲۵	-
ہمارے دور کا انقلاب	۲۵	-
اقتصادی سامراج	۲۵	-
اقتصادی تعاون	۲۵	-
موجودہ سماج میں طبقاتی نظام	۲۵	-
آزادی کی نئی وسعتیں	۵۰	-
عالمی سیاست میں جمہوریت	۵۰	-

چند ادبی کتابیں اور لغات وغیرہ

	پیسہ	روپیہ
عملی تنقید (کلیم الدین احمد)	۵۰	۷
ذکر و مطالعہ (محمد ذکی لطف)	۷۵	۳
مقدمہ شعر و شاعری (الطاف حسین حالی)	۵۰	۲
اُردو زبان اور عورت (وحیدہ نسیم)	۲۵	۳
سروش ہستی (شاد عظیم آبادی)	۵۰	۳
زین آبادی (نسیم اختر پالوی کا مشہور ڈرامہ)	-	۳
فکر و نظر (سید علی حیدر نیّر)	-	۲
خبر و نظر (〃 〃 〃)	۵۰	۱
مقالات امینی (مولانا تقی امینی)	۵۰	۱
سچی باتیں (مولانا عبدالماجد دریابادی)	۸۷	۳
جانے پہچانے اور وہ جنھیں کوئی نہیں جانتا	-	۴
ہوتی ہے سحر پیدا (بدنام رفیعی)	-	۳
جمہوریت اور مغربی تحریکیں	۵۰	۳
تصریحات (ادبی مضامین کا انتخاب)	۷۵	۲
جنات کی دنیا (از مولانا مقبول سیوہاروی)	۵۰	۱
انسان (ایک سبق آموز کہانی)	۵۰	۱
سعیدہ کشیدہ کاری مجلّد پلاسٹک کور	۵۰	۵
〃 〃 معمولی جلد والی	۵۰	۴
رقعات عنایت علی (رف کاغذ پر)	-	۱
المنجد اُردو عربی ڈکشنری مجلد	-	۳۰
بیان اللسان 〃	-	۱۰
القاموس الجدید مجلّد (کمیاب)	-	۷
فیروز اللغات عکسی خورد سائز مجلد	-	۶
تذکیر و تانیث (مؤنث و مذکر کی پہچان)	۷۵	-
سچی آپ بیتیاں (فرخ اصفہانی)	۵۰	۴
سچی آپ بیتی (ایک عبرت انگیز کتاب)	-	۲
بی ہمسائی (طنز و مذاح کا عمدہ مجموعہ)	۵۰	۲

مکتبہ تجلّی ۔ دیوبند (یوپی)

حدیث و فقہ

	پیسہ	روپیہ
مشکوٰۃ شریف اُردو مع عربی مکمل مجلّد	—	۲۸
〃 〃 صرف اُردو	—	۱۶
ترمذی شریف 〃 〃 〃	—	۱۶
سنن نسائی شریف اُردو مع عربی 〃	—	۳۰
سنن ابن ماجہ صرف اُردو 〃	—	۱۲
سنن دارمی شریف اُردو 〃	—	۱۲
ریاض الصالحین اُردو مع عربی 〃	—	۲۰
مسند امام اعظم ابوحنیفہؒ اُردو مع عربی مکمل مجلّد	—	۸
مؤطا امام مالکؒ 〃 〃	—	۱۲
مؤطا امام محمدؒ 〃 〃	—	۸
کتاب الآثار 〃 〃	—	۸
بلوغ المرام 〃 〃	—	۸
مشارق الانوار 〃 〃	—	۱۴
مسلم شریف اُردو مع عربی غیر مجلّد	—	۴۸
صحیفہ ہمام بن منبہؓ 〃	۵۰	۳
حجیت حدیث (مولانا ادریس کاندھلوی)	—	۲
علم الحدیث (اصول حدیث پر)	۵۰	۱
فتاویٰ دار العلوم مکمل در آٹھ حصہ مجلد در دو جلد	—	۲۴
فتاویٰ عبدالحئی مبوب مکمل مجلّد مع ڈسٹ کور	—	۱۵
فتاویٰ رشیدیہ 〃 〃 〃 〃	—	۸
بہشتی زیور مدلل و مکمل (مولانا تھانویؒ) مجلّد در دو جلد	—	۱۵
علم الفقہ کامل در چھ حصہ (مولانا عبدالشکورؒ) مجلّد	۵۰	۱۶
بہشتی زیور اطہری غیر مدلل۔ مکمل مجلد	—	۸
الفوز الکبیر مع فتح الخبیر ترجمہ مع متن	۵۰	۷

علوم قرآنیہ اور تفاسیر وغیرہ

	پیسہ	روپیہ
تفسیر حقانی مکمل غیر مجلّد ۶۰ روپے۔ مجلد در چہار جلد	—	۶۶
تفسیر بیان القرآن مکمل غیر مجلد ۶۰ روپے۔ مجلد در چہار جلد	—	۶۶
مفہوم القرآن پارہ عمّ (ترجمہ مع تفسیر اور اُردو نظم کیساتھ)	—	۳
〃 〃 پارہ الم (〃 〃 〃 〃)	—	۳
چھ سورہ منظوم (〃 〃 〃 〃)	۵۰	۱
قرآنی دعائیں منظوم (〃 〃 〃 〃)	۵۰	—
تفہیم القرآن (مولانا مودودی کی معرکۃ الآراء تفسیر، پلاسٹک کی حسین اور مضبوط جلدوں میں) حصہ اوّل	—	۱۲
〃 دوم	—	۱۵
〃 سوم	—	۱۷
تفسیر سورۂ نور (مولانا مودودی)	—	۴
تفسیر سورۂ احزاب (〃 〃)	۵۰	۴
تفسیر علامہ عثمانی۔ ترجمہ شیخ الہندؒ مجلّد	—	۲۲
الاتقان فی علوم القرآن 〃	—	۲۴
البیان فی علوم القرآن غیر مجلّد	—	۶
اصول تفسیر اُردو مع عربی (مولانا عبدالمالک) مجلّد	—	۶
〃 〃 (امام ابن تیمیہؒ) مجلّد	۷۵	۱
قاموس القرآن (قرآنی ڈکشنری) مجلد	—	۹
مفردات القرآن اُردو (امام راغبؒ) 〃	—	۴۰
قرآن نمبر (ماہنامہ نئی راہ) بڑے بڑے علماء کے مضامین۔	۵۰	۱

مکتبہ تجلّی۔ دیوبند (یو۔پی)

دین و اخلاق

	پیسہ	روپیہ
تزکیۂ نفس (مولانا امین احسن اصلاحی)	-	۶
اسلامی انقلاب کی راہ	۵۰	-
اسلامی زندگی۔ مکمل مجلد (نصر اللہ خاں عزیز)	۵۰	۲
اسلامی زندگی (مولانا احتشام الحسن)	۲۵	-
تھوڑی دیر اہلِ حق کی ساتھ ہر دو حصہ	۳۷	۱
رفیقِ سفر (مفتی محمد شفیع صاحب)	۴۷	-
فریضۂ اقامتِ دین	۷۰	۱
رہبرِ حجاج (مولانا حبیب الرحمٰن)	۷۵	-
میری نماز نماز کے جملہ مسائل	-	۱
روزہ کی فضیلت	۶۰	-
نماز کی فضیلت	۶۰	-
قرآن کی فضیلت	۵۰	-
قرآن اور انسانیت	۲۵	۱
نماز اور احادیث	۴۰	-
جنت اور دوزخ (شیخ عبد القادر جیلانیؒ)	۲۵	۱
فتوح الغیب اردو (" ")	۵۰	۲
مطالعۂ اسلامیات (اسلام پر ایک ریسرچ)	۵۰	۲
اسلام ایک نظر میں	۵۰	۲
عورت اسلامی معاشرے میں	-	۴
اساسِ دین کی تعمیر	۵۰	۳
کائنات میں انسان کا مقام (مولانا تقی امینی)	۵۰	-
مقالات امینی (مقالات پاکیزہ کا مجموعہ)	۵۰	۱
مقالات شیخ الہندؒ (تحقیق کا خزانہ)	-	۱
تقاریر امام غزالیؒ مجلد	۵۰	۲
تصویر علم و عقل کی روشنی میں (مولانا مودودی اور مولوی اسحق)	۵۰	-
مسئلہ سود (مفتی محمد شفیع صاحب)	۲۵	۱
سود مکمل (مولانا مودودی)	-	۶
مسئلہ ختم نبوت علم و عقل کی روشنی میں	۲۵	۲
اسلام تلوار سے نہیں پھیلا	۷۵	-

	پیسہ	روپیہ
احسن الصلوٰۃ نماز کے مسائل آسان انداز میں	۳۱	-
ہماری تعلیم (کیا ہے اور کیا ہونی چاہئے؟)	۷۵	-
نصیحت نامہ (مولانا بادر عالم میرٹھی مہاجر مکی)	۶۰	-
کلمات اکابر (عبرت آموز کلمات کا مجموعہ	۵۰	۱
عقائد اسلام قاسمی (مولانا محمد طاہر مرحوم)	۷۵	۲
طریقہ میلاد شریف (مولانا تھانویؒ)	۴۰	-
فتاویٰ میلاد شریف (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ)	۴۰	-
رکعات تراویح (مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی)	۵۰	۱
حسن یقین (مولوی ابوالحسن بارہ بنکی) مجلد	۵۰	۱
انسانیت کے تقاضے (مولوی ہلال عثمانی)	-	۲
عبقات (مسائل تصوف پر شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی عمدہ کتاب)	۵۰	۱۰
تبلیغی نصاب مکمل مجلد رنگین	۰	۶
مرنے کے بعد کیا ہوگا؟ مجلد	۷۵	۲
آئینۂ ایمان غیر مجلد	۱۲	۱
آئینۂ قرآن "	۵۰	۱
آئینۂ رسولؐ "	۵۰	۱
آئینۂ نماز "	۵۰	۱
آئینۂ آخرت	۵۰	۱
صراطِ مستقیم (حضرت اسمٰعیل شہیدؒ)	۵۰	۲
کلیات امدادیہ (حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ)	۵۰	۲
طہارت کے مسائل مجلد گتہ	۶۲	-
محکمات (آیاتِ قرآنی کی وضاحت)	۷۵	۲
فردوس کی راہ مکمل	۷۵	۵
تعمیر حیات	۷۵	۲
فضائل علم و علماء (امام ابن قیمؒ)	۷۵	۱
مصیبت کے بعد راحت (مفتی شفیع)	۵۶	-
موت کا منظر (" ")	۷۵	-
ہمارا دفاعی منصوبہ (سید حامد علی)	۳۵	-
حج کیا ہے؟ (")	۵۱	-
قوموں کا عروج و زوال (")	۵۰	-

کتاب	پیسہ	روپیہ
انتخاب مکتوبات امام ربانی اردو مجلد	۵۰	۵
فلسفۂ دعاء (دعاء کی حقیقت اور فلسفہ)	-	۴
زبدۃ المناسک مکمل (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ)	-	۸
معراج المومنین (ایک پاکیزہ تصنیف)	-	۲
اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام	۳۷	۱
قانون وراثت (وراثت کے جملہ مسائل)	۵۰	۲
ہمارے عائلی مسائل (مولوی تقی صاحب)	۷۵	۳
اذکار مسنونہ (امام ابن قیمؒ)	-	۴
الحکمۃ فی مخلوقات اللہ (امام غزالیؒ)	۲۵	۳
مسلمان کے شب و روز (اسعد گیلانیؒ)	۷۵	۳
مکاتیب امام غزالیؒ مجلد	۷۵	۳
مکاتیب سید سلیمان ندویؒ 〃	۲۵	۳
مکتوبات خواجہ معصومؒ 〃	-	۴
کتاب الایمان (مولوی راشد حسن عثمانی)	۵۰	۱
کتاب الصلوٰۃ (〃 〃 〃)	۵۰	۲
کتاب الصوم (〃 〃 〃)	-	۱
کتاب الطہارت (〃 〃 〃)	۷۵	-
طریقۂ طلاق (اور آداب معاشرت)	۳۷	-

شرک و بدعت کے رد میں

کتاب	پیسہ	روپیہ
بدعت کیا ہے؟ (ایک عظیم کتاب)	-	۳
ردّ بدعت (مجدد الف ثانیؒ)	۲۵	۱
وجد و سماع (از امام ابن تیمیہؒ)	-	۱
بلاغ المبین (شاہ ولی اللہؒ)	-	۴
تعزیہ علمائے اسلام کی نظر میں (شاہ ولی اللہؒ)	۳۷	-
خصائل مسلمین (ترجمہ مسائل اربعین)	-	۲
فاتحہ کا صحیح طریقہ (ہر لحاظ سے معیاری)	۶۰	-
زیارت قبور (قبرستان کے آداب)	۴۰	-
شرک اور بدعت (مولوی کفیل الرحمٰن)	۴۰	-
شادی کی رسمیں (〃 〃)	۴۰	-

کتاب	پیسہ	روپیہ
ایصال ثواب (مسائل اور طریقہ)	۲۶	-
چالیس بدعتیں	۶۲	-
فتاویٰ اعلیٰ حضرت بریلوی	۳۰	-
وہابی کی پہچان	۱۳	-
تقریر کیجئے (رد بدعت میں تقاریر اور طریقہ تقریر)	۵۰	۱
اسلامی عقیدے (پیدائش سے موت تک)	۲۵	-
تحفۂ اثنا عشریہ (رد شیعیت میں)	-	۱۲
آیات بینات - مکمل ہر دو حصہ (رد شیعیت میں)	-	۱۸
کتاب التوحید (رد بدعت میں)	-	۳
ہدایت الشیعہ (مولانا رشید احمد گنگوہیؒ)	-	۱
محمدی پاکٹ بک (قادیانیت کے رد میں)	-	۸
چیستان مرزا (〃 〃)	۳۷	-
تقویۃ الایمان (از شاہ اسمٰعیل شہیدؒ)	-	۴
الحق الصریح اردو (〃 〃)	-	۲
صحیح معلومات تعطیلات (اور بدعتوں کی نشاندہی)	-	۱
سکھ مت اور توحید (مولوی حامد علی) غیر مجلد	۹۰	-
ہندو مت اور توحید (〃 〃)	۸۰	-
شرک کے اثرات انسانی زندگی پر (〃) 〃	۴۰	-
بدھ مت اور شرک (〃) 〃	۴۰	-
توحید اور عہد نامۂ عتیق (〃) 〃	۴۰	-
خدا پرستی ملحدین کی نظر میں (〃) 〃	۳۲	-
خدا کا انکار کیوں؟ (〃) 〃	۳۲	-
کیا خدا کی ضرورت نہیں؟ (〃) 〃	۳۲	-
خدا ہے؟ (〃) 〃	۳۲	-
ملحدین کے شبہات (〃) 〃	۳۲	-
تقویۃ الایمان (نیا ایڈیشن مجلد مع کور)	-	۶
〃 〃 غیر مجلد	-	۴

ملنے کا پتہ

مکتبہ تجلی - دیوبند (یو۔پی)

فتاویٰ عالمگیری اردو



— سلطنت مغلیہ کی علمی اور دینی تاریخی یادگار جس کی ترتیب و تدوین پر اورنگزیب عالمگیر علیہ الرحمۃ نے تیس لاکھ روپیہ کا سرمایہ خرچ کیا ● سینکڑوں علمائے امت اور مفتیانِ دین کی عرق ریز کاوش کا عظیم الشان شاہکار ● فقہ اسلامی کا مستند و معتبر مجموعہ، اسلامی زندگی کا مرقع ● عبادت معاشرت، معاملات اور زندگی کے تمام مسائل کی انسائیکلوپیڈیا ● دنیائے اسلام کی تسلیم کردہ مستند و گراں قدر کتاب ● مسلم پرسنل لا سے متعلق ایک قانونی دستاویز، ایک تاریخی ماخذ ● قرآن و سنت کا نچوڑ، اسلاف و اکابر کی تحقیقات کا حاصل اور فقہ اسلامی کے ہزار سالہ ذخیرے کا عطر

● ہندو پاک کے تمام دینی اداروں کے نزدیک قابلِ استفادہ اور معتبر فقہی مجموعہ۔

● جدید مسائل اور نئے تقاضوں کے پیش نظر بالکل تازہ عالمانہ مفید گراں قیمت فٹ نوٹس اور ضمیمے۔ تصحیح کا خاص اہتمام

— یہ عظیم فتاویٰ اعلیٰ ترین علمی مجلس کی نگرانی میں صوری و معنوی خوبیوں، نئے انداز، نئی ترتیب اور نئے ڈھنگ سے پابندی کے ساتھ

دو ماہی سلسلہ کی صورت میں شائع ہو رہا ہے

آج ہی ممبر بن جایئے — اور — بنایئے



زیرِ سرپرستی:

مفکرِ ملت حضرت الحاج مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی ورکنگ صدر جمعیۃ علماء ہند و ممبر مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند چیئرمین سنٹرل حج کمیٹی

●

نگرانِ ترجمہ و حواشی وغیرہ

(۱) حضرت مولانا مفتی محمود احمد صاحب صدیقی نانوتوی ممبر مجلس شوریٰ اعزازی صدر مفتی دارالعلوم دیوبند

۲- حضرت مولانا مفتی جمیل الرحمٰن صاحب نائب مفتی دیوبند

ہر جلد کی ضخامت تقریباً سو صفحات، سائز ۲۰×۳۰ جاذبِ نظر ٹائیٹل، قیمت ۲ روپے ۲۵ پیسے (علاوہ محصول)

فیس ممبری صرف ایک روپیہ | ممبران کو ہمیشہ کے لئے محصول ڈاک معاف

مکتبہ تجلی دیوبند

پاکستان کا پتہ مکتبہ عثمانیہ ۲۲۸۰ مینا بازار پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی، پاکستان